مختصر و مدلل تاریخ ہند ایک نئے انداز میں

تاریخِ ہند

مسلم عہدِ حکومت سے قیامِ جمہوریت تک

تالیف
مفتی محمد صاحب پالنپوری
فاضل دارالعلوم دیوبند

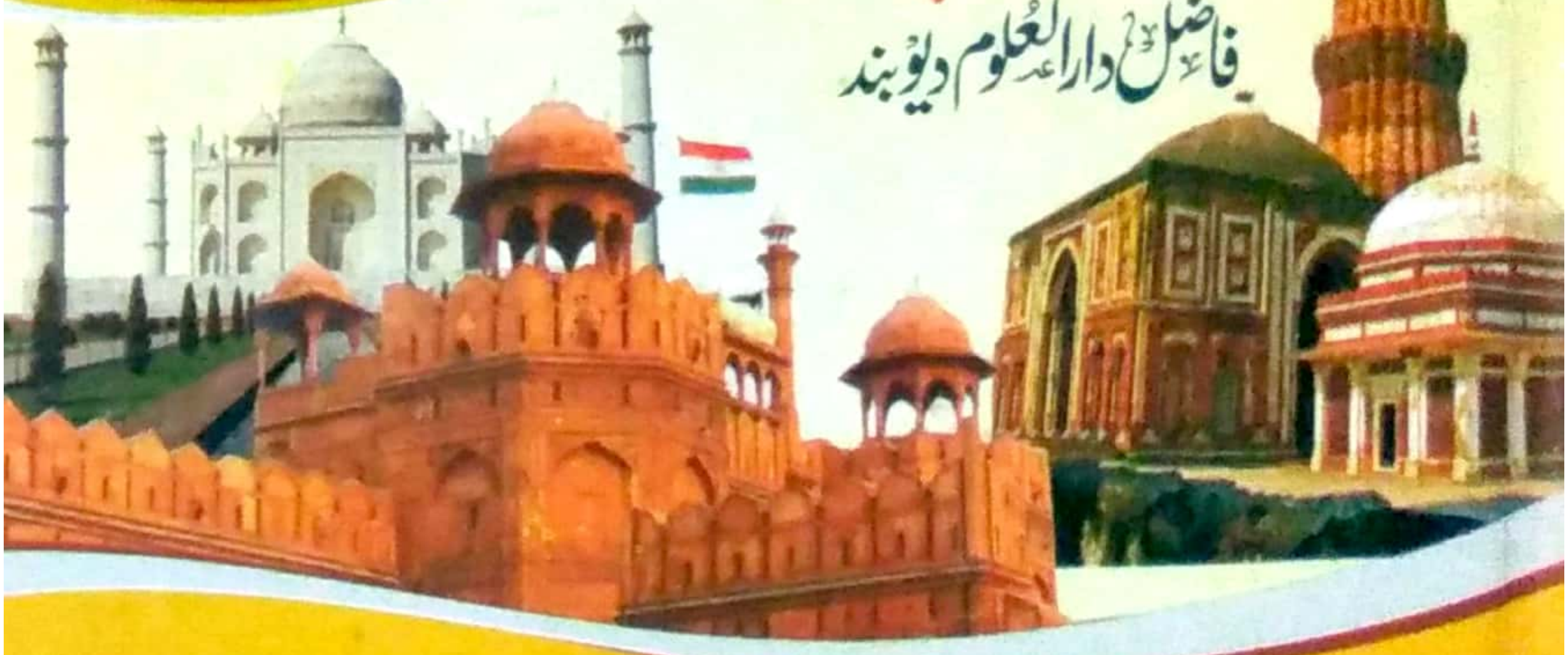

احمد بک ڈپو سہارنپور (یوپی)

Scanned by CamScanner

مختصر و مدلل تاریخ ہند ایک نئے انداز میں

تاریخ ہند

(مسلم عہد حکومت سے قیام جمہوریت تک)

سلاطین ہند کے جرأت آمیز اور عبرت آموز کارنامے اور ان کی رواداری ہندو مؤرخین کی شہادتوں کے ساتھ انگریزوں کا ملک پر تسلط اور ان کی بربریت اور پر فریب پالیسیاں، تحریک آزادی کے لئے عظیم قربانیاں قیام جمہورت تک

تالیف

حضرت مولانا مفتی محمد صاحب پالن پوری
فاضل دار العلوم دیوبند

ناشر

احمد بکڈپو
نزد دفتر مظاہر علوم (وقف)، سہارنپور
Mob. 9639662257

Scanned by CamScanner

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کتابت کے جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں۔

نام کتاب —— تاریخ ہند

تالیف —— حضرت مولانا مفتی محمد صاحب پالن پوری
فاضل دارالعلوم دیوبند

پیش لفظ —— حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری
استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند

ناشر —— احمد بک ڈپو (نزد دفتر مظاہر علوم (وقف)
سہارنپور (یو.پی) الہند

باہتمام —— محمد اشفاق

قیمت —— ۲۵۰

ملنے کا پتہ

احمد بک ڈپو
نزد دفتر مظاہر علوم (وقف)، سہارنپور
Mob. 9639662257

فہرست مضامین

تقریظ: مولانا محمد مہتاب عالم قاسمی	۱۱
پیش لفظ: مفتی سعید احمد پالن پوری	۱۳
عرض مؤلف	۱۵
ابتدائیہ	۱۷
ہندوستان کی کچھ خصوصیات	۱۷
سب سے پہلے اسلام مالابار میں	۱۸
فتوح السندھ	۲۰
حجاج بن یوسف کے فرامین بنام محمد بن قاسم	۲۲
فتوح الہند	۳۸
ایک اہم واقعہ	۳۹
اسلامی ہند کے معمار	۴۱
سلطان محمود غزنوی	۴۱
عروس فلک مسجد کی تعمیر	۴۲
محمود غزنوی کے لیے طالب علم کی دعا کی برکت	۴۲
فتح نامہ محمود خلیفہ بغداد کی خدمت میں	۴۳
بدویوں کی سرزنش	۴۳
فتح سومنات	۴۴
سومنات میں ورود	۴۵
معرکہ آرائی	۴۵
محمود بت شکن تھا نہ کہ بت فروش	۴۶
شہر الہ (غزنی) کی طرف	۴۶
خلیفہ بغداد کا خط بنام محمود	۴۸
محمود کی وفات	۴۹
ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا بانی شہاب الدین محمد غوری	۴۹
مسلمانوں کے ہند پر حملے اور کامیابی کے اسباب	۵۱
حملوں کے اسباب	۵۲
مسلمان حملہ آوروں کی کامیابی کے اسباب	۵۲
شہاب الدین غوری کی رواداری کی مثال	۵۵
سلطان قطب الدین ایبک (ہندوستان کا پہلا بادشاہ)	۵۵
قطب الدین کے ابتدائی حالات	۵۵
قطب الدین کا ہندوستان میں سپہ سالار مقرر ہونا	۵۶
جامع مسجد کی تعمیر کی تکمیل	۵۶

Scanned by CamScanner

قطب الدین کی خود مختاری ۵۷
قطب الدین کی وفات ۵۷
سلطان شمس الدین التمش ۵۸
خوارزم سے معرکہ ۵۸
خلافت عباسیہ کی طرف سے سلطان التمش کے لیے عمامہ ۵۸
حوض شمسی ۵۹
غیبی امداد ۵۹
خدمت فقراء ۶۰
حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے جنازہ پڑھانے کا واقعہ ۶۰
خلافت عباسیہ کے عالم فاضل وزیر کا ورود دہلی میں ۶۱
وفات ۶۲
ناصر الدین محمود بن التمش ۶۲
مغلوں کا حملہ ۶۳
ناصر الدین محمود کا کردار ۶۴
ناصر الدین کے اخلاق ۶۴
طہارت نفس ۶۵
سلطان غیاث الدین بلبن ۶۵
بلبن کی بلند نظری ۶۶
دستور جہاں بانی ۶۷
بلبن کی شخصیت ۶۸
شکار کا شوق ۷۰
بلبن کی عاقبت اندیشی ۷۰
میواتی لٹیروں کا خاتمہ ۷۱
بلبن کا محبوب ترین بیٹا سلطان محمد خان شہید ۷۱
محفل وجد و حال ۷۲
شیخ سعدی سے عقیدت ۷۳
خان شہید کی دہلی میں آمد ۷۳
بلبن کی خان شہید کو نصیحتیں ۷۴
تیمور خان کا حملہ ۷۵
شہزادہ سلطان محمد (خان شہید) کی شہادت ۷۶
بلبن کی بیماری اور اس کی وفات ۷۶
سلطان معز الدین کیقباد ۷۷
عیش کوشی ۷۷
بے راہ روی اور بیماری ۷۸
(خاندان خلجی)
سلطان جلال الدین خلجی ۷۸
قدیم دہلی میں ورود ۷۹
جلال الدین کی شخصیت اور کردار ۸۰
باغی حاکم کے ساتھ معرکہ آرائی ۸۰
المجاہد فی سبیل اللہ کا لقب ۸۱
مغلوں کا حملہ ۸۲

سلطان جلال الدین کی شہادت ۸۲
سلطان علاؤالدین خلجی ۸۳
گجرات کی فتح ۸۳
علاؤالدین کی خام خیالیاں ۸۴
علاء الملک کوتوال کی دانش مندی ۸۵
بغاوتوں کو روکنے کی تدابیر ۸۸
فاسد خیالات اور ان کی اصلاح ۸۹
حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کا ارشاد ۹۰
حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء سے عقیدت ۹۰
علاؤالدین خلجی کا آخری دور ۹۱
سلطان علاؤالدین خلجی سکندر ثانی ۹۲
برکات عہد علائی ۹۳
علاؤالدین کا زوال اور اس کی وفات ۹۴
نامبارک پنج سالہ دور ۹۴
(خاندان تغلق)
سلطان غیاث الدین تغلق ۹۵
غیاث الدین کا کردار ۹۶
غیاث الدین تغلق کی وفات ۹۶
سلطان محمد شاہ تغلق ۹۸
سلطان محمد شاہ تغلق کا کردار ۹۸
علم نوازی ۹۹
زوال سلطنت کے اسباب ۱۰۰
مرکز کی تبدیلی ۱۰۲
محمد تغلق کی سیاست ۱۰۳
شاہ محمد تغلق کی وفات ۱۰۴
شاہ محمد تغلق کی قساوت قلبی کا سبب ۱۰۴
سلطان فیروز شاہ تغلق ۱۰۵
شہزادے فتح خان کی تعلیم و تربیت ۱۰۶
شہزادے کے صبر و تحمل اور ہمدردی کی مثال ۱۰۷
فتوحات فیروز شاہی ۱۰۷
فیروز شاہ تغلق کی رحلت ۱۱۰
تغلق خاندان کے آخری جانشینوں کی مختصر روئیداد ۱۱۰
دو صد سالہ شاہان ہند کے کارناموں کا تجزیہ و تبصرہ (قطب الدین ایبک سے لے کر خاندان تغلق تک) ۱۱۱
رواداری کی مثالیں اور شہادتیں ۱۱۴
تسخیر قلوب ۱۱۶
خواجہ نظام الدین اولیاء کی فراخ دلی ۱۱۸
حسن دہلوی کی رواداری ۱۱۹
شیخ احمد عبدالحق کی روادارانہ حکایت ۱۲۰
بہمنی خاندان کے بانی کی حکایت ۱۲۱

Scanned by CamScanner

سلاطین دہلی کی حکومت پر ہندو مؤرخین کا تبصرہ	۱۲۳
خاندان سادات	۱۲۷
سلطان سید خضر خان بن ملک سلیمان	۱۲۸
سلطان سید مبارک شاہ بن خضر خان	۱۲۹
(خاندان لودھی)	
سلطان بہلول لودھی	۱۳۰
سلطان سکندر لودھی	۱۳۱
شیخ بہاء الدین سے عقیدت	۱۳۱
علمی ذوق	۱۳۳
سکندر لودھی کا انتقال	۱۳۳
سلطان ابراہیم لودھی	۱۳۳
(خاندان مغلیہ)	
مغلیہ حکومت کا بانی سلطان بابر	۱۳۴
میرے لیے ہندوستان میں داخلہ خدا کا فضل عظیم ہے	۱۳۶
بیماری	۱۳۷
گوالیار اور بہار کا سفر	۱۳۸
عادات وخصائل	۱۳۸
بابر کا انتقال	۱۳۸
سلطان ہمایوں	۱۳۹
خاندان سور (افغانوں کی حکومت)	۱۳۹
سلطان شیر شاہ سوری	۱۳۹
سلطان سلیم شاہ سوری	۱۴۰
سور خاندان کا آخری فرماں رواں سکندر شاہ سوری	۱۴۱
سکندر شاہ کی تقریر	۱۴۱
سکندر شاہ کی شکست	۱۴۲
سلطان ہمایوں کا دوبارہ دہلی میں فاتحانہ داخلہ	۱۴۲
ہمایوں کا انتقال	۱۴۲
ہمایوں کے اوصاف	۱۴۳
خاندان سادات سے لے کر ہمایوں تک کے دور کا تجزیہ	۱۴۳
ہندوستان پر تیمور کا حملہ	۱۴۳
ملک کی سیاسی حالت میں تغیر وتبدل	۱۴۴
اطراف ملک میں قائم ہونے والی حکومتوں کے مختصر احوال	۱۴۵
ظاہری سلطنت اور باطنی سلطنت کا جوڑ	۱۵۰
(بادشاہ اکبر)	
اسلامی حکومت کا استحکام	۱۵۱
فتوحات اکبری	۱۵۲
مغلیہ نظام حکومت	۱۵۳
علوم وفنون کی سرپرستی	۱۵۴

طریق صلح کل	۱۵۵
اکبر کی ابتدائی مذہبی حالت	۱۵۵
عبادت خانہ	۱۵۶
اکبر کا مذہبی ذوق کیوں بدلا؟	۱۵۷
علماء کا اقتدار کم کرنے کی وجہ	۱۵۸
اکبر کے آخری ایام	۱۵۸
اکبر کی وفات اور جہانگیر کی تخت نشینی	۱۵۹
عہد اکبری میں علم وفن	۱۶۰
حضرت مجدد الف ثانی کی مذہبی خدمات	۱۶۰
شعائر اسلام کا احیاء	۱۶۲
اختلافات کا حل	۱۶۲
اکبر کے اوصاف	۱۶۳
بادشاہ جہانگیر	۱۶۴
عہد جہانگیر اور مجدد الف ثانی	۱۶۵
کتب خانہ اور مدارس	۱۶۹
بادشاہ شاہ جہاں	۱۶۹
تعمیری یادگاریں	۱۷۰
علمی لیاقت	۱۷۰
شعراء	۱۷۲
ملکی فتوحات	۱۷۲
وفات	۱۷۲
بادشاہ اورنگ زیب (عالم گیر)	۱۷۳
اصلاحات عالم گیری	۱۷۵
اسلامی مدارس اور ان کا نصاب تعلیم	۱۷۶
عالم گیر اور غیر مسلم	۱۷۶
علوم وفنون	۱۷۷
فتاویٰ عالم گیری	۱۷۸
فن خطاطی	۱۷۹
عالم گیر کی روحانی تربیت	۱۷۹
مدارس ومکاتب	۱۸۱
معمولات زندگی	۱۸۱
اورنگ زیب عالم گیر کے علمی کمالات	۱۸۳
اورنگ زیب کا حفظ قرآن	۱۸۴
سلاطین مغلیہ کا تجزیہ وتبصرہ	۱۸۴
پروفیسر رام پرساد کھوسلا اور مغل حکومت	۱۸۵
فیض رساں بادشاہت	۱۸۶
قیام امن	۱۸۶
کاشت کاروں کی محافظت	۱۸۶
علوم کی سرپرستی	۱۸۷
عدل گستری	۱۸۷
مذہبی رواداری	۱۸۷
رعایا نوازی	۱۸۸
ڈاکٹر پی سرن اور مغل حکومت	۱۸۹
مغل حکمرانوں کی عدل پسندی	۱۸۹

Scanned by CamScanner

پنچایتی نظام	۱۹۰	نظام دکن	۲۰۹
عدل نوازی کی اعلیٰ مثالیں	۱۹۰	نواب کرناٹک (ارکاٹ)	۲۱۰
قانونی کارروائی	۱۹۱	انگریزوں کے ساتھ میسور کی پہلی جنگ	۲۱۱
شاہ عالم بہادر شاہ اول	۱۹۳	انگریزوں کے ساتھ میسور کی دوسری جنگ	۲۱۲
سلطان جہاں دار شاہ	۱۹۴	انگریزوں کے ساتھ میسور کی تیسری جنگ	۲۱۳
سلطان فرخ سیر	۱۹۴	خلافت عثمانیہ کے پاس سفارت کی روانگی	۲۱۳
سلطان محمد شاہ	۱۹۴	نظام سے مفاہمت کے لیے ٹیپو کی کوشش	۲۱۴
سلطان عالمگیر ثانی	۱۹۵	اندرون ملک ہندو راجاؤں کو دعوت اتحاد	۲۱۵
سلطان شاہ عالم ثانی	۱۹۵	ملت فروشوں کی خفیہ سرگرمیاں	۲۱۵
شاہ ولی اللہ کا حکومت مغلیہ کے دور احتضار میں مجاہدانہ وقائدانہ کردار	۱۹۶	اتمام حجت کا آخری حربہ	۲۱۵
		معرکہ حق و باطل کا فیصلہ کن دن	۲۱۶
شاہ صاحب کا احساس اور اضطراب	۱۹۷	میر صادق موت کے گھاٹ	۲۱۷
تیموری سلاطین کا خاتم سلطان بہادر شاہ ظفر	۲۰۰	شیر کا ایک دن گیدڑ کے سو سال سے بہتر ہے	۲۱۸
ظفر کا شاعرانہ کلام	۲۰۲	آفتاب حریت شہید ہو گیا	۲۱۸
ظفر کا ناصحانہ کلام	۲۰۳	ستو ماسری رنگا پٹنم	۲۱۹
ہندوستان کے سیاسی حالات	۲۰۴	تجہیز و تکفین	۲۱۹
انگریزوں کی سیاسی سرگرمیاں	۲۰۵	ٹیپو کے زوال سے ہندوستانی سیاست پر اثر	۲۲۰
انگریزوں کی ہندوستان آمد	۲۰۶		
انگریزوں کے ساتھ ہندوستانیوں کی پہلی جنگ	۲۰۷	سلطنت خداداد کے زوال کا اثر عالم اسلام پر	۲۲۱
دوسری جنگ	۲۰۷	شاہ عبد العزیز کا قائدانہ کردار انگریزوں کے خلاف	۲۲۲
مرہٹہ	۲۰۸		

غیر منقسم ہندوستان کی سب سے بڑی تحریک جہاد	۲۲۳	آزادی بذریعہ طاقت	۲۴۳
		جلیانوالہ باغ میں	۲۴۳
ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط	۲۲۳	تحریک خلافت کا زمانہ	۲۴۳
مقصود اصلی ہندوستان ہے	۲۲۵	آخری منزل تک	۲۴۳
سرحد کا انتخاب اور پنجاب و افغانستان کے حالات	۲۲۶	جب لال قلعہ پر یونین جیک لہرایا	۲۴۵
		جب ہم خون کے دریا میں ڈوب گئے	۲۴۶
پنجاب میں مسلمانوں کی حالت	۲۲۸	کارواں چل پڑا	۲۴۷
افغانستان اور سرحد	۲۲۹	آزادی بذریعہ طاقت	۲۴۸
رائے بریلی سے جہاد کے لیے سفر ہجرت	۲۳۰	جنگ آزادی کا پہلا محاذ	۲۴۹
پنجتار سے بالاکوٹ کی طرف ہجرت	۲۳۱	مجاہدین آزادی کی کفن بردوش جماعت	۲۵۰
شہادت کی تیاری	۲۳۲	"ڈیوائڈ اینڈ رول" یعنی لڑاؤ اور حکومت کرو	۲۵۱
شہدائے بالاکوٹ کا مقام اور پیغام	۲۳۲	انگریزی ترکش کا ایک تیر	۲۵۲
انگریزوں کے خلاف شاملی کا آخری میدان	۲۳۳	سچائی کیا ہے؟	۲۵۳
دار العلوم دیوبند — ایک مثالی دینی درس گاہ	۲۳۳	آزادی کے دیوانے آزادی کی تلاش میں	۲۵۴
		لڑاؤ اور حکومت کرو	۲۵۵
اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن کون ہے؟	۲۳۸	جلیانوالہ باغ میں	۲۵۶
تحریک آزادی	۲۴۲	پنجاب کا ہنٹر ڈائر	۲۵۶
عروج کے بعد زوال	۲۴۲	امرتسر خون میں نہا گیا	۲۵۷
ہمارے اسلاف	۲۴۲	جلیانوالہ باغ کا روح فرسا منظر	۲۵۸
ہم نے تنہا ہی سفر کیا ہے	۲۴۳	فتویٰ یا اعلان بغاوت	۲۵۹

Scanned by CamScanner

فتویٰ ضبط کرلیا گیا	۲۵۹	تدبیر پر تقدیر غالب ہوگئی	۲۷۵
تجویز کیا تھی؟	۲۶۰	تقسیم ملک کے لیے راہ ہموار ہورہی ہے	۲۷۶
ہنگامہ دار و گیر شروع ہوگیا	۲۶۰	تقسیم کا فیصلہ	۲۷۷
مقدمہ کراچی	۲۶۱	تجویز منظور کرلی گئی	۲۷۸
چوری چورہ میں کیا ہوا؟	۲۶۲	ہندوستان نے آزادی جیت لی	۲۷۹
اس دیار پر قیامت ٹوٹ پڑی	۲۶۳	کارواں اپنی منزل پر پہنچ گیا	۲۷۹
نہرو رپورٹ کا قضیہ	۲۶۴	پارلیمنٹ میں صدائے حق کی بازگشت	۲۷۹
ڈانڈی مارچ	۲۶۵	شری این ۔ سی ۔ سکینہ	۲۸۴
پس دیوار زنداں	۲۶۵	دردمند تحریر	۲۸۵
سول نافرمانی کا دوسرا مرحلہ	۲۶۶	ہندوستان ہر لحاظ سے مسلمانوں کا	
نیا جال لایا پرانا شکاری	۲۶۶	وطن ہے	۲۸۷
سوامی شردھانند	۲۶۷	بحیثیت مذہب بھی ہندوستان مسلمانوں	
شدھی اور سنگھٹن	۲۶۷	کا وطن ہے	۲۸۷
انقلابات ہیں زمانے کے	۲۶۸	بحیثیت سکونت جسمانی بھی ہندوستان	
ہندوستان چھوڑو	۲۶۹	مسلمانوں ہی کا وطن ہے	۲۸۸
ہم بھی باغی ہیں	۲۷۰	بحیثیت تعلقات روحانی ، ہندوستان	
ایک ہی نعرہ پاکستان پاکستان	۲۷۰	مسلمانوں ہی کا ہے	۲۸۹
مسلم لیگ میدان عمل میں	۲۷۱	بحیثیت انتفاع اور احتیاج بجانب	
تصویر کا دوسرا رخ	۲۷۲	اجزاء وطن بھی ہندوستان مسلمانوں ہی	
بحری بغاوت	۲۷۳	کا وطن ہے	۲۹۰
جرأت رندانہ کا ایک اور منظر	۲۷۵	ماخذ	۲۹۳

تقریظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "المرتضیٰ" کے مقدمے میں ایک جگہ تحریر فرمایا ہے کہ "فن تاریخ کی مثال ایک منہدم قصر کی ہے جو کھنڈر کی شکل میں ہو، اس کے ملبے کے نیچے وہ سب کچھ مل سکتا ہے جس کی کسی طالب صادق اور جویائے حق کو ضرورت پڑ سکتی ہے، کہیں مٹی کے برتن اور روزمرہ کے استعمال کی چیزیں ہوں گی۔ کسی جگہ زیورات و جواہرات بکھرے اور دبے ہوئے ملیں گے، کہیں محرابیں ہوں گی جو زبان حال سے ایوان شاہی کے دور رفتہ کی داستان شوکت و عظمت سنا رہی ہوں گی۔ ہمارے محترم مکرم جناب مفتی محمد صاحب پالنپوری نے فن تاریخ کے موضوع پر یہ اہم کتاب لکھ کر اسلامی اور ہندوستانی تہذیبی زندگی اور ان کی معرفت انسانی اقدار کی بڑی ضرورت سرانجام دی ہے۔

"سوانح مولانا محمد عمر پالنپوری" اور "مومن قوم اپنی تاریخ کے آئینہ میں" کے مصنف گرامی نے اپنی اس تازہ تالیف کو بڑی محنت اور کاوش کے ساتھ مرتب فرمایا ہے، سلاطین ہند کے ابتدائی عہد سے لے کر قیام جمہوریت تک کے طویل فاصلہ کو بڑی دیدہ وری سے سمیٹا ہے، صدیوں پر محیط تاریخی جھلکیاں اور واقعاتی پرچھائیاں آئینہ کتاب میں بڑی دلفریب نظر آتی ہیں۔ کوزے میں سمندر کو بند کردینا ہر کسی کا کام نہیں اس کے لئے بڑی جگر کاوی اور عرق ریزی کرنی پڑتی ہے اور فاضل مصنف نے یہ سب کچھ کر دکھایا ہے۔

ہندوستان کی جنگ آزادی میں ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۳ء تک کا زمانہ بہت ہی اہم اور خوش گوار تھا۔ ہندو مسلمان رہنما شیر و شکر ہو کر شہروں، قصبوں اور اہم مرکزوں کے دورے کرتے تھے، دونوں فرقوں کی یگانگت، موانست، یکجہتی اور وطن دوستی کے بڑے پُر کیف اور خوش گوار مناظر دیکھنے میں آرہے تھے۔ یہ دور ہندوستان کی قومی یکجہتی کا زریں دور کہا جاسکتا ہے، لیکن پھر رفتہ رفتہ ماحول میں تبدیلیاں نظر آنے

Scanned by CamScanner

لگیں، مٹھی بھر تنگ نظر اور متعصب افراد نے ماحول کو اس درجہ بگاڑ دیا کہ اتحاد و اتفاق کی جگہ بغض و عناد نے لے لی اور مسلمانوں کے تئیں بدگمانیاں عام ہوگئیں، ہندؤوں کے متعصب طبقہ نے اپنی مقصد برآری کے لئے تاریخ سلاطین ہند کی اصل شبیہ کو پورے طور پر مسخ کر دیا۔ نصابی کتابوں میں ایسے ایسے مضامین شامل کئے گئے جس کی بدولت نفرت و عداوت کی خلیج مزید وسیع ہوگئی اور غیر تو غیر اپنوں کی نگاہوں سے بھی ان اولوالعزم حکمرانوں کی اصل حقیقت مستور ہو کر رہ گئی۔ امید کی جانی چاہئے کہ مفتی صاحب کی اس تازہ تالیف کے ذریعہ مسلم حکمرانوں کی انسانی زندگی، اسلامی سیرت و اخلاق اور ظاہری و باطنی کمالات کے ایسے نادر نمونے سامنے آجائیں گے جن سے ملت اسلامیہ کے نوجوان افراد کو دینی حمیت، اسلامی غیرت اور ملک کی صحیح خدمت و رہنمائی کی توفیق نصیب ہو۔ ہماری دلی دعا ہے کہ یہ کتاب مقبول ہو اور مسلمان حکمرانوں اور اسلامی حکومتوں کے محاسن و امتیازات کا دل آویز نقش تعصب زدہ دلوں اور دماغوں میں از سر نو قائم کر دے۔ مصنف دامت برکاتہم کی یہ سعی جس مقصد کے پیش نظر کی گئی ہے صدفی صد اس کی تکمیل ہو۔

راقم الحروف کی خوش نصیبی ہے کہ اس کو اس بیش قیمت کتاب کی تقریظ لکھنے کا موقع ملا جو کتاب کی خدمت و تعارف سے کہیں زیادہ خود تقریظ نگار کے لئے باعث سعادت اور موجب برکت ہے۔

محمد مہتاب عالم قاسمی
(شیخ الحدیث) جامعہ دارالعلوم الفضل جوہاپورہ
احمد آباد

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفی، أما بعد:

تاریخ ہر دور میں دلچسپی کا موضوع رہی ہے۔ انسان کی زندگی ہمیشہ اس کے ماضی کے ساتھ جڑی رہتی ہے، ماضی کا مطالعہ حال اور مستقبل کو بہتر بنانے میں بڑا مددگار ثابت ہوتا ہے۔ جو لوگ ماضی کو فراموش کر کے حال اور مستقبل کو سازگار بنانا چاہتے ہیں ان کا خواب کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا۔

علاوہ ازیں علم تاریخ انسان کے سیاسی شعور کو بھی بیدار کرتا ہے۔ اس سے نگاہ میں وسعت اور ذہن میں کشادگی پیدا ہوتی ہے۔ قوموں کے عروج و زوال کی داستان بھی اسی سے وابستہ ہے۔ اور انسانیت کا کارواں بھی اسی کے سہارے رواں دواں رہتا ہے۔

عصر حاضر میں جمہوریت کی مقبولیت نے انسان پر بڑی ذمہ داری ڈال دی ہے، اسے اپنے حکمرانوں کا انتخاب خود ہی کرنا ہے۔ اس کے لئے بھی تاریخی معلومات ناگزیر ہیں۔ گذشتہ حالات کے اتار چڑھاؤ کو جانے اور سمجھے بغیر حال اور مستقبل کے بارے میں قابل قبول فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ غرض تاریخ انسانی زندگی کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

تاریخ کے موضوع پر ہر زبان میں تالیفات موجود ہیں۔ مگر بعض اتنی مفصل ہیں کہ ان سے طلبا کے لئے اور تمام مسلمانوں کے لئے استفادہ مشکل ہے اور بعض اتنی مختصر ہیں کہ کچھ پلے نہیں پڑتا ہے۔ اب تاریخ ہند کے موضوع پر جناب مولانا مفتی محمد صاحب پالن پوری نے قلم اٹھایا ہے اور ایک جامع کتاب لکھ دی ہے۔ جس میں مسلم عہد حکومت سے قیام جمہوریت تک کے حالات ہیں جو بہت واضح اور دل چسپ انداز میں بیان کئے ہیں۔ اگر عام مسلمان اس کا مطالعہ کریں گے تو وہ بھی موتیوں سے دامن مراد بھر لیں گے۔ اور مدارس اسلامیہ اور اسکولوں کے طلبا پڑھیں گے تو وہ بھی فیض یاب ہوں گے۔ اللہ

تعالیٰ اس کتاب کو قبول فرمائیں، مصنف زید مجدہ کے لئے مفید بنائیں اور تمام مسلمانوں کو اس سے استفادہ کی توفیق ارزانی فرمائیں (آمین)

کتبہٗ

سعید احمد، عفا اللہ عنہ پالن پوری
خادم دار العلوم دیوبند
۵/صفر ۱۴۲۷/ہجری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض مؤلف

نحمدہٗ و نصلی علی رسولہ الکریم

تاریخ جہانبانی صدیوں سے بتاتی ہے
بے جہد نہیں کھلتے اسرار جہانگیری

ہندوستان میں مسلم عہد حکومت کی بہت سی تاریخیں لکھی گئی ہیں، البیرونی سے لے کر دور حاضر تک کے بہت سے مؤرخوں نے ماضی کے لمحوں کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں مگر ان تاریخی کتب کی نوعیت کچھ اس طرح ہے کہ بعض کتابوں کا موضوع صرف مسلم حکمرانوں کی مذہبی رواداری ہی سے متعلق ہے بعض کتابوں میں جنگ وجدال کا ذکر غالب ہے بعض قدیم کتابیں ایسی ہیں جن میں اپنے دور تک کے حالات کا ہی ذکر ہے بعض کتابیں صرف سلاطین مغلیہ ہی سے متعلق ہیں بعض کتب میں صرف تحریکِ آزادی یا اس سے ماقبل تک کے حالات ہیں نیز انگریزوں کو ملک بدر کرنے کے لئے جن شخصیات نے عظیم قربانیاں دی ہیں ان کے تذکرہ سے متعلق کتابیں ان کے ذکر خیر تک ہی محدود ہیں الغرض ضرورت تھی ایسی کتاب کی جسمیں تمام سلاطینِ ہند کی تاریخ ان کے ذاتی اوصاف وکمالات، ان کے علمی وعملی تجربات ان کے عدل وانصاف اور ملک کی مختلف برادریوں کے ساتھ ان کی رواداری کے حالات ومعاملات اور سات سو سال تک اسلامی حکومت کے برقرار رہنے اور اس کے بعد زوال کی وجوہات، پھر مٹھی بھر انگریزوں کا سات سمندر پار سے آکر اتنے بڑے ملک پر برسر اقتدار آجانے کے اسباب وواقعات اور ان کو ملک بدر کرنے کے لئے مختلف تحریکوں کی نوعیت وحیثیت، بالخصوص مسلمانوں کی عظیم قربانیوں کا ذکر، جمہوریت کا قیام اور اس طرح کے دیگر کئی موضوعات مختصر طور پر صرف ایک ہی کتاب میں اس طرح دستیاب ہوسکیں کہ قارئین کو ہندوستان کی عمومی اور اسلامی تاریخ کا ایک نگاہ میں

پورا اندازہ ہو سکے اور تفصیلی مواد کے طالبین حوالوں کے بموجب اصل کتاب کی طرف بھی رجوع کرسکیں۔ سب سے پہلے جناب مولانا محمد یٰسین صاحب مہتمم مدرسہ دارالعلوم جامعہ نذیریہ کاکوسی نے بندہ کے ساتھ حسن ظن رکھتے ہوئے اس قسم کی مختصر انداز والی تاریخی کتاب کی ضرورت کا نہ صرف یہ کہ احساس دلایا بلکہ اس دینی خدمت کو جلد انجام دینے پر آمادہ بھی کرلیا۔ جزاہ اللہ عنی خیر الجزاء۔

بندہ ہرگز اس لائق نہیں تھا محض خدا کی توفیق اور اس کی بے پایاں عنایتوں کے طفیل یہ کام انجام پذیر ہوا۔ بندہ کسی خوش فہمی میں مبتلا ہوئے بغیر اس بات کا معترف ہے کہ اس میں ضرور کمی بیشی اور غلطی کا بھی امکان ہے احقر نے معتبر کتابوں سے مثبت پہلوؤں کو مختصر انداز میں باحوالہ جمع کرنے کی کوشش کی ہے جو کچھ جمع کیا ہے اس میں بعض سلاطین کا ذکر برائے نام ہے اور بعض کا قدرے تفصیل کے ساتھ، اس کی وجہ مدتِ حکومت اور معیارِ حکومت بھی ہے علاوہ ازیں سلطان کی خدمات جلیلہ اور کارہائے عظیمہ کا بھی دخل ہے۔ بہرحال بمقتضائے بشریت کتاب میں غلطی محسوس ہو تو اصلاح فرمالیں اور ممکن ہو تو بندہ کو مطلع فرمانے کی زحمت گوارہ فرمائیں۔

اخیر میں رفیق محترم "شیخ الحدیث دارالعلوم افضل جوہاپورہ احمد آباد حضرت مولانا مہتاب عالم صاحب" کا بے حد ممنون و مشکور ہوں کہ انہوں نے اپنی بے پناہ تدریسی مصروفیات میں سے اپنا قیمتی وقت نکال کر کتاب کے مسودہ پر نظر ثانی کی زحمت گوارہ فرمائی اور اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازا۔

جزاہ اللہ احسن الجزاء

محمد ڈینڈ رولوی

۳؍مارچ ۲۰۰۶ء

ابتدائیہ

ہندوستان کی کچھ خصوصیات

یہ شرف تمام عالم میں صرف ہندوستان ہی کو حاصل ہے کہ خدا تعالیٰ کے سب سے پہلے پیغمبر حضرت آدم علیہ السلام اوّل ہندوستان میں اُترے۔ وحیٔ نبوت سب سے پہلے ہندوستان میں آئی۔ یا یوں کہیے کہ اسلام سب سے پہلے ہندوستان میں آیا، علامہ آزاد بلگرامی نے اسی وجہ سے مآثر ہندوستان کی سب سے بڑی فضیلت یہی لکھی ہے۔ (سبحۃ المرجان فی مآثر ہندوستان)

لیکن ہماری بحث کا تعلق اس وقت ہندوستان کے اس اسلامی دور سے ہے جس کی ابتداء خاتم الانبیاء والمرسلین حبیب رب العٰلمین ہمارے رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے ہوتی ہے۔

ہندوستان میں اسلام

عرب بالخصوص قریش ایک تاجر قوم تھی۔ اس زمانہ کی سادگی اور آلات نقل و حمل اور رسل و رسائل کی بے حد کمی کے باوجود دنیا کی مشرق و مغرب ان کے زیر قدم تھی۔ دور دراز کے ملکوں سے اموال تجارت کی درآمد و برآمد ان کا پیشہ تھا۔ اس تجارتی سلسلہ میں ان کے تعلقات ہندوستان کے ساتھ بھی بعثتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہی قائم تھے بالخصوص مالابار (لنکا) ان کا تجارتی مرکز تھا، بہت سے عرب یہیں آباد ہو گئے تھے۔ [1]

مشہور فرانسیسی مورخ لیبان اپنی کتاب "تمدن عرب" میں لکھتا ہے کہ...

"عربوں نے تجارتی تعلقات کو بہت بڑی وسعت اور ترقی دی، وہ بہت جلد

---

[1] مولانا حذیفہ وستانوی صاحب نے بتوسط مولانا محمد عثمان بھیلون تاریخ کی تین کتابیں بندہ کے پاس بھیجی تھیں تاکہ ان میں سے کچھ ضروری باتیں منتخب کر کے تاریخ ہند کے ابتدائیہ میں شامل کروں، الحمد للہ تقریباً بیس صفحات انہی کتابوں کے حوالہ سے ابتدائیہ میں شامل کئے ہیں، مولانا موصوف کا ذوق لائق قدر ہے اور بندہ اس زحمت کے بدل ان کا مشکور و ممنون ہے۔

Scanned by CamScanner

ساحل کارومنڈل، مالابار، سماٹرا، جزائر بحر ہند کو طے کرتے ہوئے جنوبی چین تک پہنچ گئے۔"[۱]

2

سب سے پہلے اسلام مالابار میں (کیرلا)

عام طور پر مشہور یہ ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلے اسلام علاقہ سندھ میں آیا، لیکن تاریخی حقیقت یہ ہے کہ اسلام ہندوستان میں سب سے پہلے مالابار، سراندیپ وغیرہ جزائر شرق الہند میں پھیلا۔ مگر یہ اشاعت جنگ و جہاد کے ساتھ نہیں ہوئی بلکہ عرب تجار کی آمد و رفت کے سبب ہوئی۔ جہاد کی صورت میں اسلام کا فاتحانہ داخلہ بیشک سندھ سے شروع ہوا اور شاید اسی سبب سے اس کو ابتدائی داخلۂ اسلام کہا گیا ہے۔

عربوں کی آمد و رفتِ پہلے ہی سے مالابار میں تھی، لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا حال مالابار میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانہ میں لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا، اس زمانہ میں مالابار کا راجہ زموتن یا سامری کے نام سے مشہور تھا جو خاندان پلویا سے تعلق رکھتا تھا۔ اس راجہ نے معجزہ "شق القمر" کو دیکھ کر اس عجیب واقعہ کے متعلق تحقیق و تفتیش شروع کی اور اس واقعہ کو بطور یادداشت سرکاری روزنامچہ میں درج کرایا۔ بالآخر اس کو معلوم ہوا کہ عرب کے ملک میں ایک پیغمبر پیدا ہوئے اور انہوں نے یہ معجزہ دکھایا ہے، یہ سن کر راجہ نے اسلام قبول کر لیا اور تخت و سلطنت اپنے ولی عہد کو سپرد کر کے خود کشتی میں سوار ہو کر ملکِ عرب کی جانب روانہ ہوا لیکن راستہ ہی میں فوت ہو کر ساحلِ یمن میں مدفون ہوا۔ راجہ کا یہ سفر چونکہ عام اطلاع بغیر پوشیدہ طور پر عمل میں آیا تھا لہٰذا لوگوں نے راجہ کے اس طرح غائب ہو جانے کی حقیقت کو نہ سمجھا۔[۲]

انہی ایام میں کچھ مسلمان تاجر سراندیپ میں آئے اور اسلام کا پیغام ساتھ لائے۔ جن عربوں نے اس جزیرہ میں تجارتی ضرورتوں کے سبب بود و باش اختیار کر لی تھی، اوّل وہ مسلمان ہوئے اور پھر بہت جلد جزیرہ میں اسلام پھیلنے لگا، حتیٰ کہ سراندیپ کا راجہ بھی مسلمان ہو گیا اور اپنے آپ کو خلافت اسلامیہ کے ساتھ وابستہ کر لیا۔ یہ بات تحقیق طلب ہے کہ سراندیپ کا راجہ خلافت راشدہ کے زمانے

۱، ۲ فتوح البند، صفحہ ۹، مؤلفہ مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ۔

میں مسلمان ہو چکا تھا یا خلافت بنو اُمیہ کے ابتدائی زمانہ میں مسلمان ہوا۔ بہرحال خلافت بنو اُمیہ کے ابتدائی زمانہ میں سراندیپ کا راجہ مسلمان تھا۔ فرشتہ کے الفاظ یہ ہیں:

"ہر آئینہ حاکم سراندیپ از رایاں دیگر مواضع ہندوستان بر حقیقت اسلام مطلع شدہ در عہد صحابہ کرام مقلد قلادہ شریعت مصطفوی گردیدہ بود۔"[۱]

سراندیپ کے بعد ہی لکادیپ، مالدیپ اور مالابار میں اسلام پھیل چکا تھا۔ مالابار میں اسلام نے اس لیے اور بھی جلد جلد ترقی کی، اسلام کی مساوات و رواداری، ذات پات کی قیود کو دور کر کے مظلوم و مغلوب لوگوں کے لیے ایک ابر رحمت اور سامانِ ترقی تھی۔ مالابار کا راجہ بھی دوسری صدی ہجری کے اوائل میں چند مسلمان سیاحوں کے ہاتھ پر مشرف با اسلام ہو گیا۔ عجائب الانظار کی روایت کے موافق اس وقت کا راجہ چیرامن پیرومل تھا اس نے بھی مشرف با اسلام ہونے کے بعد اُمورِ سلطنت اپنے نائبین کے سپرد کر کے حجاز مقدس کے سفر کا قصد کیا مگر عجائب اتفاق سے یہ بھی وہاں نہ پہنچ سکا، راستہ ہی میں انتقال ہو گیا۔ آخر وقت میں اپنے رفقاء کو وصیت کی کہ مالابار میں تبلیغ اسلام کے کام کو پوری مستعدی سے وسیع پیمانہ پر جاری کیا جاوے ساتھ ہی اس نے اپنے نائب السلطنت کے نام بھی اسی مضمون کا ایک خط لکھ دیا، جس کو شرف بن مالک اور مالک بن دینار اور مالک بن حبیب وغیرہ لے کر مالابار واپس آئے۔ نائب السلطنت نے ملک کے تمام سرداروں کو راجہ کے خط کا مضمون لکھ بھیجا جس کے سبب راجہ کی قوم کے آدمی بکثرت اسلام میں داخل ہو گئے۔ مالک بن دینار وغیرہ نے کدنکلور (کالی کٹ) میں مسجد تعمیر کی اور اس کے بعد کل مالابار کا دورہ کیا، جا بجا لوگ اسلام میں داخل ہوئے اور مسجدیں تعمیر ہوئیں، پھر یہ حضرات دورہ کرتے ہوئے ساحل کارومنڈل تک پہنچے۔ وہاں بھی بکثرت لوگوں نے اسلام قبول کیا اور مسجدیں تعمیر ہوئیں۔ اس کے بعد جنوبی ہند کی طرح بحر الکاہل کے جزائر جاوا، سماٹرا، سنگاپور، ملایا وغیرہ میں بھی اسی طرح اسلام پھیلنا شروع ہوا اور بہت جلد اُن بلاد میں عام ہو گیا (یہ تمام مضمون تاریخ فرشتہ سے ماخوذ ہے) الغرض محمد بن قاسم ثقفی کے حملہ اور فتح سند سے پہلے جنوبی ہند سراندیپ اور مالابار وغیرہ میں اسلام پھیل چکا تھا۔ اور تفصیل مذکور

۱ بحوالہ فتوح البند، صفحہ ۱۰۔

Scanned by CamScanner

سے ظاہر ہے کہ ان بلاد میں اسلام کا داخلہ محض تبلیغی صورت سے ہوا۔ قہر و غلبہ اور جنگ و جہاد کا اس میں دخل نہ تھا۔[۱]

فتوح السندھ

آج کل صوبہ سندھ جس مختصر سے خطہ زمین کا نام ہے، آج سے بارہ سو سال پہلے سندھ صرف اس محدود خطہ کا نام نہیں تھا بلکہ وہ ایک طویل و عریض اور وسیع ملک تھا۔ اس زمانہ کے مورخین جس ملک کو سندھ کے نام سے موسوم کرتے ہیں وہ مغرب میں مکران تک جنوب میں بحر عرب اور گجرات تک مشرق میں موجودہ ملک مالوہ کے وسط اور راجپوتانہ تک شمال میں ملتان سے اوپر گزر کر جنوبی پنجاب کے اندر تک پھیلا ہوا تھا۔ اس میں پنجاب کے جنوبی اضلاع بلوچستان کا اکثر حصہ، صوبہ سرحد کا جنوبی حصہ، راجپوتانہ کا اکثر حصہ، گجرات کا شمالی حصہ مع موجودہ ملک سندھ کے تھا۔ مورخین نے راجہ چچ اور اس کے پیش رو راجہ کے جو حدود حکومت بیان کئے ہیں وہ اس مذکورہ سندھ سے بھی زیادہ وسیع ہیں لیکن حملہ آوروں اور ان کے مورخین نے جس ملک کو سندھ کے نام سے تعبیر کیا ہے اسی کے وہ حدود ہیں جو اوپر مذکور ہوئے۔[۲] (آئینہ حقیقت نما، صفحہ ۶۹)

فتوح البلدان میں علامہ بلاذری نے فتوح السندھ کی جو تفصیل دی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فتوح سندھ و ہند کا ابتدائی سلسلہ تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت ہی میں شروع ہو چکا تھا۔ عہد فاروقی ۱۵ھ ہجری میں سب سے پہلے عثمان بن ابی العاص والیٔ بحرین نے اپنے بھائی حکم کو اس طرف بھیج دیا تھا جس کو خلیفہ وقت حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پسند نہ فرمایا اور یہ ویسے ہی واپس ہو گئے۔ پھر حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں چند لوگ ہندوستان کے حالات دریافت کرنے کے لئے بھیجے مگر حملہ و جہاد کی نوبت نہیں آئی۔ پھر حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ کے عہدِ خلافت میں حارث بن مرۃ عبدی بطور خود سرحد سندھ پر حملہ آور ہوئے اور ایک حد تک کامیاب ہوئے پھر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت ۴۴ھ ہجری

۱، ۲ فتوح الہند۔

میں مہلب ابن ابی صفرہ (جن کو اکثر حضرات نے صحابی قرار دیا ہے اور ان سے ایک حدیث بھی روایت کی ہے، بعض نے ان کی صحابیت سے انکار کیا ہے، اصابہ للحافظ ابن حجرؒ) کابل قندھار کی بغاوت فرو کرنے کے لیے اس طرف آئے۔ بنہ[۱] اہواز، قیقان میں مقابلے ہوئے۔ یہاں کے باغی موجودہ سندھ میں آ کر پناہ گزیں ہو گئے۔ حضرت مہلب نے ان کا تعاقب کیا، دریائے سندھ کو عبور کر کے ملتان تک فتح کیا، اسی لیے بہت سی مستند تاریخوں میں ہندوستان کا فاتح اوّل مہلب ابن ابی صفرہ کو قرار دیا ہے۔ (تاریخ فرشتہ، فتوح البلدان، لذیلی وحلان وغیرہ)[۲]

مگر مہلب ابن صفرہ کو پھر دوسری مہمات پر جانا پڑا اور پھر راجہ چچ ان پر غالب آ گیا۔

(فتوح البلدان للبلاذری، فتوح البلدان لذینی وحلان، تاریخ فرشتہ، آئینہ حقیقت نما)

الغرض سرحد ایران کی بغاوت فرو کرنے یا باغیوں کا تعاقب کرنے کے سلسلہ میں چھوٹے چھوٹے حملے اور وقتی و ہنگامی فتوحات کا سلسلہ تو کچھ پہلے سے شروع تھا مگر مستقل طور پر سندھ فتح کرنے کے لیے خلافت اسلامیہ کی طرف سے باقاعدہ حملہ کی ابتداء ۸۹ھ ہجری میں خلیفۂ وقت ولید بن عبدالملک کے حکم سے ہوئی اور اس کا انتظام والی عراق حجاج بن یوسف ثقفی کے سپرد ہوا۔ اور سبب محرک اس حملہ کا یہ ہوا کہ حاکم سراندیپ جو پہلے مسلمان ہو چکا تھا اس نے کچھ تحائف و ہدایا خلیفہ وقت ولید بن عبدالملک کے لیے اور کچھ مسلمان مسافر تجار و حجاج کے آٹھ جہاز سراندیپ روانہ کئے تھے، جب یہ جہاز باب عجم (ساحلِ سندھ) کے قریب پہنچے تو سندھ کے راجہ داہر کی طرف سے چھوڑے ہوئے ڈاکوؤں نے ان جہازوں کو گرفتار کر لیا اور دیبل بندرگاہ سندھ پر لا کر مال و اسباب لوٹ لیا اور مسلمان مسافروں کو قید کر لیا، کچھ لوگ بچ نکلے اور عراق پہنچ کر حجاج بن یوسف سے واقعہ بیان کیا اور استغاثہ کیا۔ حجاج نے راجہ داہر کے نام خط لکھا کہ ہمارے مسلمان تجار اور حجاج کو فوراً رہا کر دو اور ان کے اموال واپس کر دو۔ راجہ داہر نے اس کا مغرورانہ اور لغو جواب دیا، اس وقت حجاج بن یوسف نے امیر المومنین ولید بن عبدالملک سے سندھ پر جہاد کی اجازت طلب کی اور باذن

۱ ان ناموں کے شہر قدیم تاریخ میں حدود سندھ کے اندر شمار کئے گئے ہیں۔ اب معلوم نہیں کہ یہ شہر موجود ہیں تو کن ناموں سے موسوم کئے جاتے ہیں۔

۲ فتوح الہند۔

Scanned by CamScanner

امیر المومنین اول چند مختصر فوجی دستے سرحد سندھ پر بھیجے مگر راجہ داہر نے کافی قوت فراہم کی ہوئی تھی وہ کافی نہ ہوئے تو پھر ۸۹ ہجری میں چھ ہزار شامی و عراقی عربوں کا لشکر محمد بن قاسم ثقفی کی قیادت میں سندھ پر بھیجا گیا۔ (تاریخ کامل ابن اثیر، صفحہ ۲۰۵، جلد ۴، و فتوح البلدان) ؎۱

عجیبہ

محمد بن قاسم ثقفی چھ ہزار کا لشکر لے کر سرحد سندھ پر پہنچے اور پھر ایک عجیب تدبیر سے کشتیوں کا پل بنا کر دریائے سندھ کو عبور کر کے راجہ کی زبردست ہاتھیوں کی فوج سے مقابل ہوئے تو اسلامی دارالخلافت سے ہزاروں میل کے فاصلہ پر یہ جنگ جاری تھی اور آلاتِ رسل و رسائل، دخانی جہاز، ہوائی جہاز، ریڈیو، لاسکی پیغام وغیرہ جو آج کل پائے جاتے ہیں ان کا کہیں نام نہیں تھا، لیکن انتظام کی خوبی یہ تھی کہ عراق کے دارالخلافہ سے محمد بن قاسم کے پاس، ڈاک اور اس میں جنگ کے متعلق ہدایات ہر تیسرے روز پہنچتی تھیں۔ یہاں تک کہ (عروس نامی) قلعہ شکن منجنیق جو لشکر اسلامی کے ساتھ تھا اس کا حملہ دیبل کے سب سے بڑے منارہ (وقل نامی) پر کس سمت اور کس انداز سے ہو اس کا پورا نقشہ کھینچ کر حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کو بھیجا تھا۔ ہر تیسرے روز ہندوستان کی ڈاک عراق اور عراق کی ڈاک ہندوستان پہنچ جاتی تھی۔ (فتوح البلدان للبلاذری، صفحہ ۴۲۵) ؎۲

حجاج بن یوسف کے فرامین بنام محمد بن قاسم

حجاج بن یوسف ثقفی امیر عراق جہاد سندھ کی طرف اس طرح متوجہ تھا کہ گویا وہی اس فوج کی کمان کر رہا ہے۔ ہر تیسرے روز اس کی ڈاک سندھ پہنچتی تھی، اب وہ چند فرامین اس جگہ نقل کئے جاتے ہیں جو حجاج نے مختلف مواقع پر بنام محمد بن قاسم روانہ کئے ہیں جن میں محمد بن قاسم کو سیاست و دیانت کے اُصول بتلا کر ان کا پابند رہنے کا حکم ہے۔ نیز باشندگانِ سندھ اور ان کے اموال و اراضی کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے، اس کا بیان ہے۔

؎۱ ؎۲ فتوح الہند۔

فتح دیبل کی خوشخبری سن کر حجاج نے محمد بن قاسم کو لکھا

"جب ملک پر تم قابض ہو جاؤ تو قلعوں کی استواری اور لشکر کی رفع احتیاج کے بعد تمام اموال و خزائن کو بہبود رعایا اور رفاہِ خلق میں خرچ کرو اور یاد رکھو کہ کاشتکاروں، کاریگروں، سوداگروں اور پیشہ وروں کی خوشحالی اور فارغ البالی سے ملک آباد و سرسبز ہوتا ہے۔ رعایا کے ساتھ ہمیشہ رعایت کرو تا کہ وہ تمہاری طرف محبت کے ساتھ راغب ہوں۔" (آئینہ حقیقت نما، صفحہ ۱۰۴) ؎۱

جب محمد بن قاسم بیرون میں مقیم تھے تو ان کو حجاج کا خط پہنچا

"اہل بیرون کے ساتھ نہایت نرمی اور دلدہی کا سلوک کرو، ان کی بہبودی کے لیے کوشش کرو، لڑنے والوں میں جو تم سے امان طلب کرے اس کو ضرور امان دو، کسی مقام کے اکابر سردار تمہاری ملاقات کو آئیں تو ان کو قیمتی خلعت اور انعام و اکرام سے سرفراز کرو۔ عقل و دانائی کو اپنا رہبر بناؤ، جو وعدہ کسی سے کرو اس کو ضرور پورا کرو، تمہارے قول و فعل پر سندھ والوں کو پورا پورا اعتماد و اطمینان ہو۔" (صفحہ ۱۰۴) ؎۲

فتح سیوستان کے بعد حجاج کا خط پہنچا

"جو کوئی تم سے جاگیر و ریاست طلب کرے تم اس کو نا اُمید نہ کرو اور التجاؤں کو قبول کرو، امان و عفو سے رعایا کو مطمئن کرو، سلطنت کے چار ارکان ہیں، اوّل مدارات و درگزر و محبت۔ دوم سخاوت و انعام۔ سوم دشمنوں کی مزاج شناسی اور ان کی مخالفت میں عقل کو ہاتھ سے نہ دینا۔ چہارم قوت و شہامت۔ تم راجاؤں سے جو عہد کرو اس پر قائم رہو۔ جب وہ مال گزاری دینے کا اقرار کر لیں تو ہر طرح ان کی اعانت و امداد کرو، جب کسی کو سفیر بنا کر بھیجو تو اس کی عقل و امانت کو جانچ لو۔ اور جو شخص

؎۱ ؎۲ فتوح الہند، صفحہ ۲۴۸۔

توحیدِ الٰہی کا اقرار اور تمہاری اطاعت کرے اس کے تمام مال و اسباب اور ننگ و ناموس کو برقرار رکھو لیکن جو اسلام قبول نہ کرے اس کو صرف اس قدر مجبور کرو کہ تمہارا مطیع ہو جائے۔ جو شخص بغاوت و سرکشی اختیار کرے اس سے تم لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ شریف اور رذیل میں امتیاز کرو، اور ایسا بھی نہ ہو کہ تمہاری صلح جوئی کو دشمن تمہاری کمزوری محسوس کریں۔"

(آئینہ، صفحہ ۱۰۴) ۱

فائدہ (الف):- اس فرمان میں اس کی بھی تصریح ہے کہ بعض لوگوں کو جاگیر اور جائداد بھی دی جائے گی اور ظاہر یہ ہے کہ یہ جاگیر سرکاری مقبوضات یا غیر مملوکہ جنگلات وغیرہ سے دی جائے گی، کیونکہ مملوکہ زمینیں تو مالکانِ اراضی کی ملکیت سے نہیں نکالی گئیں جیسا کہ اسی خط میں آگے مذکور ہے۔

(ب):- مالگزاری یعنی خراج دینے کا قرار کر لینے پر ان کی امداد و اعانت کے حکم سے ظاہر ہوا کہ باشندگانِ سندھ کی زمینیں مالکانِ اراضی کی ملک سے نہیں نکالی گئیں بلکہ بدستور انہیں کی ملکیت کو برقرار رکھا ورنہ ان سے خراج و مالگزاری کا مطالبہ نہ ہوتا۔

محمد بن قاسم نے جب دریا کو عبور کر لیا اور راجہ داہر سے مقابلہ شروع ہو گیا تو ان کے پاس حجاج بن یوسف کا یہ خط پہنچا۔

پنج وقتہ نماز پڑھنے میں سستی نہ ہو، تکبیر و قرات، قیام و قعود اور رکوع و سجود میں خدا تعالیٰ کے روبرو تضرع و زاری کیا کرو، زبان پر ہر وقت ذکر الٰہی جاری رکھو کسی شخص کو شوکت و قوت خدا تعالیٰ کی مہربانی کے بغیر میسر نہیں ہو سکتی، اگر تم خدا تعالیٰ کے فضل و کرم پر بھروسہ رکھو گے تو یقیناً مظفر و منصور ہو گے۔

(آئینہ حقیقت نما، صفحہ ۱۰۵) ۲

فائدہ:- یہ فرمان کسی خلیفۂ راشد یا متقی پرہیزگار امیر کا نہیں بلکہ ایک ایسے امیر کا فرمان ہے جو دنیائے اسلام میں سب سے بڑا ظالم، فاسق، فاجر مشہور ہے۔ لیکن اس حقیقت پر وہ بھی

۱، ۲ فتوح البند، صفحہ ۳۰۔

اطمینان اور یقین رکھتا ہے کہ مسلمان قوم کی فتح و کامیابی صرف اور صرف اطاعت خداوندی اور بالخصوص نماز کے اہتمام اور پابندی کے ساتھ وابستہ ہے۔

آج کل کے زعمارِ اُمت کے لیے یہ ایک درسِ عبرت ہے جنہوں نے اسلامی سیاست کو صرف ظاہری تدبیروں سے منحصر کر رکھا ہے اور نماز، روزہ اور احکام الٰہیہ کی اطاعت کو گو ضروری جانتے ہوں مگر مسلمانوں کے قومی اور ملی مفاد کے لیے اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں سمجھتے۔ اسی لیے کسی وقت کسی مقام پر وہ ان شعائرِ دینیہ کے احیاء میں اس سرگرمی کے ساتھ مشغول نظر نہیں آتے جتنی کسی ادنیٰ الیکشن میں برتی جاتی ہے۔ ۱

آج کل کے زعمارِ اُمت کے لیے یہ ایک درسِ عبرت ہے جنہوں نے اسلامی سیاست کو صرف ظاہری تدبیروں میں منحصر کر رکھا ہے اور نماز، روزہ اور احکامِ الٰہیہ کی اطاعت کو گو ضروری جانتے ہوں مگر مسلمانوں کے قومی اور ملی مفاد کے لیے اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں سمجھتے۔ اسی لیے کسی وقت کسی مقام پر وہ ان شعائرِ دینیہ کے احیاء میں اس سرگرمی کے ساتھ مشغول نظر نہیں آتے جتنی کسی ادنیٰ الیکشن میں برتی جاتی ہیں۔

برہمن آباد کی فتح کے بعد جب محمد بن قاسم وہاں کا تمام انتظام کر چکا تو بہت سے مندروں کے پجاری ان کے پاس آئے اور کہا کہ ہندوؤں نے مسلمان سپاہیوں کے ڈر سے بتوں کی پوجا کے لیے مندروں میں آنا کم کر دیا ہے جس سے ہماری آمدنی میں فرق آگیا ہے۔ مندروں کی مرمت بھی نہیں ہوئی۔ لہٰذا ہمارے مندروں کی تعمیر، مرمت اور ہماری آمدنی کی تلافی آپ کو کرنی پڑے گی۔ محمد بن قاسم اس معاملہ میں اپنی رائے سے کوئی فیصلہ نہ کر سکے تو فوراً حجاج کے پاس ایلچی روانہ کیا اور برہمنوں کے مطالبہ کی تفصیل لکھ کر مشورہ طلب کیا۔ حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کو خط لکھا:

"تمہارے خط سے معلوم ہوا کہ برہمن آباد کے ہندو اپنے مندروں کی عمارت درست کرنا چاہتے ہیں، چونکہ انہوں نے اطاعت قبول کر لی ہے لہٰذا ان کو اپنے معبود کی عبادت میں آزادی حاصل ہونی چاہئے اور کسی قسم کا جبر کسی پر مناسب

۱ فتوح البند، صفحہ ۳۰۔

نہیں ہے۔" (آئینہ حقیقت نما، صفحہ ۱۰۶) [1]

اس فتح کے آنے کے بعد محمد بن قاسم نے برہمن آباد کے تمام اکابر و علماء کو بلایا اور برہمنوں کے حقوق و مراسم کی تحقیق کی۔ اور راجہ داہر کے زمانہ میں سلطنت کی طرف سے کیا کیا رعایتیں برہمنوں کو حاصل تھیں سب کو معلوم کیا۔ اس کے بعد شہر میں اعلان کرا دیا کہ:

"جو لوگ اپنے باپ دادا کی مراسم کے پابند ہیں ان کو ہر قسم کی آزادی ان مراسم کے بجا لانے میں حاصل ہے، کوئی شخص معترض نہ ہو سکے گا، برہمنوں کو دان، پُن، دکشنا بھینٹ جس طرح پہلے دیتے تھے اب بھی دیں۔ اپنے مندروں میں آزادانہ پوجا پاٹ کریں، محاصل ملکی یعنی سرکاری مال گزاری میں سے تین روپیہ فیصدی برہمنوں کے لیے الگ خزانہ میں جمع کیا جائے گا، اس روپیہ کو برہمن جس وقت چاہیں اپنے مندروں کی مرمت اور ضروری سامان کے لیے خزانہ سے برآمد کر سکتے ہیں۔"

محمد بن قاسم نے ایک مقام کو فتح کیا اور وہاں کے تمام حربی و غیر حربی لوگوں کو امان دے دی اور ہر قسم کا محصول و لگان بھی ان کو معاف کر دیا اور تمام کیفیت حجاج کو لکھ کر بھیج دی۔ حجاج نے اس کے جواب میں خط لکھا:

"جو لوگ اہل حرب ہیں ان کو قتل کرو، جو مطیع ہیں ان کو امان دو، صناع، تاجر پر کوئی محصول یا ٹیکس عائد نہ کرو۔ جو شخص زراعت میں زیادہ توجہ اور جانفشانی سے کام لیتا ہے اس کی مدد کرو اور اس کو فتاوی دو۔ جو لوگ اسلام سے مشرف ہوں ان سے زمین کی پیداوار کا عشر یعنی دسواں حصہ وصول کرو اور جو لوگ اپنے مذہب پر قائم رہیں ان سے وہی مال گزاری وصول کرو جو وہ اپنے راجاؤں کو دیا کرتے تھے۔"

(آئینہ حقیقت نما، صفحہ ۱۷۰) [2]

عربی اور شامی سرداروں اور سپاہیوں کو بھی کہیں کہیں جاگیریں اور قطعات زمین دیے گئے تھے

---

[1]، [2] فتوح البلد، صفحہ ۳۱۔

مگر وہ تمام زمین اور قطعات ان کے اصل مالکوں کے پاس بدستور رہے۔ جاگیرداروں کا حق صرف اتنا تھا کہ جو زر مال گزاری سرکاری خزانہ میں داخل ہوتا وہ ان جاگیرداروں کو مل جاتا تھا، مگر چند ہی روز کے بعد پرانے مالک خود جاگیردار بن گئے اور عرب سردار کہیں سے کہیں منتقل ہو گئے اور انہوں نے ان جاگیروں کی پرواہ نہیں کی۔

مسلمانوں نے اس بات کا حد سے زیادہ خیال رکھا کہ ہماری حکومت سے ملک سندھ کے کسی طبقہ کو اور کسی قوم کو بھی اذیت نہ پہنچے، اُنہوں نے پست لوگوں کو اُبھارا تو سہی لیکن بلند مرتبہ لوگوں کو پست کرنا نہیں چاہا۔ (آئینہ حقیقت نما، صفحہ ۱۰۹) [1]

محمد بن قاسم کی طرف سے جزیہ اور زمینوں کے خراج اور ان کی ملکیت بحال رہنے کا اعلان

اس کے بعد یہ اعلان کیا گیا کہ جو لوگ امراء کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہوں ان سے چودہ تولہ اور جو دوم درجہ کے خوشحال لوگ ہیں ان سے سات تولہ اور عوام سے پونے چار تولہ چاندی سالانہ بطور جزیہ وصول کی جائے گی۔ جو اسلام قبول کرے گا وہ اس جزیہ سے معاف کیا جائے گا اس سے اسلامی قانون کے موافق زکوۃ لی جائے گی۔ جو شخص اپنے باپ دادا کے مذہب پر چلے اس سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا، نہ ان کے مندروں اور عبادت خانوں میں کسی قسم کی مداخلت کی جائے گی، نہ زمینیں چھینی جائیں گی، نہ مکان و اموال کو کسی قسم کا نقصان پہنچایا جائے گا۔

مالکان اراضی بدستور اپنی اپنی زمینوں کے مالک رہیں گے اور زمینوں کی مال گزاری وغیرہ کا انتظام خود باشندگان سندھ کے ہاتھوں میں رہے گا، وغیرہ۔ (آئینہ حقیقت نما، صفحہ ۹۶) [2]

---

[1]، [2] فتوح البلد، صفحہ ۳۳۔

خط

اب ملاحظہ ہو خط جو حجاج بن یوسف نے ۲۰ رجب ۹۳ ہجری کو محمد بن قاسم کے نام تحریر کیا، جب کہ اس کے وارد و سندھ پر ایک مہینے سے چند روز اوپر ہوئے تھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حجاج بن یوسف کی طرف سے محمد بن قاسم کی جانب

ہماری یہ دلی تمنا اور روحانی خواہش ہے کہ تمھیں ہر حال میں کامیابی حاصل ہو اور انشاء اللہ ضرور حاصل ہوگی۔ تم کامران و فتح مند ہو گے اور اللہ عزّ و جل کے احسان سے دشمن دنیا کی سزا میں گرفتار ہوں گے اور عاقبت کے عذاب میں ہمیشہ مبتلا رہیں گے، تم اس وہم کا ہرگز شکار نہ ہونا کہ دشمن کے ہاتھی اور گھوڑے اور بے پناہ حربی سامان تمہارا راستہ روک سکیں گے، ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ دشمن تمہاری ہمت کے سامنے اللہ کی مدد سے مغلوب ہوگا۔ تمھیں اپنے حامیوں اور دوستوں کے ساتھ اچھی طرح رہنا چاہئے اور ہر ایک سے اس کے مقام و مرتبے کے مطابق عزت و احترام سے پیش آنا چاہئے۔ اس لیے کہ یہ ساری ولایت تمہاری ملکیت میں آئے گی۔ جس مفتوحہ قلعے سے لشکر کی ضروریات کی کوئی چیز میسر آئے، وہ لشکر پر خرچ اور جنگی تیاری میں صرف کرو، جہاں تک ممکن ہو، کھانے پینے کی ضروری چیزوں سے کسی کو مت روکو، اشیائے صرف کی ارزانی اور فراوانی کے لیے پوری کوشش کرو، تاکہ فوج میں غلہ سستا اور فراواں رہے، ویسے کے حاصل شدہ مال میں سے جو کچھ بچایا گیا ہے اسے قلعے میں ذخیرہ کر کے نہ رکھو، لوگوں میں تقسیم کر دو، ملک فتح کر لینے اور قلعوں پر قابض ہونے کے بعد رعایا کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا اور وہاں کے باشندوں کی دلجوئی کے لیے ساعی ہونا بہت ضروری ہے، یاد رکھو اگر کاشت کار، صنعت کار، دست کار اور تاجر آسودہ حال ہوں گے تو ملک سرسبز و آباد رہے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔
(چچ نامہ، صفحہ ۱۵۴، ۱۵۵)[1]

[1] بحوالہ برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش، مؤلفہ محمد اسحاق بھٹی، صفحہ ۱۸۰۔

خط

یہ اپنی نوعیت کا نہایت اہم خط ہے۔ اس میں محمد بن قاسم سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے عزم و ارادے میں استحکام پیدا کرے، معاملات جنگ میں عقل و تدبر کی قوتوں کو بروئے کار لائے، مخالف اسلام حکمرانوں کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرے، نیز اس خط میں حکمرانی کے اُصول واضح کیے گئے ہیں، سفارت کے آداب سکھائے گئے ہیں، پیغام رسانی کے لیے ہدایات دی گئی ہیں، اپنی بات پورے زور اور جذبے سے کہنے کی تلقین کی گئی ہے اور مملکت کے نازک اور اہم مناصب پر نہایت قابل اعتماد اور لائق ترین افراد کو متعین کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ خط کا ایک ایک لفظ لائق مطالعہ ہے۔ ترجمہ ملاحظہ ہو۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیارے بیٹے کریم الدین محمد بن قاسم! اللہ تعالیٰ تمہاری عزت برقرار رکھے۔

کئی قسم کے تکلفات اور طرح طرح کی تفصیلات سے آراستہ خط پہنچا اور جو حالات اس میں مرقوم تھے، معلوم ہوئے۔ اے بیٹے! آخر کیا بات ہے؟ تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ اپنی عقل و تدبر اور فہم و فراست سے کام نہیں لیتے؟ اے کاش — ! تم لڑائی کرتے کرتے مشرق کے تمام بادشاہوں کو مغلوب اور کافروں کے سب شہروں کو برباد کر ڈالو۔ تم اس مہم کو سر کرنے سے آخر کیوں عاجز ہو؟ اور دشمن کے شر کو ختم کر کے اب تک کیوں ان علاقوں پر مسلط نہیں ہو گئے؟ اللہ سے اُمید ہے کہ حریف کے منصوبے ناکام ہوں گے اور وہ عساکرِ اسلام کے مقابلے میں مدافعت کی جو تجویزیں مرتب کر رہے ہیں، اس میں ان کو ہرگز کامیابی نہ ہوگی۔

تم دل مضبوط اور ارادہ مستحکم کرو، اور جس قدر مال و دولت خرچ کر سکتے ہو، بے دریغ خرچ کرو، حریف کے مخالفوں کو قابو میں لاؤ اور ان پر بوقلموں عطایا و انعامات کی بارش کر دو، جو شخص جو جاگیر مانگے یا جو علاقہ طلب کرے، بلا تامل دے دو، کسی کو نا اُمید نہ کرو اور کسی کو خالی ہاتھ نہ لوٹاؤ، بلکہ یہ کرو کہ اس کی عرض قبول کر کے اسے امن کے پروانے اور اطاعت شعاری کے فرمان بھی لکھ دو، تاکہ یہ

اپنے قلب و ذہن کے نہاں خانے میں اطمینان وسکون محسوس کریں۔ حصول سلطنت کے چار طریقے ہیں، جو تمہیں یاد رکھنا چاہئیں۔

اوّل: سب سے صلح، عوام سے ہمدردی، احکام نہ ماننے والوں سے چشم پوشی اور رشتے داری کا لحاظ۔

دوم: رعایا پر بے پناہ دولت خرچ کرنا اور اُنہیں انعام واکرام سے نوازنا۔

سوم: دشمنوں کی مخالفت کو صحیح طور سے سمجھنا اور مخالفوں کے مزاج سے باخبر ہونا۔

چہارم: لوگوں کو مرعوب کرنا، ان پر ہیبت طاری کرنا، ہر معاملے میں دلیری کا ثبوت دینا، مشکلات پر طاقت سے قابو پانا اور احکام جاری کرنے کے لیے دبدبے کا مظاہرہ کرنا۔

دشمنوں کے شر سے محفوظ رہنے اور اُنہیں ہزیمت سے دوچار کرنے کے لیے ہر وقت کوشاں رہنا چاہئے، چھوٹے حکمران جو معروضات پیش کریں، انہیں مانو اور موثق اقرار ناموں سے اُنہیں مطمئن رکھو، جب وہ تمہاری خدمت میں حاضر ہو کر خراج ادا کرنے کا وعدہ کریں تو پھر جو نقدی یا سامان کی صورت میں خزانے میں پہنچائیں، اسے قبول کرو اور ان سب کو ذہنی اور قلبی اعتبار سے مطمئن رہنے کی تلقین کرو۔

کسی کو کہیں قاصد اور پیغام رساں بنا کر بھیجنا چاہو تو ضروری ہے کہ پہلے اس کی عقل، مذہب، معاملہ فہمی، دوراندیشی اور امانت پر تمہیں کامل اعتماد ہو۔ ایسا نہ ہو کہ اس کے کہیں جانے اور کوئی بات کہنے کی وجہ سے اسلام کو کوئی نقصان پہنچ جائے۔

اپنے آپ کو دشمنوں کے اچانک حملے، مکروفریب حیلے بہانے، نقصان رسانی کے طریقے اور ان کے دھوکے سے محفوظ رکھو، ضروری معاملات کی تکمیل میں دوراندیشی سے کام لو اور ہر وقت ہوشیار اور چوکس رہو، جس علاقے میں تم اس وقت بیٹھے ہو، وہاں داہر تمہارا سب سے بڑا دشمن ہے، وہ تمہیں کئی طریقوں سے نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا، تم اس کے ہر وار کو سمجھنے اور اس سے بچنے کی کوشش کرو۔

اپنا کوئی معتمد یا نمائندہ کسی کام کے لیے کہیں روانہ کرو تو اسے حکم دو کہ دشمن سے میل جول نہ

رکھے اور اس کی ہم نشینی اختیار نہ کرے، ایسا نہ ہو کہ اس کا ذہن بدل جائے اور مسلمانوں کے اجتماعی مقاصد کو نقصان پہنچ جائے۔ ایسے شخص کو وضاحت سے بتا دینا چاہئے کہ خیرخواہی کے کیا تقاضے ہیں اور اہلِ اسلام کا مفاد کن اُمور سے وابستہ ہے۔

جس شخص کو کوئی ضروری پیغام پہنچانے کے لیے راجا داہر یا کسی اور حکمران کے پاس بھیجو، اسے تاکید کرو کہ اس کے تمام امرائے مملکت اور روٴسائے دربار کی موجودگی میں بے دھڑک ہو کر پیغام دے، کسی سے کسی قسم کا خوف محسوس نہ کرے اور کسی سے مرعوب نہ ہو، پیغام کا جو وہ جواب دے، اُسے بھی اچھی طرح غور سے سنے، بات چیت میں کسی نوع کی نرمی اور چشم پوشی نہیں کرنی چاہئے، قاصدوں، پیغام رسانوں اور سفیروں کی ہمت دلکش وعدوں سے بڑھانی چاہئے اور ان کے ذہن میں یہ بات بٹھا دینی چاہئے کہ وہ پورے اسلامی لشکر کے لائق اعتماد نمائندے ہیں، سب کی اُمیدیں ان کی گفتگو سے وابستہ ہیں، اُنہیں چاہئے کہ پوری قوت بیان سے پیغام رسانی کا فریضہ انجام دیں، اور ان کا لہجہ زوردار اور موٴثر ہو۔

مسلمانوں کا قاصد اور پیغام رساں صاف زبان اور بے خوف آدمی ہونا چاہئے تاکہ پوری شان و شکوہ اور دھڑتے سے بات کر سکے اور کسی قسم کا لالچ اور حرص وطمع اس کے مافی الضمیر کے اظہار میں رکاوٹ نہ بن سکے۔ اس میں یہ خوبی ہونی چاہئے کہ جن لوگوں کے پاس جا رہا ہے، اُنہیں بہترین الفاظ میں توحید پر ایمان لانے کی دعوت دے اور بتائے کہ جو شخص اللہ کی وحدانیت کو تسلیم کرے گا، اس کے احکام کی اتباع کرے گا، اسے مال ودولت، جاگیریں اور زمینیں عطا کی جائیں گی۔

جو شخص اسلام کے سامنے سر جھکانے سے انکار کرے، اسے تنبیہ کی جائے کہ وہ فرمانبرداری کی راہ اختیار کرے، اگر پھر بھی اللہ اور رسول کی اطاعت سے گریزاں ہو اور سرکشی پر اُتر آئے تو اسے صاف لفظوں میں کہہ دیا جائے کہ اب تم جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ، ہم میں کون سچا اور کون جھوٹا ہے، اس کا فیصلہ اب میدانِ جنگ میں تلوار کے ذریعے ہوگا۔

میری بات یاد رکھو، راجا داہر کو دریائے سندھ پار کرنے کا موقع نہ دینا، اس سے صاف لفظوں میں کہو کہ اگر بھاگ کر جانا ہی چاہتے ہو تو ہم روکیں گے نہیں، لیکن ہم چونکہ اتنا لمبا سفر طے کر کے

یہاں آئے ہیں، اس لئے خود ہمیں دریا پار کرنا اور تمہارے مقابلے میں آنا چاہئے تاکہ معاملہ صاف ہو جائے اور دونوں فریقوں میں شک و ریب کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔

یہ بات بھی ذہن میں رکھو کہ دشمن کا مقابلہ کھلی جگہ اور کشادہ میدان میں کرو تاکہ پیدل پیدل کو اور سوار، سوار کو اچھی طرح دیکھ سکے اور کسی کو کسی کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہ رہے۔

جب جنگ شروع کرو تو اللہ کے فضل و کرم پر بھروسا کرو اور اس کے احکام و فرامین کی رسّی کو مضبوطی سے تھامے رکھو، جو تقدیر میں لکھا ہے اور جو پردۂ غیب سے نمودار ہونے والا ہے، اس کا علم صرف اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کو ہے۔ اللہ ہی کے دربار سے کسی فریق کی بادشاہت ختم ہونے کا حکم جاری ہوتا ہے۔ اور وہی کسی جماعت کو حکمرانی سے نوازتا ہے۔

اگر دشمن تم کو یہ پیغام بھیجیں اور تم سے کہیں کہ دریائے سندھ تم عبور کر کے ہمارے پاس آتے ہو یا ہم تمہارے پاس آئیں؟ تو انہیں دریا پار کر کے اپنے پاس آنے کا اختیار نہ دو، بلکہ کہو کہ ہم دریا پار کر کے آتے ہیں، تاکہ تمہارا رعب اور ہیبت دشمن کے دل میں بیٹھ جائے اور وہ یہ محسوس کریں کہ اگر اسلامی لشکر میں قوت اور طاقت نہ ہوتی تو یوں للکار کر یہ لوگ ہمارے سامنے نہ آتے۔

عرب کا اسلامی لشکر جو اس وقت تمہاری کمان میں ہے، مجھے یقین ہے کہ اس کا کوئی سپاہی بھی پیٹھ دکھا کر نہیں بھاگے گا اور کسی صورت میں بھی جنگ سے منہ نہیں موڑے گا، یہ فوجی جان کی بازی لگا دیں گے، یہ اللہ پر توکل کر کے جنگ کریں گے اور ہر موقعے پر ثابت قدم رہیں گے، ان کا دل لڑائی میں اور تیری اطاعت شعاری میں بالکل صاف ہے۔ ان کا اصل مقصد اللہ کی رضا مندی حاصل کرنا ہے۔

دریا عبور کرنے کے لیے ایسی جگہ کا انتخاب کرو جہاں مضبوطی کے ساتھ قدم جما سکو۔ اس وقت تم اپنے ملک سے باہر، دور دراز کے علاقے میں ہو، سیدھی سادی گزرگاہوں سے بھی اچھی طرح سوچ سمجھ کر اور دیکھ بھال کر گزرو، دور اندیشی سے کام لو اور معاملات سے باخبر رہو، یہ بہت بڑی دولت اور اللہ کی نعمت ہے، اس کو ضائع نہ ہونے دو۔

میری ایک اور بات کو آویزۂ گوش بناؤ، جہاں سے گزرو اور جس طرف سے جاؤ، لشکر کو ہوشیار اور

چوکس رکھو، اس کا میمنہ، میسرہ، قلب، مقدمہ اور ساقہ سیدھا رکھو۔ پیادوں اور اکیلوں کو پہلے بھیجو اور کچھ لوگوں کو درمیان میں رکھو۔

حجاج کے اس خط نے محمد بن قاسم کو نہایت متاثر کیا اور آگے کو قدم زن ہونے کے لیے اس کے حوصلے بہت بڑھ گئے۔[1]

خط

ایک اور خط پڑھیے جو بہترین الفاظ کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس میں حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کے نام جو کچھ تحریر کیا ہے، وہ درج ذیل ہے:

بعد تسلیمات کے واضح ہو کہ تم نے دریائے مہرانؔ پار کرنے اور راجا داہر سے جنگ کرنے کے بارے میں تحریر کیا ہے۔ بے شک تائیدِ الٰہی سے مجھے اُمیدِ واثق ہے کہ تم فتح مند اور کامیاب ہو گے اور تمہارا دشمن داہر ذلیل ہوگا، مجھے اللہ پر کامل بھروسا ہے کہ جب دشمن تمہارے مقابلے میں آئیں گے تو آسمان کی گردش سے تمہیں کوئی بھی نقصان نہیں پہنچے گا، کیونکہ نمازوں کے پانچوں وقت اور خلوت و جلوت کا ایسا کوئی بھی لمحہ نہیں گزرتا کہ جس میں یہ غائبانہ دُعا نہ کیجاتی ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں کافروں پر فتح نصیب کرے اور وہ تمہارے مقابلے میں ذلیل و خوار ہوں۔ ازل میں جو حکم مقدر ہو چکا ہے، پردۂ مراد سے وہی ظہور پذیر ہوتا ہے اور اللہ کے نزدیک جو بات مناسب اور موزوں ہو، وہی عملی شکل میں سامنے آتی ہے۔

میں بارگاہِ خداوندی میں عجز اور فغاں کے ساتھ ہمیشہ عرض کناں رہتا ہوں کہ اے خداوندا! تو ایسا بادشاہ ہے کہ کوئی بھی تیرا ہمسر نہیں، تو لشکرِ اسلام کو اس کی حیثیت سے زیادہ قوت عطا فرما اور کامیابی سے ہمکنار کر۔

اللہ تعالیٰ کے فضلِ بے پایاں اور کرمِ لاانتہا سے اُمید ہے کہ تم اپنا مقصد حاصل کر کے ہم سے آملو گے۔

---

[1] بحوالہ برصغیر میں اسلام کے اوّلین نقوش، صفحہ ١٨٥۔

Scanned by CamScanner

میں تمہیں تاکید کرتا ہوں کہ جس طرح بھی ممکن ہو، دریا پار کرو اور تائید الٰہی کے لیے ہر وقت دست بدعا رہو۔ اس کی رحمت کو اپنے لیے ذریعۂ پناہ سمجھتے رہو تاکہ وہ تمہیں ان لوگوں کے شر سے محفوظ و مامون رکھے جو اپنی عقلوں پر فخر کرتے اور اپنی تدبیروں کو حرفِ آخر قرار دیتے ہیں۔

دشمن کے مقابلے میں اُترتے وقت رضائے الٰہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بناؤ اور ساتھ ہی پوری ہمت اور شجاعت کا مظاہرہ کرو۔ یاد رکھو فتح و کامرانی اور تائید الٰہی تمہارے ہم عنان اور نصرتِ خداوندی تمہارے شاملِ حال ہے۔ فرشتوں کی مدد اور مسلمانوں کی تلوار تمہاری طرف سے تمہارے حریفوں پر مسلط ہے۔ ان ذلیل لوگوں کو اللہ تعالیٰ مسلمانوں اور فرشتوں کی تلواروں اور نیزوں کی خوراک بنائے گا۔

غضبِ الٰہی کا دروازہ ان کے لئے کھلا ہوا ہے اور یہ پورے انتقام اور عبرت ناک انجام کے سزاوار ہیں۔

تم دریائے مہران عبور کرنے لگو تو گھاٹ کے کنارے کو اچھی طرح دیکھ لو اور دریا پار کرنے کا پورا انتظام رکھو، پہلے ملکِ سندھ کے ان باشندوں کو جو کشتیوں پر متعین ہوں، پختہ وعدہ لے کر اپنے اطاعت گزار اور مخلص ترین فرماں بردار بناؤ، ان کے دل و زبان کے اخلاص کو اچھی طرح جانچ پرکھ لو، پھر دریا پار کرو۔

پانی چونکہ تمہاری پشت پر ہوگا، اس لیے اس طرف سے تمہیں دشمن کا کوئی خطرہ نہ ہوگا اور تمہیں کوئی تکلیف نہ پہنچا سکے گا۔ اس کے بعد جب تم ان کے گاؤں اور شہروں اور قلعوں میں داخل ہو گے تو کوئی بھی تم سے مقابلہ اور جنگ نہ کر سکے گا۔ ان میں یہ جرأت نہ ہوگی کہ تمہارے مقابلے میں آ کر اپنی جانوں کو ہلاکت میں ڈالیں۔ وہ جس قلعے کو اپنی پناہ گاہ اور حفاظت کا ذریعہ بنائیں گے، اس پر جب تمہاری نظر پڑے گی، اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید سے اس کے دروازے تمہارے لیے کھل جائیں گے، اور ان کے دلوں پر تمہاری تلواروں کی ایسی ہیبت اور دہشت چھا جائے گی کہ کوئی ہتھیار اُن کے کام نہ آئے گا۔ یہی ہیبت اور دہشت تمہاری کامیابی کا باعث بنے گی۔

جب وہ بھاگیں تو فوراً ان کے سامان اور خزانے پر قبضہ کرلو، لیکن اپنے آپ کو ان کے دھوکے

اور فریب سے بچائے رکھو۔ اس کے بعد ان میں سے ہر شخص کو اسلام کی دعوت دو۔ جو شرفِ اسلام سے بہرہ ور ہو جائے، اس کی بہترین تربیت کرو، مطلب یہ کہ کوئی دشمنِ دین وہاں باقی نہ رہے۔ ان کا خون تمہاری تلواروں کے لیے مباح ہے۔

یہ دُعا جو میرا وظیفہ اور معمول ہے ہر وقت پڑھتے رہو۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُكَ ذَالِكَ بِاَنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ الْحَیُّ الْقَيُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ط لَكَ مَا فِی السَّمٰوَاتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ – مَنْ ذَا الَّذِیْ يَشْفَعُ عِنْدَكَ اِلَّا بِاِذْنِكَ – تَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا – وَلَا يُحِيْطُ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِكَ اِلَّا بِمَا شِئْتَ – وَسِعَ كُرْسِيُّكَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضَ – وَلَا يَئُوْدُكَ حِفْظُهُمَا وَاَنْتَ الْعَلِیُّ الْعَظِيْمُ – وَبِاَنَّكَ اَنْتَ الْاَحَدُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ – بِوَجْهِكَ الْكَرِيْمِ رَبِّ الْوُجُوْهِ وَخَالِقِ الْوُجُوْهِ وَقَاهِرِ الْوُجُوْهِ وَالْقَادِرِ عَلَى الْوُجُوْهِ لَكَ الْخَيْرُ وَالْكَرَمُ وَالْكَلِمَاتُ التَّامَّاتُ – فَارْزُقْنَا مَعَ ذَالِكَ شُكْرًا لِّنِعْمَتِكَ وَمَعْرِفَةً لِّحَقِّكَ وَعَمَلًا بِرِضْوَانِكَ ط

والسلام علیك ورحمة الله وبركاته

ترجمہ: اے ہمارے اللہ! ہم تیری بارگاہ میں کاسۂ سوال لیے کھڑے ہیں، اس لیے کہ تو ہمیشہ زندہ اور قائم رہنے والا ہے، جس پر نہ کوئی اونگھ طاری ہوتی ہے اور نہ اسے نیند آتی ہے، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے، وہ سب تیری عطا ہے، ایسا کون ہے جو تیری اجازت کے بغیر تیرے پاس کسی کی سفارش کرے؟ جو بھی ہمارے آگے یا پیچھے ہے، اس کی تفصیل اور ماہیت کو تو ہی جانتا ہے اور تیری مشیت کے بغیر ہم تیرے علم میں سے کسی بھی چیز کو سمجھ نہیں سکتے، تیری حکمرانی آسمانوں اور زمین میں پھیلی ہوئی ہے اور اس کی حفاظت و نگرانی

Scanned by CamScanner

تیرے لیے ہرگز کسی قسم کی تکلیف کا باعث نہیں، تو غالب اور عظیم ہے۔ ہم اس لیے بھی تیرے حضور دست سوال دراز کرتے ہیں کہ تو واحد اور بے نیاز ہے، جس نے نہ کسی کو جنا ہے اور نہ کسی سے پیدا ہوا ہے اور نہ کوئی اس کے برابر کا درجہ رکھتا ہے۔ ہم اس لیے بھی تیری بارگاہ میں ہاتھ پھیلاتے ہیں کہ تو ہی سب کا پروردگار اور سب پر غالب ہے، سب کا خالق اور سب پر قادر ہے، خیر و کرم کے لاتعداد خزانے تیرے ہی قبضے میں ہیں، مکمل و اکمل کلے تیری ہی ذات اعلیٰ وارفع کے ہیں۔ ان کی وجہ سے ہمیں اپنی نعمت کا شکر ادا کرنے، معرفتِ حق سے بہرہ ور ہونے اور اپنی رضا کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرما۔ [1]

خط

اب ایک اور خط ملاحظہ فرمایئے، جو حجاج بن یوسف نے محمد بن قاسم کے نام اُس کے ایک خط کے جواب میں تحریر کیا:

پیارے فرزند عماد الدین محمد بن قاسم —!

تم نے جو کچھ لکھا ہے، وہ معلوم ہوا، تم نے دشمنوں کا جو طریقہ بیان کیا ہے، اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں، یہ سراسر مکر و فریب ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی توفیق سے حالات تمہاری کامیابی کا پتا دیتے ہیں۔ اللہ کی بارگاہ میں پانچ وقت کی نماز ادا کرنا تمام ضروری کاموں پر مقدم قرار دو۔ تکبیر، قیام، قرأت، رکوع، سجود اور قعود کے وقت عجز و عاجزی کے ساتھ اللہ سے مدد طلب کرو اور زبان کو ذکرِ الٰہی سے تر رکھو تا کہ تمہارے سب کام باقاعدہ اور بالترتیب رہیں۔ یاد رکھو، اللہ کی عنایت اور کرم کے سوا کوئی شخص طاقت اور دبدبہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر تم بادشاہوں کے بادشاہ اللہ عزوجل کے فضل و کرم پر کامل بھروسا کرو گے اور اسی کو مرکزِ عقیدہ و یقین قرار دو گے تو تمہاری سب تمنائیں پوری ہوں گی اور فتح و نصرت تمہارا مقدر ٹھہرے گی، انشاء اللہ تعالیٰ۔ [2]

---

[1] [2] بحوالہ برصغیر میں اسلام کے اوّلین نقوش، صفحہ ۱۸۵۔

خط

جب پورا سندھ فتح ہو چکا اور ہندوستان کے کئی علاقے مسلمانوں کے تسلط میں آ گئے تو محمد بن قاسم نے وہاں کے غیر مسلموں پر جزیہ مقرر کیا اور اس کی وصولی کے لیے انہیں میں سے بعض لوگوں کا تقرر عمل میں لایا گیا۔ اس سے ان کو یہ یقین دلانا تھا کہ اسلامی حکومت کے نزدیک غیر مسلم رعایا کو خاص احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اس کا مقام و مرتبہ بڑا اونچا ہے۔

کاشت کاروں، تجارت پیشہ لوگوں، صنعت کاروں اور مزارعوں کی ایک فہرست بنائی گئی اور انہیں معززین ملک میں گردانا گیا۔ برہموں نے بھی درخواست کی کہ وہ بھی خاندانی اعتبار سے ملک کے عوام و خواص میں اپنا اثر و رسوخ رکھتے ہیں اور انہیں ہمیشہ لائقِ تکریم قرار دیا گیا ہے۔ اس درخواست کی بہت سے سرکردہ مقامی لوگوں نے تصدیق کی۔ اس کے بعد برہموں کو بھی بڑا اعزاز حاصل ہوا اور مختلف علاقوں میں اُنہیں اہم خدمات کی انجام دہی پر مامور کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ حکومت میں باقاعدہ حصے دار کی حیثیت سے کام کرنے لگے اور اسلامی مملکت میں ان کا وقار بلند ہوا۔

اس کے بعد برہموں کا ایک نمائندہ وفد محمد بن قاسم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض گزار ہوا کہ لوگوں کے غم و شادی کے موقعے پر ان کو خیرات دی جاتی اور نذرانے پیش کیے جاتے تھے، اب وہ ختم ہو چکے ہیں، نیز بت خانوں میں بتوں کے نام پر جو نذریں دی جاتی تھیں، اس کا خاص حصہ ان کے تصرف میں آتا تھا۔ بتوں کی پوجا کے لیے دور و نزدیک سے جو لوگ آتے تھے، وہ بھی ان کی مالی مدد کرتے تھے، اب یہ سارا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ علاقے کے لوگوں نے بھی برہموں کی تصدیق کی۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ بت خانوں میں پہلے کی طرح ان کا اثر و رسوخ قائم رہے اور ان کے مندروں کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔

محمد بن قاسم نے یہ صورت حال حجاج بن یوسف کو لکھی تو اس نے برہموں کے مطالبے کو صحیح قرار دیا اور ان کی منشا کے مطابق اس پر عمل کرنے کی تاکید کی۔ حجاج بن یوسف کے خط کا ترجمہ یہ ہے:

تمہارا خط ملا۔ جو حالات تم نے تحریر کیے ہیں، وہ میرے علم میں آئے، جن میں سے ایک بات یہ ہے کہ برہمن آباد کے سرکردہ لوگ بدستور سابق بت خانے کی آبادی

Scanned by CamScanner

اور اپنے مذہب کے مطابق عمل کرنے کے لیے عرض گزار ہیں۔ جس طریقے سے انہوں نے ہماری فرمانبرداری کے دائرے میں داخل ہو کر دارالخلافہ کو جزیہ دینا منظور کیا ہے، وہ قابل تعریف ہے، جزیے کی وصولی کے علاوہ ہمارا ان پر کوئی حق اور تصرف نہیں۔ جب وہ ذمّی ہو چکے تو ان کے مال اور خون پر ہم ہرگز دست درازی نہیں کر سکتے، بلکہ ان کی حفاظت کرنا ہم پر فرض ہو گیا ہے۔ انہیں اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرنے کی اجازت حاصل ہو گئی ہے، تم ان میں سے کسی کو اس کے عقیدے اور طریقے کے مطابق عبادت کرنے سے مت روکو، انہیں اختیار حاصل ہے کہ اپنے عبادت خانوں میں، اپنے گھروں میں اور گھروں کے باہر، ہر جگہ اپنے مذہب پر بلا روک ٹوک عمل کریں اور اس کے مطابق زندگی بسر کریں۔[1]

حجاج بن یوسف کا یہ خط جب محمد بن قاسم کو پہنچا تو اس نے ان لوگوں کو وہی مرتبہ عطا کیا جو اسلام میں یہود و نصاریٰ کا بیان کیا گیا ہے۔

فتوح الہند

ہندوستان کے سب سے پہلے فاتح محمد بن قاسم صرف ساڑھے تین سال اس نواح میں رہے، اسی قلیل عرصہ میں انہوں نے پورا ملک سندھ اور پنجاب وغیرہ کے بہت سے حصص فتح بھی کیے اور اسلامی و شرعی نظام کے ماتحت ایک نہایت مستحکم اور قابل تقلید سلطنت بھی قائم کر دی۔ ۹۳ھ ہجری میں وہ اس طرف آئے اور ۹۵ھ ہجری میں فتح سندھ کی تکمیل ہوئی۔ فتح سندھ کے بعد نظامِ خلافت میں ایک گونہ اختلال ہو جانے کے سبب محمد بن قاسم کو مزید پیش قدمی سے روک دیا گیا اور سلطنت سندھ کے استحکام اور اس میں نظامِ شرعی کی ترویج پر ان کی تمام تر توجہ منعطف کر دی گئی۔ اس کے بعد ہندوستان پر مختلف دور آئے لیکن مسلمانوں نے تین سو برس تک پھر ہندوستان پر کوئی حملہ نہیں کیا۔ تقریباً تین سو برس اسی حال پر گزر گئے۔ چوتھی صدی ہجری کے وسط میں سندھ کا نظامِ حکومت بالکل

[1] بحوالہ برصغیر میں اسلام کے اوّلین نقوش۔

مختل ہو گیا۔ کچھ ہندو راجاؤں نے قبضہ کر لیا اور کچھ قرامطہ نے تسلط جما لیا۔ ملتان کا تخت قرامطہ کے قبضہ میں چلا گیا۔ پنجاب کے راجہ قرامطہ کو ہر طرح کی امداد دے رہے تھے۔[1]

ایک اہم واقعہ

ایک سپاہی تھا فوج کا جس کا نام تھا سبکتگین، گھر میں بہت تنگی تھی، اس کے پاس ایک گھوڑا تھا، جس پر کبھی کبھی سوار ہو کر یہ شکار کھیلنے چلا جاتا تھا، شکار مل جاتا تو گھر میں کچھ کھانا پینا ہو جاتا نہ ملتا تو گھر میں فاقہ ہوتا۔ ایک مرتبہ یہ شکار کی نیت سے جا رہا تھا کہ اس نے ایک ہرنی کو دیکھا جس کے ساتھ چھوٹا سا بچہ تھا، اس نے اپنا گھوڑا اس کے پیچھے جو بھگایا تو ہرنی تو بھاگ گئی مگر چھوٹا بچہ نہ بھاگ سکا، تو اس نے اس بچے کو پکڑ لیا، جب ماں نے دیکھا کہ میرے بچے کو اس آدمی نے پکڑ لیا تو بھاگتی ہوئی ہرنی پھر واپس آ گئی اور اس نے اس کے قریب آ کر اپنی بے قراری کا اظہار کرنا شروع کر دیا، آسمان کی طرف منہ اُٹھاتی تھی اور درد بھری آواز نکالتی تھی، یہ رحم دل انسان تھا یہ سمجھ گیا یہ ماں ہے، بے قرار ہے، میرا بیٹا اس شکاری کے ہاتھ میں چلا گیا، چنانچہ اس نے اس کی اس بے قراری کو دیکھتے ہوئے اس کے بچے کو چھوڑ دیا، وہ ماں اپنے بچے کو لے کر چلی گئی۔ واپس آیا رات کو سویا تو خواب میں اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار نصیب ہوا۔ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تو نے ایک ماں کی بے قراری کو دیکھ کر اس پر رحم کھایا، یہ تیرا عمل اللہ کو اتنا پسند آیا کہ اللہ تعالیٰ تجھے دنیا کا تاج عطا فرمائیں گے اور تو نے اس کا بیٹا واپس کیا اس کے بدلے اللہ تعالیٰ تجھے بھی بیٹا عطا فرمائیں گے، چنانچہ اس کے یہاں بیٹا ہوا، جس کا نام سلطان محمود غزنوی رکھا گیا جو پورے ہندوستان کا فاتح بنا اور اللہ رب العزت نے اس غریب بندے کو ایک بادشاہ کا باپ بننے کی توفیق عطا فرمائی۔[2]

۳۶۷ھ ہجری میں سلطان ناصر الدین سبکتگین تخت غزنی کے حاکم و امیر مقرر ہوئے تو انہوں نے سب سے پہلے قرامطہ کے استیصال پر اپنی پوری قوت خرچ کی، سلطان کو اس طرف مشغول دیکھ کر

[1] فتوح الہند، صفحہ ۳۴۔

[2] سکون خانہ، از افادات مولانا ذوالفقار نقشبندی، صفحہ ۱۵۹۔

راجہ جے پال نے غزنی پر ایک بڑے لشکر کے ساتھ حملہ کر دیا، مگر جب سلطانی افواج مقابلہ پر آئی تو جے پال نے محسوس کر لیا کہ ہم گرفتار ہو جائیں گے فوراً امیر ناصر الدین سبکتگین کی خدمت میں درخواست معافی و امان پیش کی اور وعدہ کیا کہ لاہور واپس ہو کر بہت سا چاندی سونا بطور جرمانہ کے آپ کے پاس بھیجوں گا۔ سلطان نے باوجود مخالفت بعض امراء دولت کے اس کی درخواست کو منظور کر لیا۔ مگر جے پال نے دریائے سندھ کو عبور کرتے ہی عہد شکنی کی اور پھر تمام ہندوستانی راجاؤں کے پاس ایلچی بھیج کر ان کو غزنی سلطنت کے مقابلہ پر آمادہ کیا۔ ان سب راجاؤں کے تعاون و اشتراک سے تین لاکھ لشکر جرار اور بہت سے ہاتھی لے کر جے پال نے دوبارہ سلطنت غزنی پر حملہ کیا۔ مقام لمغان پر جس کو اب جلال آباد کہا جاتا ہے، یہ معرکہ ہوا۔ اس معرکہ میں جے پال اور اس کے ساتھی شکست کھا کر بھاگے اور اب ہندوستان آکر پورے ہندوستان کی طاقتوں اور ہندو عوام کو ملا کر سلطنت غزنی کو ختم کر دینے کا منصوبہ گانٹھا۔ اسی عرصہ یعنی ۳۸۷ھ ہجری میں امیر ناصر الدین سبکتگین بلخ کے قریب فوت ہو گئے اور تخت غزنی پر اول ان کے چھوٹے بیٹے اسمٰعیل اور پھر تقریباً چھ ماہ بعد بڑے بیٹے سلطان محمود غزنوی تخت نشین ہوئے۔[1]

۱ فتوح الہند، صفحہ ۲۶۔

اسلامی ہند کے معمار

پہلی صدی ہجری ہی میں اسلام کے حوصلہ مند دستے ہندوستان میں آنے شروع ہو گئے تھے اور ۹۳ھ میں محمد بن قاسم ثقفی نے سندھ سے ملتان تک کے علاقے کو اپنی شمشیر و اخلاق سے مسخر کر لیا تھا اور اس برصغیر (ہند) میں جا بجا اسلام کے مرکز اور خانقاہیں چھوٹے چھوٹے جزیروں کی طرح قائم ہو چکی تھیں، لیکن حقیقتاً ہندوستان کی فتح کا سہرا اسکندر اسلام سلطان محمود غزنوی کے سر ہے۔ مستحکم اور مستقل اسلامی سلطنت کے قیام کی سعادت شہاب الدین محمد غوری کے حصے میں تھی۔ آخری طور پر اس کی روحانی تسخیر اور اخلاقی و ایمانی فتح حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے لئے مقدر ہو چکی تھی۔

سلطان محمود غزنوی

محمود غزنوی اپنے والد سبکتگین کی وفات کے بعد غزنی[1] کا حاکم ہوا۔ سلطان محمود بچپن ہی سے جری اور بہادر تھا۔ اپنے والد کے ساتھ جنگوں میں شرکت کرتا اور دوسرے علاقے فتح کرنے کی تمنائیں رکھتا تھا۔ لہذا محمود نے اپنے آپ سے یہ عہد کیا تھا کہ وہ سلطنت کی مہمات سے فارغ ہو کر ہندوستان پر حملہ کرے گا اور کفار سے جہاد کرے گا، چنانچہ اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وہ شوال [illegible] مطابق ۱۰۰۰ء میں دس ہزار فوجیوں کے ساتھ غزنی سے پشاور آیا۔ راجہ جے پال بھی ایک زبردست لشکر کے ساتھ محمود کے مقابلہ پر نکلا۔ دونوں حکمرانوں کے لشکر آپس میں معرکہ آرا ہوئے۔ فریقین نے بڑی مردانگی اور دلیری سے ایک دوسرے پر حملہ کیا، لیکن فتح سلطان محمود ہی کو ہوئی۔ اس طرح وہ اسلامی فاتح ہونے کی وجہ سے محمود غازی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس معرکہ میں بہت سامان و اسباب بطور غنیمت محمود کے ہاتھ لگا اور اس کے بعد غزنی واپس لوٹا۔

اس کے بعد وہ دو سال کے وقفہ سے ہندوستان پر حملہ آور ہوتا۔ اس کا مقصد مذہب اسلام کی اشاعت کا مقدس فریضہ تھا۔ اس فتح کے نتیجہ میں کفر ذلیل ہوتا اور اسلام فروغ پاتا تھا، اور مال غنیمت بھی بہت ہاتھ آتا تھا، جن شہروں کو فتح کیا ان شہروں میں سے بہت مال غنیمت ہاتھ لگا جس سے کافی مقدار

۱ غزنی محمود کا دارالسلطنت تھا جو اس وقت افغانستان میں واقع ہے۔

میں رقم جمع ہوگئی تو اپنے دارالسلطنت غزنی میں ایک عالی شان مسجد تعمیر کرنے کا پلان تیار کیا اور یوں گویا ہوا

میری زندگی کا مقصد تیرے دیں کی سرفرازی
میں اسی لئے مسلماں اسی لئے نمازی

عروس فلک مسجد کی تعمیر

محمود کا سفر چونکہ بڑا کامیاب رہا تھا اور اس سے متعدد فتوحات حاصل ہوئی تھیں، اس لئے اس نے حکم دیا کہ اس نعمت خداوندی کے شکریہ کے طور پر غزنی میں ایک جامع مسجد تعمیر کی جائے۔ اس کی عمارت کو سنگ مرمر سے بنایا جائے اور دیگر بیش قیمت و گراں قدر پتھر مربع، مسدس، مثمن اور مدور ہر صورت کے تراش کر اس عمارت میں نصب کئے جائیں تا کہ دیکھنے والے عمارت کی خوبصورتی اور متانت سے متاثر ہوں اور عمارت بنوانے والے کی ہمت عالی کی داد دیں، جب یہ مسجد تیار ہوگئی تو سلطان محمود نے اس کو بڑے سلیقے سے آراستہ کیا، خوبصورت قندیلوں سے اسے بقعۂ نور بنا دیا، روشنی کی کثرت اور آرائش کی خوبی کی وجہ سے لوگ اس مسجد کو "عروس فلک" کہنے لگے، اس مسجد کے ساتھ ہی سلطان محمود نے ایک عالی شان مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور مدرسہ کے کتب خانہ میں نایاب اور اعلیٰ کتب جمع کیں، مسجد اور مدرسہ کے اخراجات کے لئے بہت سے دیہات وقف کر لئے گئے، تا کہ طلبہ، مدرسین اور دیگر عملے کی ضروریات پوری ہوسکیں، محمود کا مسجد اور مدرسہ کو تعمیر کروانا امیروں اور ارکان سلطنت کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوا اور انہوں نے اپنے بادشاہ کی تقلید کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مختصر سے عرصے میں غزنی میں بے شمار مسجدیں، مدرسگاہیں، سرائیں اور خانقاہیں تعمیر ہوگئیں۔

محمود غزنوی کے لئے طالبِ علم کی دعار کی برکت

سلطان محمود غزنوی کے دل میں تین باتیں کھٹکتی تھیں ایک یہ کہ میں سبکتگین کا بیٹا ہوں اور سبکتگین تو پہلے بادشاہ نہیں تھا، بلکہ ایک فوجی تھا پھر بادشاہ بنا، کیا میرا نسب صحیح ہے یا کچھ اور ہے؟ دوسری بات یہ دل میں کھٹکتی تھی کہ دین کے مختلف شعبے ہیں، لیکن سب سے افضل اور بہتر شعبہ کونسا ہے؟ یعنی امت میں سب سے اعلیٰ لوگ کون ہیں؟ اور تیسری بات یہ کھٹکتی تھی کہ مجھے بڑے عرصے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی

زیارت نصیب نہیں ہوئی، اس لئے مجھے زیارت نصیب ہو جائے، ایک مرتبہ وہ گلی میں گشت کر رہے تھے، انہوں نے باہر آ کر ایک طالب علم کو کسی روشنی میں پڑھتے ہوئے دیکھا، انہوں نے پوچھا کہ تم مسجد میں کیوں نہیں پڑھتے؟ اس نے کہا کہ مسجدوں کے اندر روشنی کا انتظام نہیں ہے، یہ ایک بندے کے گھر کے باہر آنے والی روشنی ہے اس لئے میں یہاں بیٹھ کر مطالعہ کر رہا ہوں، انہوں نے کہا بچے! تم جاؤ اور میں آج کے بعد تمہارے لئے روشنی کا انتظام کر دوں گا، جب طالب علم نے روشنی دیکھی تو اس نے دعار کی کہ اے اللہ! اس بندے کی مرادیں پوری کر دے، چنانچہ جب سلطان محمود غزنوی گھر آئے تو ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اے سبکتگین کے بیٹے! تو نے میرے وارث کی عزت کی، اللہ تعالیٰ تجھے دنیا و آخرت میں عزتیں عطا فرمائے" سبحان اللہ! اس طالب علم کی دعار کی برکت سے سلطان محمود غزنوی کی تینوں مرادیں پوری ہوگئیں، ایک تو انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوگئی، دوسری بات جو ان کے دل میں اپنے نسب کے بارے میں الجھن کی تھی وہ ختم ہوگئی، تیسری بات یہ کہ ان کو پتہ چل گیا کہ علمار کرام ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث ہیں اور یہی لوگ دوسروں سے افضل ہیں۔ (خطبات ذوالفقار دہم ص ۸۲)

فتح نامۂ محمود خلیفۂ بغداد کی خدمت میں

سلطان محمود نے ۴۱۰ھ میں ایک "فتح نامہ" جس میں اس کی تمام ہندوستانی فتوحات کی تفصیل درج تھی۔ خلیفہ[1] بغداد کی خدمت میں ارسال کیا، جب یہ فتح نامہ خلیفہ کو ملا تو اس نے اسی وقت ایک بڑی محفل اس غرض سے منعقد کی کہ یہ فتح نامہ خدا کے بندوں کو بر سر منبر پڑھ کر سنایا جائے، لوگوں نے جب اس فتح نامہ کو سنا تو بے اختیار خداوند تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور کفر و ظلمت کی تباہی و تاراجی پر مسرت کا اظہار کیا، نیز سلطان محمود کی جرأت و ہمت پر آفریں کی اور خدا سے دعا کی کہ آئندہ بھی اس کو فتح و کامرانی نصیب ہو، مؤرخین ذکر کرتے ہیں کہ جس روز یہ محفل منعقد ہوئی اس دن بغداد کا ہر فرد انتہائی خوش تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج کا دن بھی گویا عید کا دن ہے، تمام لوگوں پر یہ حقیقت واضح ہوگئی تھی کہ عرب، عجم، روم اور شام میں جو کارنامے صحابۂ کرام نے سر انجام دئے وہی بعینہٖ ہندوستان میں سلطان محمود کی ذات سے ظہور میں آئے، جن کی وجہ سے محمود نے دین و دنیا کی سعادت حاصل کی[2]۔

[1] خلیفۂ وقت کا پوری دنیا کے مسلمان احترام کرتے تھے، اور خطبہ میں پہلے اس کا نام اور پھر اپنے ملک کے فرماں رواں کا نام پڑھا کرتے تھے۔ [2] تاریخ فرشتہ اول ص ۱۳۳

بدویوں کی سرزنش

۴۱۲ھ مطابق ۱۰۲۱ء کا واقعہ ہے کہ علماء اور زاہدوں کے ایک گروہ نے سلطان محمود کی خدمت میں گزارش کی کہ ''آپ ہر سال ہندوستان جا کر تو کفار سے معرکہ آرائی کرتے ہیں اور وہاں مذہب اسلام کی ترویج و اشاعت کا مقدس فریضہ انجام دیتے ہیں، لیکن آپ نے اب تک بیت اللہ کے راستہ پر نظر نہیں کی، ایک مدت سے کعبے کا راستہ بدویوں اور قرمطیوں کی راہ زنی کی وجہ سے بند پڑا ہوا ہے اور لوٹ مار کی وجہ سے مسلمان حج کے ثواب سے محروم ہیں، ظاہر ہے کہ خلافت عباسی میں اب اتنی قوت نہیں رہی کہ وہ اس مقدس راستہ کو ان راہ زنوں سے پاک و صاف کرے، لہٰذا یہ ضروری ہے کہ آپ ہی اس سلسلہ میں کوئی اقدام فرمائیں۔

سلطان محمود نے اس التجا کو قبول کیا اور اپنی سلطنت کے قاضی القضاۃ ابو محمد ناصحی کو حاجیوں کے ایک قافلہ کا امیر مقرر کیا اور بدویوں کو لوٹ مار سے باز رکھنے کے لئے تیس ہزار اشرفیاں ابو محمد ناصحی کے سپرد کیں، اور قافلہ کو مکہ مکرمہ کی جانب روانہ کیا۔ کچھ دنوں کے بعد یہ قافلہ مختلف منزلیں طے کرتا ہوا ایک جنگل میں پہنچا جہاں بدو لوٹ مار کرتے تھے، بدویوں نے حسب معمول اس قافلہ کو لوٹنا چاہا تو ان کا تیروں سے مقابلہ کیا گیا جس کے نتیجہ میں بداویوں کا سردار زخمی ہو گیا، بدوی اپنے سردار کو لے کر بھاگ گئے، اس مہم سے کچھ مدت کے لئے حاجیوں کو راحت ملی اور راستہ پر امن ہو گیا۔

فتحِ سومنات

۴۱۵ھ مطابق ۱۰۲۴ء میں محمود کو اس کے چند قابل اعتبار لوگوں نے بتایا کہ ہندوستان والوں کا یہ عقیدہ ہے کہ (موت کے بعد) انسان کی روح بدن سے جدا ہو کر سومنات کی خدمت میں حاضر ہوتی ہے اور سومنات ہر روح کو اس کے اعمال و کردار کے مطابق (از روئے تناسخ) نیا جسم عطا کرتا ہے اور ہندوؤں کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ دریا کا اتار، چڑھاؤ اصل میں سومنات کی عبادت ہے، جو اس صورت میں ظاہر ہوتی ہے محمود کو یہ بھی بتایا گیا کہ ہندوؤں کے خیال میں وہ بت جنہیں محمود نے دوسرے علاقوں میں

۱؎ تاریخ فرشتہ اول ص ۱۴۳

پاش پاش کیا ایسے بت تھے جن سے سومنات ناراض تھا، اسی لئے اس نے ان بتوں کی طرف داری نہیں کی، ورنہ اس میں اس قدر قوت ہے کہ وہ جسے چاہے ایک لمحے میں تباہ و برباد کر سکتا ہے، محمود کو یہ بھی بتایا گیا کہ برہموں کے اعتقاد کے مطابق سومنات بادشاہ ہے اور باقی تمام بت اس کے دربان اور مصاحب ہیں، محمود نے جب یہ بے معنی افسانے سنے تو اس کے دل میں جہاد کا شوق پھر چٹکیاں لینے لگا اور اس نے سومنات کو فتح کرنے اور وہاں کے بت پرستوں کو قتل کرنے کا ارادہ کیا، اس مقصد کے پیش نظر سلطان محمود نے اپنا خاص لشکر تیار کیا اور دیگر تیس ہزار سپاہیوں کو ساتھ لیا جو ترکستان وغیرہ سے جہاد کی غرض سے آئے ہوئے تھے، اور بیس شعبان ۴۱۵ھ کو سومنات کی طرف چل دیا۔

سومنات میں ورود

سلطان محمود مع لشکر کے جنگلات کو روندتا ہوا اور درمیان میں آنے والے مختلف شہروں کے قلعوں کو فتح کرتا ہوا گجرات کے شہر پٹن میں پہنچا اور پٹن سے غلہ اناج حاصل کر کے سومنات کی طرف روانہ ہوا، جب مسلمانوں کا لشکر سومنات کے قریب دریا کے کنارے پہنچا تو مسلمانوں نے دیکھا کہ سومنات کا قلعہ بہت ہی بلند ہے اور دریا کا پانی قلعہ کی فصیل تک پہنچا ہوا ہے، اہلِ سومنات قلعہ کی دیوار پر کھڑے ہو کر اسلامی لشکر کو دیکھ رہے تھے، اور چلا چلا کر مسلمانوں سے یہ کہہ رہے تھے کہ ''ہمارا معبود سومنات خود تم کو یہاں کھینچ کر لایا ہے، تا کہ ایک ساتھ ہی تم سب کو تباہ و ہلاک کر دے اور اس صورت سے تم سے ان تمام بتوں کا بدلہ لے کہ جنہیں تم نے پاش پاش کیا ہے۔''

معرکہ آرائی

سومنات مندر کے حفاظتی دستوں کے ساتھ جنگ شروع ہو گئی، مسلسل تین روز تک سخت معرکہ آرائی ہوئی، دوسرے راجاؤں کے لشکر بھی اہلِ سومنات کے تعاون کے لئے پہنچ چکے تھے، بالآخر سلطان محمود نے فتح پائی، فتح پانے کے بعد سلطان مع اپنے مصاحبوں کے مندر میں داخل ہوا تو اس میں ایک پتھر کا بت جو تقریباً پندرہ (۵!) گز لمبا تھا اُسکو دیکھ کر محمود کی اسلامی غیرت جوش میں آئی اور اپنے گرز سے بت کے چار ٹکڑے کر دئے اور حکم دیا کہ دو ٹکڑے غزنی بھجوائے جائیں، جس میں سے ایک ٹکڑا جامع مسجد

کے دروازے پر اور دوسرا ایوانِ سلطنت کے صحن میں رکھا جائے[1] اس کے علاوہ دوسرے دو ٹکڑے ایک مکہ مکرمہ اور دوسرا مدینہ منورہ بھیج دیا گیا، تاکہ عام راستے میں رکھ دیے جائیں اور لوگ انہیں دیکھ کر محمود کی ہمت و جرأت کی داد دیں۔

محمود بت شکن تھا نہ کہ بت فروش

تاریخ میں یہ واقعہ پوری صحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ جس وقت سلطان محمود نے سومنات کے بت کو پاش پاش کرنے کا ارادہ کیا تو اس وقت برہمنوں کے طبقہ نے معززینِ سلطنت کے توسط سے سلطان سے درخواست کی کہ اس بت کو نہ توڑا جائے اور یوں ہی چھوڑ دیا جائے، ہندوؤں نے اس کے عوض دولت کی ایک بہت بڑی مقدار دینے کا وعدہ کیا، معززینِ سلطنت نے ہندوؤں کی اس درخواست کو سلطان تک پہنچاتے وقت یہ خیال ظاہر کیا کہ اس درخواست کو قبول کر لینے میں ہمارا فائدہ ہے، بت کو توڑ ڈالنے سے نہ تو بت پرستی کی رسم اس شہر سے مٹ سکتی ہے اور نہ ہمیں کوئی فائدہ ہوگا، اس کے جواب میں محمود نے ان سے کہا! تم جو کہتے ہو وہ صحیح ہے، لیکن تمہارے کہنے پر چلوں گا تو میرے بعد دنیا مجھے "محمود بت فروش" کے نام سے یاد کرے گی اور اگر میں اس بت کو پاش پاش کروں گا تو مجھے "محمود بت شکن" کے نام سے یاد کرے گی، مجھے تو یہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ دنیا اور آخرت میں مجھے محمود بُت شکن پکارا جائے، نہ کہ محمود بت فروش، محمود کی نیک نیتی اسی وقت رنگ لائی اور جس وقت اس بت کو توڑا گیا تو اس کے پیٹ میں سے ان گنت اور بیش قیمت جواہر اور اعلیٰ درجے کے موتی نکلے، ان سب جواہرات کی قیمت برہمنوں کی پیش کردہ رقم سے سو (۱۰۰) گنا زیادہ تھی[2]۔

نہروالہ (پٹن) کی طرف

سومنات کے قضیہ سے فارغ ہو کر سلطان محمود پٹن کی طرف اپنا لشکر لے کر واپس ہوا، چونکہ سومنات کے معرکہ کو سخت کرنے کے لئے پٹن کے ہندو راجہ "پریم دیو" نے ہندوؤں کا بڑا لشکر مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے سومنات بھیجا تھا، جس کی وجہ سے تقریباً تین ہزار (۳۰۰۰) مسلمان شہید ہو گئے تھے، سلطان محمود اس کا انتقام ضروری سمجھ کر جب پٹن پہنچا تو راجہ پریم دیو پٹن سے بھاگ گیا اور دوسری جگہ پناہ لی، اس کا پیچھا کیا تو دوسری جگہ سے بھاگ کر روپوش ہو گیا، بالآخر سلطان پٹن کی طرف واپس آ گیا،

[1] مؤرخ فرشتہ نے لکھا ہے کہ غزنی والے دونوں ٹکڑے چھ (۶۰۰) سو سال تک وہیں رکھے ہوئے تھے۔

پٹن شہر کو دیکھ کر اس سے اندازہ ہوا کہ باشندوں کے حسن و جمال، زمین کی سرسبزی و شادابی، آبِ رواں کی کثرت اور دولت کی فراوانی کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو یہ شہر ہندوستان کا بہترین علاقہ ہے، اس علاقے کی بہترین آب و ہوا اور دوسری خوبیوں کی وجہ سے سلطان محمود کے دل میں خیال آیا کہ چند سال تک یہیں قیام کریں، مگر اپنے اصلی وطن اور دارالسلطنت غزنی کا خیال اور کچھ مصلحتوں کے پیشِ نظر پٹن کی حکومت دوسرے کے حوالہ کر کے اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ غزنی پہنچ گیا۔

خلیفۂ بغداد کا خط بنامِ محمود

جس سال سلطان محمود سفرِ سومنات سے کامیاب و کامران واپس آیا، اسی سال خلیفہ القادر باللہ عباسی نے سلطان کے نام ایک خط لکھا اور اسی کے ساتھ خراسان، ہندوستان، نیمروز اور خوارزم کا لوائے سلطنت بھی عطا کیا، اسی خط میں خلیفہ نے سلطان محمود اور اس کے بیٹوں، بھائیوں کو خطابات سے نوازا تھا، ان خطابات کے علاوہ خلیفہ نے اپنے خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ تم جس کو اپنا ولی عہد بناؤ گے ہم بھی اسی کو قبول کریں گے، اور سلطان محمود کو "امین الملت" اور "یمین الدولۃ" کے خطاب سے نوازا گیا۔

سلطان محمود نیک دل اور عدل پرور تھا اور اپنے زمانے کے شیخ ابوالحسن خرقانیؒ کا نیازمند بھی تھا، کئی بار ملاقات کے لئے خراسان بھی گیا، ایک مرتبہ شیخ کی خدمت میں نیازمندانہ حاضر ہوا، شیخ نے چند نصیحتیں کیں جن کو حرزِ جان بنایا اور شیخ ابوالحسن خرقانیؒ نے اپنی ایک عبا (خرقہ) عطا کی، جس کو محبت سے ہر معرکہ کے وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا، جب معرکہ سخت ہوتا تو عبا کو زیبِ تن کر کے دو رکعت ادا کر کے خدا سے مدد طلب کرتا، بالآخر اسکو کامیابی ملتی، مؤرخین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ سلطان محمود تمام دنیوی اور دینی خوبیوں کا مجموعہ تھا اور اپنی دلیری، شجاعت، عدل و انصاف، اچھے انتظامِ سلطنت اور فتوحات کی بنا پر دنیا کے گوشے گوشے میں مشہور تھا، اس کی معرکہ آرائیوں کا اصل سبب یہ تھا کہ اسلام اور انصاف کی برکات کو پھیلایا جائے، اور ظلم و تعدی کی بنیادوں کو ڈھا دیا جائے، اس کی بہادری اور جرأت اور استقلال کا یہ عالم تھا کہ میدانِ جنگ میں سیلاب کی طرح بڑھتا ہوا چلا جاتا تھا، لہٰذا ہندوستان پر آٹھ مرتبہ حملے کئے، کبھی کسی معرکے میں ناکام نہیں ہوا، مؤرخین لکھتے ہیں کہ سلطان محمود کی معرکہ آرائی سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا تھا کہ ہندو راجاؤں کی جمعیت منتشر ہو گئی اور ان کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا تھا، ابتدائی معرکہ میں ہندو راجہ ایک دوسرے کی مدد کو پہنچتے تھے، مگر بعد میں سلطان محمود کا اس قدر رعب طاری ہو گیا کہ جب سلطان محمود حملہ آور ہوتا وہاں کا راجہ شہر چھوڑ کر بھاگ جاتا اور ایک دوسرے کی مدد کو بھی نہ آتے، اگر اس

کے بعد کوئی دلاور ہندوستان فتح کرنا چاہتا تو اس کے لئے راستہ ہموار ہو چکا تھا، مگر سلطان شہاب الدین غوری نے جب ہندوستان فتح کرنے کا ارادہ کیا تب دو صدی گزر چکی تھی اور ہندو راجہ دوبارہ منظم اور متحد ہو چکے تھے، اس لئے شہاب الدین غوری کو پہلے دو حملوں میں شکست کا سامنا کرنا پڑا اور تیسرے حملے میں کامیابی ملی۔ آب کوثر کا مصنف لکھتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے ملتان اور منصورہ کی اسماعیلی حکومتوں کا خاتمہ کر کے اہل سنت والجماعت کے طریقوں کو تقویت پہنچائی، دوسرے لاہور کے غزنی کے تابع ہونے سے اس علاقے میں سیاسی اور فقہی امور میں مرکزی ایشیا سے روابط کا آغاز ہوا۔ (آب کوثر ص ۱۲۷)

محمود کی وفات

سلطان محمود نے دو سال تک تپ دق کی بیماری میں مبتلا رہ کر ۲۳ ربیع الثانی ۴۲۱ھ مطابق ۱۰۳۰ء میں وفات پائی، مدت حکومت پینتیس (۳۵) سال بتائی جاتی ہے۔

کیسے کیسے شیر و ضیغم چل بسے
سب اپنا دم خم دکھا کر چل بسے

ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا بانی شہاب الدین محمد غوری

سلطان شہاب الدین نے جب ۵۸۷ھ مطابق ۱۱۹۱ء میں ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرنا چاہا تو جیسا کہ "تاریخ دعوت وعزیمت" میں ایک ہندو پروفیسر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جب سلطان شہاب الدین غوری نے ہندوستان پر حملہ کیا تو پرتھوی راج[1] نے ترائن کے مقام پر جو تھانیسر سے چودہ میل کے

[1] دہلی کے راجپوت راجہ:۔ دہلی کے تخت پر ابتداء میں حکومت کرنے والی راجپوت قوم تھی، ان کی دو شاخیں تھیں، ایک توران، دوسری چوہان۔ ۷۳۶ء میں دہلی پر تورانی آٹھ راجاؤں نے یکے بعد دیگرے حکومت کی ہے، اس خاندان کے زوال کے بعد دہلی کی حکومت راجپوتوں کے دوسرے گروہ چوہانوں کے ہاتھ میں آئی، جب ان کے متعدد پانچ راجہ یکے بعد دیگرے حکومت کر چکے تو دہلی کا چھٹا اور آخری راجہ رائے پتھورا (پرتھوی راج) تخت نشین ہوا، رائے پتھورا نے اپنا پائے تخت اجمیر کو بنایا تھا، اور دہلی میں اس کا رشتہ دار حاکم تھا، اس راجہ کو شہاب الدین غوری جیسے جواں ہمت اور مستقل مزاج بادشاہ سے مقابلہ کرنا پڑا، دونوں میں سخت معرکہ آرائی ہوئی جس کے نتیجہ میں رائے پتھورا (پرتھوی راج) مارا گیا، ۵۸۸ھ کے آخر میں دہلی کی حکومت چوہانوں کے ہاتھوں سے نکل کر غورستان کے اسلامی بادشاہوں کے قبضہ میں آگئی۔ (تاریخ فرشتہ اول ص ۲۱۱)

فاصلہ پر واقع ہے، ایک منظم فوج کے ساتھ بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور سلطان شہاب الدین غوری[1] کو شکست فاش دی، اگلے سال ۵۸۸ھ مطابق ۱۱۹۲ء میں سلطان نے بڑی تیاری اور نئے عزم کے ساتھ ایک لاکھ بیس ہزار فوج کے ساتھ دوبارہ حملہ کیا، پرتھوی راج تین لاکھ سوار اور تین ہزار ہاتھی میدان میں لایا اور ڈیڑھ سو (۱۵۰) راجپوت راجگان اپنی فوجوں کے ساتھ تھے، پرتھوی راج نے شکست کھائی، گرفتار ہوا اور قتل کیا گیا اور اس طرح راجپوتوں کی آزاد سلطنت اور ہندوستان کی قدیم فرماں روائی کا خاتمہ ہوا، بعد کے مؤرخین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے شہاب الدین کے حملوں کے درمیان (جو ۵۷۶ھ سے ۶۰۲ھ تک جاری رہے، ابتدائی سالوں ہی میں) اجمیر میں قیام اختیار فرما لیا تھا، ابھی غوری کے حملوں نے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ نہیں کیا تھا اور اس کی ترکتازیاں شمالی و مغربی ہندوستان تک محدود تھیں کہ ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کر دیا، رائے پتھورا نے کسی مسلمان کو (جو غالباً اس کے دربار سے متعلق تھا) اذیت پہنچائی، حضرت خواجہؒ نے اس کی سفارش کی، رائے پتھورا (پرتھوی راج) نے متکبرانہ اور توہین آمیز جواب دیا اور کہا کہ یہ شخص یہاں آیا ہوا ہے اور ایسی اونچی اونچی باتیں کہتا ہے جو کسی نے نہ دیکھیں، نہ سنیں، حضرت خواجہؒ نے یہ سن کر ارشاد فرمایا کہ ہم نے پتھورا کو زندہ گرفتار کر کے محمد غوری کو دے دیا، اس کے بعد ہی محمد غوری نے حملہ کیا، پتھورا نے مقابلہ کیا اور شکست کھائی اور قتل ہوا[2]۔

آب کوثر میں لکھا ہے کہ اس فتح نے شمالی ہند کے دروازے مسلمانوں پر کھول دیئے اور دہلی اور اجمیر کی حکومت سلطان غوری کے ہاتھ آگئی، ترائن کی لڑائی کے بعد سلطان غزنی واپس چلا گیا اور ہندوستان میں قطب الدین ایبک کو اپنا نائب مقرر کیا، جس نے فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا اور مفتوحہ علاقے میں نظم و نسق قائم کیا، دو سال کے بعد سلطان پھر آیا اور قنوج کے طاقتور راجہ جے چند کو شکست دی، اس دوران قطب الدین ایبک نے گجرات، گوالیار، بیانہ اور بختیار خلجی نے بہار اور بنگالہ فتح کر کے اسلامی حکومت میں شامل کر دیئے، ۶۰۲ھ مطابق ۱۲۰۶ء میں کھوکھروں نے بغاوت کی اور سلطان شہاب الدین نے خود ہندوستان آ کر انہیں شکست فاش دی، یہ بغاوت ختم کر کے سلطان واپس جا رہا تھا کہ

[1] غورستان جو اس وقت افغانستان میں ہے، اس کا حاکم غیاث الدین غوری تھا جو شہاب الدین کا بڑا بھائی تھا، شہاب الدین اس کا نائب تھا جو جواں ہمت اور مستقل مزاجی کی بنا پر ہندوستان کو فتح کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، اس مقصد کے لئے سرحد پر جو مسلمان ریاستیں تھیں ان پر قبضہ جمانا ضروری تھا، شہاب الدین ۵۷۵ھ مطابق ۱۱۸۱ء سے ۵۸۶ھ مطابق ۱۱۹۱ء تک ان سرحدی علاقوں میں ترکتازیاں کرتا رہا اور قریباً شمالی مغربی ہندوستان کی ریاستوں کو ہموار کر لیا تھا۔

[2] تاریخ دعوت وعزیمت جلد سوم ص ۲۶ و تاریخ فرشتہ ص ۲۱۳

Scanned by CamScanner

دریائے جہلم کے کنارے ایک اسماعیلی فدائی نے اسے شہید کر دیا، سلطان محمد غوری کی وفات سے اسلامی ہندوستان کو جو نقصان پہنچا وہ محتاج بیان نہیں، لیکن اس ملک میں سلطان کا کام ایک حد تک مکمل ہو چکا تھا، جب سلطان شہید ہوا اس وقت قریب قریب سارے شمالی ہندوستان پر اسلامی پرچم لہرا رہا تھا، اور قطب الدین ایبک، محمد بن بختیار خلجی، التمش، ناصر الدین قباچہ اور دوسرے افسروں کا سلطان ایک ایسا منتخب گروہ چھوڑ گیا تھا جو اس کا کام جاری رکھ سکتے تھے۔[1]

سلطان کی اولاد نرینہ کوئی نہ تھی، فقط ایک لڑکی تھی، جب اس کے درباری اس بات پر تاسف اور سلطان سے ہمدردی کا اظہار کرتے تو وہ مسکرا دیتا اور کہتا کہ میرے اتنے غلام ہیں جن کو میں نے بیٹوں کی طرح پالا ہے اور جن کی تعلیم و تربیت پر بے حد محنت کی ہے وہ سب فرزندوں کی طرح میرا نام روشن کریں گے، خدا تعالیٰ کے یہاں سلطان کی محنت اور دور اندیشی مقبول ہوئی اور اس کے دلی منصوبے پورے کرنے میں اس کے غلاموں نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جو بیٹوں سے بھی بن نہیں آتے، انہوں نے خاندانِ غلاماں کی بنیاد ڈالی اور ہندوستان میں سلطان کا کام جاری رکھا۔[2]

سلطان کی اور بہت سی خوبیوں کے علاوہ اس کے دو وصف خاص طور پر تعریف کے لائق ہیں، وہ ہندوستان میں اسلامی حکومت کا بانی تھا، لیکن اس کے باوجود یہاں کے باشندوں کے خلاف اس کے دل میں عناد، حقارت اور تعصب کا کوئی جذبہ نہ تھا، اس نے بہت سی لڑائیوں میں ہندو راجاؤں کے ساتھ مل کر کام کیا، سلطان کی دوسری بڑی خوبی اس کی وفاداری تھی، سلطان محمد غوری کے اس وصفِ وفاداری اور اخلاقی شرافت کا نتیجہ تھا کہ اس کے امیر و جرنیل بھی اس پر جان دیتے تھے اور جس طرح ایک سعادت مند بیٹا اپنے باپ سے اور ایک عقیدت مند مرید اپنے پیر سے ارادت و عقیدت رکھتا ہے اسی محبت و عقیدت سے وہ اپنے بادشاہ کو دیکھتے، بلکہ اپنی کامیابیوں اور فتوحات کو سلطان کی کرامات سمجھتے اور اپنی شکست کو یمن سلطانی سے محروم ہو جانے کا نتیجہ۔[3]

سلطان شہاب الدین نے غزنی کی حکومت کی ابتدا سے لے کر شہادت تک پینتیس (۳۵) سال سے کچھ زائد عرصہ تک فرماں روائی کی، اس کی اولاد میں صرف ایک لڑکی ہی اس کی یادگار تھی، سلطان کی لاش غزنی کی اس عمارت میں دفن کی گئی جو اس نے اپنی بیٹی کے لئے بنوائی تھی۔[4]

سلطان شہاب الدین ایک خدا ترس، رحم دل اور انصاف پسند بادشاہ تھا اگرچہ وہ ایک خود مختار

---

[1] آب کوثر ص ۹۳ [2] آب کوثر ص ۹۵ [3] آب کوثر ص ۹۷ [4] تاریخ فرشتہ اول ص ۲۳۰

یہ چاروں شہاب الدین غوری کے غلام تھے۔

حکمران تھا، لیکن عالموں اور اولیاء کی صحبت میں بیٹھنے کو وہ اپنے لئے باعث فخر سمجھتا تھا اور ان کی عزت اور خدمت کرنے کو وہ اپنا فرض منصبی سمجھتا تھا۔[1]

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

مسلمانوں کے ہند پر حملے اور کامیابی کے اسباب

ابتداء میں اس ملک کو اسلام سے روشناس کرانے کے اصل تین ذرائع تھے۔

۱۔ عرب تجار:۔ عرب تاجروں اور ان کے ساتھ آنے والے مبلغین کے ذریعے سب سے پہلے ہمارے ملک تک اسلام کی روشنی پہنچی، انہی کی کوششوں سے ساحلی علاقوں کے باشندے اسلام اور اس کی تعلیمات سے روشناس ہوئے۔

۲۔ مسلمان حملہ آور:۔ یہ لوگ فوجی قوت سے اندرونی ملک میں داخل ہوئے، اگرچہ انہوں نے اپنے طرز عمل سے اسلام کی پوری پوری نمائندگی نہیں کی، پھر بھی ان کے حملوں کا یہ نتیجہ ضرور ہوا کہ مسلمان ممالک کا اندرونِ ملک سے رابطہ قائم ہو گیا، اور دین حق کی دعوت کے لئے راستے کھل گئے۔

۳۔ مبلغین اور بزرگانِ دین:۔ بہت سے بزرگ اپنے مخلص عقیدت مندوں کے ساتھ ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئے اور منظم طور پر دین کی اشاعت کا کام کرنے لگے، ان کا تقویٰ، خلوص اور انتھک کوششوں سے ہزاروں ہندوستانی مشرف باسلام ہوئے، متعدد افراد کے قلوب نرم اور اخلاق پسندیدہ ہو گئے، یہاں کے باشندوں کی ایک خاصی تعداد کے مسلمان ہو جانے کی وجہ سے اس ملک میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام اور بقاء کے لئے زمین ہموار ہو گئی۔

جہاں تک عرب تجار، مبلغین اور فقیر منش بزرگوں کی مساعی کا تعلق ہے تقریباً تمام لوگ انہیں سراہتے اور ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں، چنانچہ آج بھی مسلمانوں کے علاوہ کتنے غیر مسلم بھی ان بزرگوں کے مزار پر عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں، لیکن مسلمان حملہ آوروں کو اچھی نگاہ سے نہیں

---

[1] تاریخ فرشتہ ص ۲۳۱

دیکھا جاتا، بلکہ ان پر لوٹ مار، قتل و غارت گری، بے جا تعدی، ملک گیری کی بڑھتی ہوئی ہوس، اور جبری تبدیلی مذہب کا الزام لگایا جاتا ہے، اس میں شک نہیں کہ بعض الزامات کسی نہ کسی درجے میں صحیح ہیں، لیکن جب ہم ان اسباب پر غور کرتے ہیں جو ان حملوں کے محرک ہوئے تو ان حملہ آوروں ہی کی طرح وہ لوگ بھی مورد الزام ٹھہرتے ہیں، جن پر یہ حملے ہوئے مثلاً:

حملوں کے اسباب

۱۔ ہندوستانی راجہ ان باغی گروہوں کو اپنے یہاں پناہ دیتے تھے جو مسلمانوں کی مملکت میں بڑے بڑے جرائم کا ارتکاب کرنے کے بعد یہاں بھاگ آتے تھے، ان باغیوں میں باطنیہ بھی تھے اور قرامطہ اور ملاحدہ بھی، یہ اور اس قسم کے دیگر متعدد گروہ عموماً مسلمان مملکتوں کا تختہ الٹنے کی سازش کرتے رہتے تھے، ظاہر ہے اتنے بڑے جرم کو کوئی مملکت برداشت نہیں کرسکتی، مسلمان حکمران جب ان مجرموں کی واپسی کا مطالبہ کرتے تو پناہ دینے والوں کی طرف سے انہیں کوئی معقول جواب نہ ملتا، اور بحالت مجبوری جب وہ ان کی سرکوبی کے لئے خود آگے بڑھتے تو ان باغیوں کی حمایت میں یہاں کے راجہ ان سے جنگ کرتے، اس طرح گویا حملہ کرنے کے لئے خود انہی کی طرف سے مواقع فراہم کئے جاتے۔

مسلمان ممالک کی سرحدیں ہندوستان سے مل چکی تھیں، پڑوسی ممالک میں سرحدی تنازعات چلتے ہی رہتے ہیں، ان تنازعات کا تصفیہ کرنے کے لئے سمجھوتے ہوتے تھے، تاریخ شاہد ہے کہ ایسے بیشتر سمجھوتوں کی شرائط توڑنے اور چھیڑ چھاڑ کرنے میں پہل عموماً ہندوستان کے راجاؤں کی طرف سے ہوتی تھی، چنانچہ اکثر حملے اس سبب سے بھی ہوئے۔

مسلمان حملہ آوروں کی کامیابی کے اسباب

ان حملہ آوروں کی تعداد اور سامان جنگ اپنے حریفوں کے مقابلہ میں بہت کم ہوتا تھا۔ پھر بھی میدان عموماً انہی کے ہاتھ رہتا تھا، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ پورے علاقے پر قبضہ کرکے اسلامی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے، اس کے بھی دراصل کئی اسباب ہیں۔

مسلمانوں کی فوج لڑائی کے فن سے بخوبی واقف ہوتی تھی، ہندوستان کے راجہ فوج تو بہت بڑی

۱۔ جمع کرلیتے تھے، مگر یہ بھرتی عارضی ہوتی تھی، چنانچہ ان کی فوج کی بہت بڑی اکثریت عموماً غیر تربیت یافتہ رہتی اور اپنے حریف کے مقابلہ میں بے جگری سے لڑنے کے بجائے جلد ہی تتر بتر ہوجاتی۔

۲۔ ● مسلمان اچھے شہسوار بھی تھے اور بہترین تیر انداز بھی، یہ لوگ تیز رفتار گھوڑوں پر سوار ہوکر چاروں طرف یک بارگی ٹوٹ پڑتے اور اپنے حریفوں کو گھیرے میں لے لیتے تھے۔ ہندوؤں کی پیادہ فوج اپنی کثرت تعداد کے باوجود ان تیر انداز شہسواروں کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔

۳۔ ● ہندوؤں کو اپنے جنگی ہاتھیوں پر ناز تھا، بسا اوقات ان کے دیوپیکر ہاتھیوں کی ڈراؤنی صورت اور خوفناک چنگھاڑ سے گھوڑے بدک کر بھاگ گئے، ان سے بچاؤ کے لئے حملہ آور ایسی تدبیریں کرتے کہ یہ ہاتھی خود اپنی فوج کو کچل کر رکھ دیتے، وہ لوگ یا تو تیروں سے زخمی کرکے ان کو بھگا دیتے یا آتش بازیاں پھینک کر انہیں بھڑکا دیتے، ہاتھی سواروں کے پیچھے پیادہ فوج ہوتی جو ان ہاتھیوں کے پیروں سے کچل کر تباہ ہوجاتی۔

۴۔ ● حملہ آور ہندوستانی راجاؤں کے مقابلہ میں جنگی چالوں سے زیادہ واقف تھے، چنانچہ کبھی کبھی اپنے حریفوں کو دھوکہ یا غلط فہمی میں مبتلا کرکے شکست دے دیتے۔

۵۔ ● ہندوستان اس وقت بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا، ان ریاستوں کے حکمرانوں میں پھوٹ اور نااتفاقی تھی، چنانچہ یہ لوگ اپنے حریفوں کے مقابلہ میں اجتماعی جدوجہد نہیں کرسکتے تھے اور اگر کبھی متحد ہو بھی جاتے تھے تو اونچ نیچ کا فرق و امتیاز انہیں اپنے سردار کے علاوہ دوسرے سرداروں کے تابع فرمان ہوکر لڑنے نہیں دیتا تھا، اس کے برعکس تمام مسلمان فوجی ایک ہی سپہ سالار کی قیادت میں منظم ہوکر لڑتے تھے۔

۶۔ ● مسلمان حملہ آور اپنے فوجیوں کو مرنے مارنے پر آمادہ کرنے کے لئے ان لڑائیوں کو مذہبی جنگ یا جہاد کا نام دیتے تھے، اور مذہبی جذبات کو ابھار کر کام لیتے تھے، ہندوؤں کے پاس اتنا دلکش کوئی نعرہ نہیں تھا جو اُن کے تمام فوجیوں کو اپنی جان نچھاور کرنے پر آمادہ کرسکتا۔

۷۔ ● سب سے آخری مگر اہم ترین سبب یہ تھا کہ بھارتی سماج مجموعی طور پر سیاسی، اخلاقی، معاشرتی، اور مذہبی نقطۂ نظر سے زوال کی آخری حد تک کو پہنچ چکا تھا، اس کے ذمہ داروں میں ملک کی باگ ڈور سنبھالنے اور اسے فتنہ و فساد سے بچانے کی صلاحیت باقی نہ رہی تھی، ان کے ہاتھ سے بناؤ سے کہیں زیادہ بگاڑ کے کام ہونے لگے تھے، اس لئے قدرت نے اپنے قدیم دستور کے مطابق اس ملک کا انتظام یہاں کے اصل باشندوں سے چھین کر ایسے لوگوں کے حوالے کرنے کا

Scanned by CamScanner

فیصلہ کرلیا تھا جو بہتر صلاحیتوں کے مالک تھے، اس قضا وقدر کے فیصلے کو کوئی قوت ٹال نہیں سکتی تھی، چنانچہ حملہ آور اس ملک میں مسلم حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے [1] گویا "تؤتی الملک من تشاء و تنزع الملک ممن تشاء" کا عملی مظاہرہ تھا۔

محمود غزنوی کی رواداری کے بارے میں بطور نمونہ ہندو مؤرخین کے چند اقتباسات درج کئے جاتے ہیں موجودہ دور کے بعض وسیع النظر اور فراخ دل ہندو مؤرخوں نے ہندوؤں کے ساتھ سلطان محمود کی رواداری کا اعتراف اچھی طرح کیا ہے، مثلاً ایشوری ٹوپا نے لکھا ہے کہ "محمود نے کسی غیر مسلم کو مسلمان نہیں بنایا، اس کی مذہبی پالیسی میں رواداری کی خصوصیت تھی، اس کے متعلق یہ کہیں ذکر نہیں آتا کہ اس نے کسی ہندو کو اپنا مذہب چھوڑنے پر مجبور کیا، اس نے کسی بھی شخص کو اس کے ذاتی ضمیر کی بنا پر موت کی سزا نہیں دی، اس نے لڑائی اور محاصرہ کے موقع پر تو ہندوؤں کو ہلاک کیا، لیکن کسی اور موقع پر اس کے ہندوؤں کے ہلاک کرنے کا ذکر نہیں پایا جاتا ہے، اس کے دور حکومت میں ہندوؤں کو پوری مذہبی آزادی رہی، ان کا تقرر نہ صرف انتظامی امور کے سلسلہ میں کیا جاتا، بلکہ وہ فوج میں بھی بحال کئے جاتے، ان کے مذہب پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔" [2]

سی۔ وی ویدیہ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ محمود ایک جلیل القدر بادشاہ تھا، اس نے محض اپنی قوت بازو سے ایک چھوٹے سے پہاڑی علاقے کو ایک وسیع اور خوش حال سلطنت میں تبدیل کر دیا، یہ کوئی معمولی کارنامہ نہ تھا، میرا خیال ہے کہ محمود ان افراد میں سے ہے جو قدرت کی طرف سے ایک عرصہ کے بعد پیدا ہوا کرتے ہیں اور جن میں غیر معمولی قسم کی خوبیاں اور عدیم المثال صلاحیتیں ہوتی ہیں اور جو دنیا کی تاریخ اور قوموں کی قسمت بدل دیتے ہیں، وہ ایک اچھا حکمران بھی تھا اور اچھا منتظم سلطنت بھی عوام کو خوش حال بنانے کی فکر میں برابر لگا رہا۔ [3]

ایشوری پرشاد نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ایک غیر متعصب محقق اور مؤرخ اس کے زمانہ کی صورت حال کو پیش نظر رکھ کر کچھ اور ہی فیصلہ دینے پر مجبور ہوگا، محمود بلاشبہ اپنے ساتھیوں کا ایک جلیل القدر رہنما، ایک انصاف پسند اور دیانت دار حکمران، ایک باکمال پُر جوش سپاہی، عدل و انصاف کا شیدائی، علوم وفنون کا مربی تھا، وہ بلا شک وشبہ دنیا کے بہترین اور عظیم ترین حکمرانوں میں شمار کئے جانے کے لائق ہے۔ [4]

---

[1] آئینہ تاریخ اول ص ۸۶ [2] تاریخ مسلمانوں کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی رواداری ص ۳۴

[3] سی۔ وی۔ ویدیہ کی کتاب ہسٹری آف مڈیول ہندو انڈیا جلد سوم بحوالہ تاریخ مسلمانوں کے عہد ماضی میں ص ۳۸

[4] الہ آباد یونیورسٹی کے سابق پروفیسر ایشوری پرشاد اپنی کتاب میڈیول انڈیا بحوالہ مسلمانوں کے عہد ماضی میں ص ۳۹

شہاب الدین غوری کی رواداری کی مثال

غزنویوں کے بعد ہندوستان میں غوری آئے، شہاب الدین غوری کی تلوار ملتان، نہروالہ (پٹن)، سیالکوٹ اور ترائن وغیرہ میں ضرور چمکی، لیکن اس کے واقعات زندگی میں یہ واقعہ بھی غور کرنے کے لائق ہے کہ جب نہروالہ کی فتح میں ناکام رہ کر غزنین (غزنی) میں مقیم تھا اور اپنی شکست کا انتقام لینے کے لئے جنگی تیاریوں میں مصروف تھا کہ کسی نے عرضی لکھ کر بھیجی کہ پٹن میں ایک مشہور سوداگر ہند ہے جس کا نام وسالہ ابہر ہے، وہ ہمیشہ لاکھوں کا مال تجارت کی غرض سے ان علاقوں میں بھجوایا کرتا ہے، چنانچہ اس وقت بھی اس کا دس لاکھ کے قریب کا مال غزنین (غزنی) میں آیا پڑا ہے، اگر بادشاہ سلامت چاہیں تو اس مال کو ضبط کر کے خزانہ میں بھجوایا جا سکتا ہے، اس سے نہ صرف خزانہ معمور ہوگا، بلکہ شاہی شان وشوکت میں اضافہ ہوگا، سلطان نے عرضی کی پشت پر لکھ دیا کہ وسالہ ابہر کا یہ مال اگر پٹن میں ہوتا اور وہاں اس پر قبضہ کیا جاتا تو ہمارے لئے حلال ہوتا، لیکن غزنین (غزنی) میں اس مال پر قبضہ کرنا ہمارے لئے حرام ہے، کیونکہ وہ میری پناہ میں ہے۔ [1]

سلطان قطب الدین ایبک

(ہندوستان کا پہلا بادشاہ)

شہاب الدین غوری کی فتحیابی سے ہندوستان میں حکومت سازی کا میدان ہموار ہو گیا تھا، لہٰذا ہندوستان کا پہلا بادشاہ بننے کا فیصلہ قدرت قطب الدین ایبک کے حق میں ہوا اور اس کی طبیعت بھی ابتداء سے حکمرانی اور بادشاہی کے لئے موزوں تھی، سیاست اور حکمرانی کے رموز سے بھی خوب واقف تھا۔

قطب الدین کے ابتدائی حالات

قطب الدین ایبک کو اس کے بچپن کے زمانہ میں ایک سوداگر نے ترکستان سے نیشاپور لا کر قاضی فخر الدین کوفی (جو حضرت امام ابوحنیفہؒ کی اولاد میں سے تھے) کے پاس پہنچا دیا، چونکہ خدا تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ قطب الدین ایک دن بڑا آدمی ہوگا، اس لئے بچپن ہی سے اس کے چہرے سے عظمت اور برتری کے آثار نمایاں تھے، قاضی فخر الدین قطب الدین کو بہت عزیز رکھتے تھے، انہوں نے زندگی بھر اسے جدا نہیں کیا، اور اپنے بیٹوں کی طرح اس کی پرورش کرتے رہے۔

---

[1] ہندوستان کے عہد ماضی میں حکمران مسلمانوں کی رواداری ص ۲۰ ج ۱

Scanned by CamScanner

قاضی صاحب کے انتقال کے بعد ان کے کسی بیٹے نے قطب الدین کو ایک سوداگر کے ہاتھ فروخت کر دیا، اس سوداگر نے قطب الدین کو تحفہ کے طور پر سلطان شہاب الدین غوری کی خدمت میں پیش کیا، سلطان نے سوداگر کو اس کے معاوضہ میں ایک بیش بہا رقم عطا فرمائی، چونکہ قطب الدین کے ایک ہاتھ کی چھوٹی انگلی ٹوٹی ہوئی تھی اسلئے بادشاہ اور درباریوں نے اُسے ایبک کہنا شروع کر دیا، رفتہ رفتہ یہ لفظ اس کے نام کا جز ہو کر رہ گیا، قطب الدین نے بڑے سلیقے اور محبت کے ساتھ سلطان شہاب الدین غوری کی خدمت کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مختصر سی مدت میں قطب الدین نے بادشاہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا، قطب الدین کی قسمت کا ستارہ روز بروز بلند ہوتا گیا اور کچھ ہی دنوں میں اسے سب سے اونچا عہدہ اور مرتبہ حاصل ہو گیا۔

قطب الدین کا ہندوستان میں سپہ سالار مقرر ہونا

۵۸۸ھ مطابق ۱۱۹۳ء میں سلطان شہاب الدین نے دہلی اور اجمیر کے راجوں کو شکست دے کر کہرام اور سمانہ کو قطب الدین کی جاگیر قرار دیا اور اُسے ہندوستان کا سپہ سالار مقرر کیا تھا، قطب الدین نے اس عظیم الشان عہدے کی ذمہ داریوں کو پوری توجہ اور سلیقے سے نبھایا، کہرام اور سمانہ کے آس پاس کے تمام علاقوں اور میرٹھ اور دہلی کے قلعہ پر قبضہ کر لیا، اس کے بعد قطب الدین نے اپنا پایۂ تخت دہلی کو بنایا۔

قطب الدین نے اپنی سلطنت کی وسعت کا کام جاری رکھا اور اس کے بعد بنارس، نتران، گجرات، کالنجر اور بدایوں کو فتح کر کے دہلی کی سلطنت میں شامل کیا اور سلطنت کو وسعت دی اور جو مال غنیمت ہاتھ لگا تھا سب سے پہلے اسے تعمیر مسجد میں استعمال کیا۔

جامع[1] مسجد کی تعمیر کی تکمیل

قطب الدین نے دہلی پہنچ کر پورے شہر کو دلہن کی طرح سجایا اور جشنِ عشرت منعقد کیا، درباریوں اور دوسرے بہت سے لوگوں کو انعام و اعزاز سے نوازا، ۵۹۲ھ مطابق ۱۱۹۷ء میں اس جامع مسجد کی تعمیر مکمل ہو گئی جسے شہاب الدین کے حکم کے مطابق تعمیر کرنا شروع کیا گیا تھا۔

---

[1] دہلی کی جامع مسجد کا نام "قوت الاسلام" ہے، یہ مسجد دنیا کے عجائبات میں سے ہے، جو اپنی وسعت اور خوبصورتی کے باعث دنیا بھر میں بے مثل ہے، نیز دنیا کا بے مثل "قطب مینار" قطب الدین ایبک نے بنوایا تھا کہ ہر جمعہ کو یہاں سے صدائے تکبیر گونجا کرے، یہ دونوں عمارتیں شہاب الدین غوری کے حسب الحکم بنی تھیں، اس کی تکمیل شمس الدین التمش نے کی، مینار کی بلندی ۲۳۸ فٹ ہے۔ (ابن بطوطہ قسط ۳ ص ۸۷)

قطب الدین کی خود مختاری

شہاب الدین غوری کی شہادت کے بعد اس کا بھتیجا سلطان محمود بن سلطان غیاث الدین غورستان کا حکمران ہوا، اس نئے حکمران نے اپنے چچا شہاب الدین سے بھی زیادہ قطب الدین ایبک سے محبت و خلوص کا اظہار کیا، اور اس کی عزت افزائی کی، سلطان محمود بن غیاث الدین نے حکومت ہاتھ میں لیتے ہی قطب الدین کو ملک سے سلطان بنا دیا، اور آزادی اور خود مختاری کے فرمان کے ساتھ پروانہ اور بادشاہی کے دیگر لوازمات بھی اس کے لئے ہندوستان بھجوا دئے، قطب الدین اس فرمان اور خلعت کا استقبال کرنے کے لئے لاہور تک آیا اور اپنے آقا کی طرف سے اپنی وفاداری کی یہ قدر و منزلت دیکھ کر بہت خوش ہوا، یہ خلعت لے کر قطب الدین نے ۱۸ ذوالقعدہ ۶۰۲ھ مطابق ۱۲۰۶ء کو لاہور میں اپنی تخت نشینی کی رسومات ادا کیں اور اپنی خود مختاری اور سلطان محمود بن غیاث الدین کے فرمان کا اعلان عام کر کے لاہور سے دہلی واپس ہوا۔

قطب[1] الدین کی وفات

۶۰۷ھ مطابق ۱۲۱۱ء میں ایک روز قطب الدین چوگان[2] کھیل رہا تھا کہ اتفاقاً گھوڑے سے گر پڑا، گھوڑے کی زین کا کوبہ گھوڑے کی پیٹھ سے پھسل کر قطب الدین کے سینے پر آگرا، اسے سخت چوٹ آئی، اور اسی چوٹ کی تاب نہ لا کر اس نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا، دہلی کی فتح کے وقت سے لے کر اپنی وفات تک قطب الدین نے ہندوستان پر بیس[20] سال اور کچھ مہینے تک حکومت کی، حکمرانی کی اس مدت میں اس کا چار سالہ خود مختاری اور بادشاہی کا دور بھی شامل ہے۔

قطب الدین کا نام بہادری اور مردانگی اور بخشش و سخاوت میں آج بھی ہندوستان میں ضرب المثل ہے، اکثر اوقات وہ اپنے بہی خواہوں اور ملنے والوں کو لاکھوں دے دیتا تھا، محتاجوں اور مستحقوں کی بڑی مدد کرتا تھا اور انکی توقع سے زیادہ انعام و اکرام سے انہیں نوازتا تھا، قطب الدین کی سخاوت اور کرم گستری کی وجہ سے آج بھی اس کا نام "لکھ بخش" حاتمانہ لقب سے دنیا میں زندہ ہے، اس زمانے میں بھی جو شخص لوگوں کے نزدیک بڑا سخی ہوتا ہے اسے عام طور پر "قطب الدین زمانہ" کہا جاتا ہے۔

جگ میں جو کرتا ہے اچھے اچھے کام
مر کے بھی رہتا ہے زندہ اس کا نام

---

[1] سلطان قطب الدین ایبک کا مزار لاہور میں ہے اور اس کا وہ محلہ ایبک روڈ سے مشہور ہے۔

[2] چوگان سے اس زمانے کا کھیل مراد ہے

سلطان شمس الدین التمش

قطب الدین ایبک کے انتقال کے بعد امیروں کی اتفاق رائے سے اس کا بیٹا آرام شاہ بن قطب الدین اپنے باپ کا جانشین ہوا اور اس نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی، آرام شاہ میں حکومت کرنے کی اہلیت بالکل نہ تھی، اس وجہ سے ایک ہی سال کے اندر اندر تمام سلطنت انتشار کی نذر ہو گئی اور ملک میں سخت طوائف الملوکی پھیل گئی، لہٰذا ایک سال کی مدت سے بھی کم میں دہلی کے امیروں اور ارکان سلطنت نے سلطان التمش کو تخت نشیں کیا اور التمش نے ۶۰۷ھ مطابق ۱۲۱۱ء میں عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور بہت جلد قطب الدین کے امیروں اور درباریوں کو اپنے لطف و کرم سے گرویدہ بنا لیا اور یوں گذشتہ عہد کے تمام معززین التمش کے نام کا کلمہ پڑھنے لگے۔

خوارزم سے معرکہ

۶۱۸ھ مطابق ۱۲۲۲ء میں چنگیز خان نے ایران، توران، خراسان، سمرقند اور بخارئی، ان تمام اسلامی ملکوں کو زیر و زبر اور تہہ و بالا کرنا شروع کر دیا تھا، چنگیز خاں کے قہر و غضب سے خوفزدہ ہو کر جلال الدین خوارزم شاہ اپنے ملک سے بھاگ نکلا اور لاہور کے علاقے میں آکر پناہ گزیں ہوا، سرحدی علاقے میں خوارزم شاہ کا موجود رہنا کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا، اس لئے سلطان التمش نے اس کی خبر سنتے ہی اس پر حملہ کر دیا، خوارزم شاہ التمش کے حملہ کی تاب نہ لا سکا اور سندھ اور سیوستان کے علاقے کی طرف بھاگ گیا، سندھ پہنچنے کے بعد خوارزم اور قباچہ میں مقابلہ ہو گیا اور جب خوارزم شاہ کو کہیں جائے پناہ نہ ملی تو کچھ اور مکران کے راستے ہندوستان کی حدود سے نکل گیا۔

خلافت عباسیہ کی طرف سے سلطان التمش کے لئے عمامہ

۶۲۶ھ مطابق ۱۲۲۹ء میں خلافت عباسیہ کے قاصد دہلی آئے اور انہوں نے التمش کو بارگاہِ عباسی کی طرف سے بھیجا ہوا عمامۂ خلافت پیش کیا، التمش نے اس مذہبی خلعت کی پوری پوری تعظیم و تکریم کی اور اس خلعتِ فاخرہ کو زیب تن کر کے بے انتہا خوش ہوا، اس خوشی میں اس نے امیروں اور درباریوں کو خلعتوں اور عطیوں سے نوازا اور تمام شہر کو دلہن کی طرح سجا کر جشنِ مسرت منایا۔

حوضِ شمسی[۱]

حضرت شیخ الاسلام فرید الدین شکر گنج اپنے پیر و مرشد حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے ملفوظ میں تحریر فرماتے ہیں کہ التمش کو حوضِ شمسی تعمیر کروانے کا شوق پیدا ہوا، اس سلسلہ میں وہ روزانہ حضرت قطب صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور حوض کی جگہ اور اس کے رقبے وغیرہ کے بارے میں ان سے بات چیت کرتا، اس حوض کی تعمیر کے لئے التمش کے ذہن میں جو مقام آتا وہ فوراً اسے جا کر دیکھتا اور پھر کسی وجہ سے اس مقام کا خیال ذہن سے نکال دیتا، اتفاق سے ایک دن التمش کا گزر اسی جگہ ہوا کہ جہاں اب حوضِ شمسی واقع ہے، التمش کو یہ مقام بہت پسند آیا اور اس نے اسی وقت اس جگہ حوض تعمیر کرنے کا ارادہ کر لیا، جس روز کا یہ واقعہ ہے التمش نے خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، التمش نے دیکھا کہ سرورِ انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ایک گھوڑے پر سوار ہو کر اس منتخب مقام پر تشریف لائے ہیں اور التمش سے دریافت فرماتے ہیں کہ وہ کس امر کا خواہاں ہے، التمش جواب دیتا ہے کہ وہ اس جگہ ایک حوض تعمیر کروانے کا ارادہ رکھتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے التمش کی التجا کو پسند کیا اور ان کے گھوڑے نے زمین پر لات ماری جس سے ایک چشمہ پھوٹ نکلا اور زور و شور سے بہنے لگا، التمش نے ابھی اتنا ہی خواب دیکھا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی، اس وقت قدرے رات باقی تھی، التمش اسی وقت حضرت قطب الدین بختیارؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بڑے ادب کے ساتھ ان سے اپنے خواب کی تمام روئیداد بیان کر دی، حضرت فرید شکر گنج اپنے پیر و مرشد سے روایت کرتے ہیں کہ التمش اسی وقت حضرت قطب الدین بختیارؒ کو اپنے ساتھ اس جگہ لے گیا، حضرت قطب بختیارؒ نے شمع کی روشنی میں دیکھا کہ وہاں ایک چشمہ پھوٹا ہوا ہے، اور اسکا پانی ہر چہار طرف بہہ رہا ہے یہ واقعہ تھوڑے بہت رد و بدل کے ساتھ ہندوستان کے دیگر مشائخ کے ملفوظات میں بھی درج ہے۔[۲] واللہ اعلم بالصواب

غیبی امداد

بعض لوگ خود التمش کی زبانی یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جس زمانہ میں التمش بخارہ میں غلامی کی زندگی بسر کر رہا تھا، ایک روز اس کے آقا نے اسے ایک رائج الوقت سکہ دیا اور بازار سے انگور لانے کو کہا،

---

۱ حوضِ شمسی۔ اس حوض کی وسعت کا اندازہ اب بھی ۶ یا ۷ بیگھہ پختہ زمین میں ہے، حضرت شیخ محدث دہلویؒ کا مزار انوار بھی اس حوض کے کنارے واقع ہے، پورا حوض سرخ پتھر سے بنایا گیا ہے، لمبائی دو میل اور چوڑائی ایک میل کے قریب ہے (ابن بطوطہ قسط ۳ ص ۹۰)

۲ تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۲۵۴

التمش انگور لانے کے لئے روانہ ہوا، بازار میں جاتے جاتے اچانک وہ سکہ اس کے ہاتھ سے گر گیا، اس نے بہت تلاش کیا، مگر سکہ نہ ملا، لہٰذا وہ مجبور ہو کر (آقا کے خوف سے) ایک جگہ بیٹھ کر رونے لگا، اس وقت ادھر سے ایک فقیر گزرا، اس فقیر نے اپنے کشف باطن کے ذریعہ التمش کا حال معلوم کر لیا اور انگور خرید کرا دیئے، انگور دیتے ہوئے فقیر نے التمش سے کہا اگر خدا تجھے کبھی بادشاہ بنا دے تو تو فقیروں اور حاجت مندوں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنا جو خداوند تعالیٰ نے اس وقت تیرے ساتھ کیا ہے۔

خدمتِ فقراء

بعض کتب تاریخ میں یہ واقعہ بھی التمش ہی کی زبانی بیان کیا گیا ہے کہ جب التمش بغداد میں اپنی غلامی کا ابتدائی زمانہ بسر کر رہا تھا تو ایک روز اس کے مالک نے کچھ صاف باطن درویشوں کو اپنے گھر مدعو کیا، محفل سماع شباب پر تھی اور یہ خدائی مقبول لوگ بڑے ذوق و شوق کے ساتھ نعرہ ہائے مستانہ بلند کر رہے تھے، یہ محفل رات بھر جاری رہی اور التمش رات بھر ہاتھ میں شمع لئے کھڑا رہا، قاضی حمید الدین ناگوری اس محفل کے صدر تھے، فقرائے پاک طینت التمش کی اس خدمت سے بے انتہا خوش ہوئے اور اس گروہ کی کیمیا اثر نظر کے طفیل اس خوش عقیدہ غلام (التمش) کے دن پھر گئے، وہ پہلے خاک تھا اور اب کندن بن گیا، پہلے غلام تھا اور اب بے شمار غلاموں کا آقا ہے[1]

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے جنازہ پڑھانے کا واقعہ

جب حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کی وفات ہوئی تو کہرام مچ گیا، جنازہ تیار ہوا، ایک بڑے میدان میں جنازہ پڑھنے کے لئے لایا گیا، مخلوق مور و ملخ کی طرح جنازہ پڑھنے کے لئے نکل پڑی تھی، انسانوں کا ایک سمندر تھا، حد نگاہ تک نظر آتا تھا، یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک بپھرے ہوئے دریا کے مانند ہے، جب جنازہ پڑھانے کا وقت آیا، ایک آدمی آگے بڑھ کر کہتا ہے کہ میں وصی ہوں مجھے حضرت نے وصیت کی تھی، میں اس مجمع تک یہ وصیت پہنچانا چاہتا ہوں، مجمع خاموش ہو گیا، کہنے لگا کہ خواجہ قطب الدین بختیارؒ نے یہ وصیت کی ہے کہ میرا جنازہ وہ شخص پڑھائے جس کے اندر چار خوبیاں

ہوں، پہلی خوبی یہ کہ زندگی میں اس کی کبھی تکبیر اولیٰ فوت نہ ہوئی ہو، دوسری شرط یہ کہ تہجد کی نماز کبھی قضا نہ ہوئی ہو، تیسری بات یہ کہ اس نے غیر محرم پر کبھی بھی بری نظر نہ ڈالی ہو، چوتھی بات یہ کہ اس نے عصر کی سنتیں بھی کبھی نہ چھوڑی ہوں، جس شخص میں یہ چار خوبیاں ہوں وہ میرا جنازہ پڑھائے، جب یہ بات کی گئی تو پورے مجمع پر سناٹا چھا گیا، کون ہے جو قدم آگے بڑھائے، یہاں تک کہ ایک شخص روتا ہوا آگے بڑھا، حضرت قطب الدین بختیارؒ کے جنازہ کے قریب آیا، جنازہ سے چادر ہٹائی اور یہ کہا کہ قطب الدین بختیار کاکیؒ آپ تو فوت ہو گئے، مجھے رسوا کر دیا اور مجمع کے سامنے اللہ کو حاضر ناظر جان کر قسم کھائی کہ میرے اندر یہ چاروں خوبیاں موجود ہیں، لوگوں نے دیکھا تو وہ شخص وقت کا بادشاہ شمس الدین التمش تھا۔ **فاعتبروا یا اولی الابصار**[1]

خلافت عباسیہ کے عالم فاضل وزیر کا ورود دہلی میں

سلطان التمش کی حکومت کے آخری زمانہ میں بغداد کا مشہور و معروف عالم و فاضل فخر الملک عصامی جو پورے تیس (۳۰) سال تک خلافت عباسیہ کی وزارت کے منصب پر سرفراز رہ چکا تھا، کسی بنا پر ناراض ہو کر بغداد سے جلا وطن ہوا اور دہلی آ کر قیام پذیر ہوا، سلطان التمش نے اس بزرگ کا اس کی شان کے مطابق استقبال کیا اور اسے انعامات و اعزاز سے سرفراز کر کے اپنا وزیر مقرر کیا، التمش کے عہد حکومت میں علماء اور انشاء پردازوں کی ایک بہت بڑی جماعت بادشاہ کی سرپرستی میں اپنی تصنیف و تالیف سے عام لوگوں کو فائدہ پہنچاتی تھی، اس جماعت میں نور الدین عوفی کا نام امتیازی حیثیت رکھتا ہے، اس عالم و فاضل شخص نے "جامع الحکایات" تصنیف کی، اس کتاب کو التمش کے وزیر نظام الملک محمد بن ابو سعید جنیدی کے نام نامی سے منسوب کیا۔

شمس الدین التمش نے نہ صرف بیرون ہند کے علماء کی قدر کی، بلکہ وہ بیرون ہندوستان سے اچھی اچھی کتابیں بھی منگواتا تھا اور اس ملک کے علمی خزائن کو مالا مال کرتا تھا، "آداب سلاطین" اور "مآثر سلاطین" جیسی کتابیں باہر سے منگوائی گئیں، ایک معرکۃ الآراء کتاب "آداب الحرب" تھی جو سلطان شمس الدین کے نام پر تاریخ مبارک شاہ کے مصنف نے لکھی، عہد شمسی کا ایک اور فاضل محمد جرجانی تھا، جس نے بادشاہ وقت کے نام پر حجۃ الاسلام امام غزالی کی احیاء العلوم کا فارسی میں ترجمہ کیا اور امام رازی

[1] ملفوظات ذوالفقار جلد اول ص ۹۹

Scanned by CamScanner

کی تالیف سرِ مکتوم کا فارسی ترجمہ کیا۔

جزائے دائمی ملتی رہے خلاق عالم سے
کہ نصرت اور اعانت کی ہے تم نے دینِ احمد کی

وفات

اجین کے سفر کی تکان دور کرنے کے لئے کچھ روز دہلی میں آرام کیا، پھر ملتان کی طرف چل پڑا، یہ سفر التمش کو موافق نہ آیا اور اس کی صحت پر بڑا اثر پڑا، وہ بیمار ہوگیا، بیماری نے اس حد تک طول کھینچا کہ التمش بستر مرگ پر لیٹ گیا، امراء اور سردار التمش کو اسی حالت میں عماری پر بیٹھا کر دہلی لائے، دہلی پہنچ کر اس کی حالت دن بدن خراب ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ ۲۰ ر شعبان ۶۳۳ھ مطابق ۱۲۳۵ء کو اس کا انتقال ہوگیا۔ (خدا کی رحمت اس کی لحد پر سایہ فگن رہے) سلطان التمش نے چھتیس[۳۶] سال تک حکمرانی کے فرائض انجام دیئے۔

۶۳۴ھ مطابق ۱۲۳۶ء میں جب سلطان التمش کا انتقال ہوا، اس وقت تقریباً سارا شمالی ہندوستان اس کے قبضہ میں تھا، اس کی وفات کے بعد دس سال تک پھر ملک میں بدانتظامی رہی اور یکے بعد دیگرے کئی بادشاہ ہوئے، مگر نااہلیت اور عیش کوشی جیسے اسباب نے پورے ملک کو طوائف الملوکی اور بدانتظامی کا شکار بنادیا، بالآخر امراء نے ناصر الدین محمود بن التمش کو تخت نشین کردیا۔[۱]

ناصر الدین محمود بن التمش

ملک کے یہ حالات دیکھ کر امراء نے ۶۴۴ھ مطابق ۱۲۴۶ء میں سلطان التمش کے چھوٹے بیٹے کو تخت نشین کیا، اس کی تعلیم و تربیت التمش کے ہاتھوں بہت اچھی ہوئی تھی، ناصر الدین ایک درویش طبع بادشاہ تھا، سرکاری خزانے کو ہاتھ نہ لگاتا اور قرآن شریف لکھ کر روزی کماتا۔ سلطنت کا نظم و نسق اس نے اپنے قابل وزیر غیاث الدین بلبن کو سونپ رکھا تھا، ناصر الدین محمود کے حالات پڑھنے سے خیال ہوتا

[۱] دس سال میں جو بادشاہ یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے ان کے نام یہ ہیں (۱) رکن الدین فیروز شاہ (۲) رضیہ سلطانہ بنت التمش (۳) معز الدین بہرام شاہ (۴) علاؤ الدین مسعود بن رکن الدین بالترتیب بادشاہ ہوئے اور ان کے بعد ناصر الدین محمود بن التمش تخت نشین ہوا۔ (تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۲۶۸)

ہے کہ اس کی زندگی اپنے باپ کے مانند اولیاء صلحاء کے نمونے پر تھی، انتظام سلطنت بلبن کے سپرد کر کے اس سے کہہ رکھا تھا کہ میں نے تمہیں تمام اختیارات دیدیئے ہیں، تم ہرگز کوئی ایسا کام نہ کرنا جس سے کل کو خدائے بے نیاز کے حضور میں تمہیں اور مجھے شرمندگی اٹھانی پڑے۔ وہ خود اپنا اکثر وقت حجرے کے اندر عبادت اور تلاوت قرآن مجید میں صرف کرتا اور مشہور ہے کہ دربار عام کے وقت وہ شاہی لباس زیب تن کرلیتا تھا اور اس کے بعد خلوت میں جا کر پھٹے پرانے کپڑے پہنے رہتا، اپنا گزارہ وہ کلام مجید نقل کر کے کرتا تھا، اور اس امر کی بھی بڑی احتیاط کرتا کہ اس کے لکھے ہوئے نسخے معمولی نرخ پر فروخت ہوں، اور کسی کو یہ پتہ نہ چلے کہ وہ بادشاہ کے لکھے ہوئے ہیں۔[۱] تاریخ فرشتہ کا مصنف لکھتا ہے کہ مؤرخین کا بیان ہے کہ جب ناصر الدین نے بلبن کو اپنا وزیر مقرر کیا تو تنہائی میں لے جا کر اس سے کہا میں نے تمہیں اپنا نائب مقرر کیا ہے اور خدا کی مخلوق پر حکمران بنایا ہے، تم کبھی کوئی ایسا کام نہ کرنا کہ مجھے خداوند تعالیٰ کے سامنے جواب دہ اور شرمندہ ہونا پڑے، بلبن نے نیابت کے کچھ ایسے مستحکم اصول و قوانین بنائے کہ اصل اقتدار اس کے ہاتھ میں آگیا، اور ارکانِ حکومت میں اتنی قدرت نہ رہی کہ وہ اس کے کاموں میں دخل دیتے اور وہ قدیم امراء جو قطب الدین ایبک اور شمس الدین التمش کے عہد سے ملتان اور لاہور کے جاگیردار تھے، صدق دل سے بادشاہ دہلی کے مطیع اور فرماں بردار نہ تھے اور مغل لٹیروں کا مقابلہ پوری طاقت کے ساتھ نہ کر کے خود اپنے آقا کے ساتھ منافقت سے کام لیتے تھے، ناصر الدین نے بلبن کے مشورے سے ان تمام امراء کو معزول کردیا اور ان کی جگہ ان کے بیٹوں کا تقرر کر کے ان معزول امراء کو اپنے ساتھ دہلی لے آیا، اس اقدام کی وجہ سے پنجاب کی سیاسی اور مالی حالت میں استحکام پیدا ہوگیا اور ناصر الدین کی حکومت کچھ عرصہ کے لئے مستحکم ہوگئی۔[۲]

مغلوں کا حملہ

۶۵۵ھ کے آخر میں مغلوں کے ایک لشکر نے اچھ اور ملتان کے علاقوں پر حملہ کیا، ناصر الدین محمود اس حملہ کا سدباب کرنے کے لئے ملتان پہنچا، (اس کے پہنچنے سے پہلے ہی سے) مغلوں کی فوج بغیر جنگ کئے ہوئے واپس چلی گئی، لہٰذا ناصر الدین بھی دہلی واپس آگیا۔[۳]

[۱] آب کوثر ص ۱۰۱ ۔ [۲] تاریخ فرشتہ اول ص ۲۶۹ ۔ [۳] تاریخ فرشتہ اول ص ۲۷۲

Scanned by CamScanner

ناصرالدین محمود کا کردار

نظام الدین احمد نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ سلطان ناصرالدین ہر سال اپنے ہاتھ سے قرآن شریف کے دو نسخے کتابت کرتا تھا، ان کا جو ہدیہ ملتا تھا اس سے وہ اپنے کھانے پینے کا سامان کرتا تھا، ایک مرتبہ ایک امیر نے بادشاہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن شریف کو معمول سے زیادہ ہدیہ پر لیا، بادشاہ کو یہ بات پسند نہ آئی اور اس نے حکم دیا کہ آئندہ سے اس کے لکھے ہوئے قرآن خفیہ طور پر عام اور رائج الوقت قیمت پر ہدیہ کیے جائیں، ناصرالدین کے گھر میں اس کی بیوی کے علاوہ کوئی خادمہ یا کنیز وغیرہ نہ تھی جو گھر کا کام کاج کرتی، ملکہ خود اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتی اور گھر کے دوسرے کام کاج انجام دیتیں، ایک دن ملکہ نے ناصرالدین سے کہا کہ روٹی پکاتے پکاتے میرے ہاتھوں میں سوزش ہوگئی ہے، اگر اس کام کے لئے کوئی لونڈی خرید لیں تو اس میں کوئی حرج نہیں، ناصرالدین نے ملکہ کو جواب دیا سرکاری خزانہ صرف رعایا کا حق ہے، مجھے اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ میں اپنے ذاتی آرام و آسائش کے لئے اس میں سے کچھ روپیہ لے کر ایک لونڈی اپنے لئے خریدوں، تمہیں دنیوی تکلیفوں پر صبر کرنا چاہئے، خدا اس کا بدلہ تمہیں آخرت میں دے گا۔[1]

ناصرالدینؒ کے اخلاق

ایک دن ایک فقیر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت بادشاہ قرآن شریف کی تلاوت کر رہا تھا، اس فقیر کی نظر قرآن شریف کے ایک صفحہ پر پڑی، جہاں ''ایک حرف'' دوبارہ لکھا ہوا تھا، اس فقیر نے بادشاہ سے کہا اس جگہ ایک حرف ''فیہ'' زیادہ لکھا ہوا ہے، بادشاہ نے اسی وقت قلم دوات لے کر ایک ''فیہ'' کے گرد حلقہ کھینچ دیا اور اس فقیر کو اس کی حاجت روائی کے بعد رخصت کر دیا، جب یہ شخص چلا گیا تو ناصر الدین نے قلم تراش لے کر یہ حلقہ جو ابھی بنایا تھا لفظ ''فیہ'' سے مٹا دیا، ایک غلام پاس ہی کھڑا تھا، اس نے یہ تمام منظر دیکھا تھا، لہٰذا اس نے ناصرالدین سے پوچھا، ایک دفعہ حلقہ کھینچنے اور دوسری بار اُسے مٹا دینے میں کیا مصلحت ہے، بادشاہ نے جواب دیا، وہ شخص جس نے ''فیہ'' کی تکرار پر اعتراض کیا تھا ایک فقیر تھا اور میرے پاس ایک ضرورت کی وجہ سے آیا تھا، اگر میں اس کے اعتراض کی تردید کرتا تو وہ

1. تاریخ فرشتہ اول ص ۲۷۶

نادم ہو کر بغیر اپنی ضرورت پوری کئے یہاں سے چلا جاتا، اس لئے میں نے اس کی موجودگی میں حلقہ کھینچ دیا اور جب وہ چلا گیا تو میں نے یہ حلقہ مٹا دیا، دنیا میں غبار دل دور کرنا مشکل ہے، لیکن کاغذ کا نقش مٹانا آسان ہے۔[1]

طہارت نفس

کہا جاتا ہے کہ ناصرالدین کے ایک مصاحب کا نام محمد تھا، بادشاہ اُسے ہمیشہ اسی نام سے پکارا کرتا تھا، ایک روز ناصرالدین نے اس مصاحب کو ''تاج الدین'' کہہ کر پکارا، اس مصاحب نے اس وقت تو بادشاہ کے حکم کی تعمیل کی، لیکن بعد میں اپنے گھر چلا گیا اور تین روز تک بادشاہ کی خدمت میں حاضر نہ ہوا، ناصرالدین نے اس مصاحب کو طلب کیا اور اس کی غیر حاضری کا سبب دریافت کیا، مصاحب نے جواب دیا آپ ہمیشہ مجھے محمد کے نام سے پکارا کرتے تھے، لیکن اس دن آپ نے خلاف معمول تاج الدین کہہ کر پکارا، میں نے اس سے نتیجہ اخذ کیا کہ شاید آپ کے دل میں میری طرف سے کوئی بدگمانی پیدا ہوگئی ہے، اس وجہ سے میں تین روز تک آپ کی خدمتِ اقدس میں حاضر نہ ہوا اور یہ سارا وقت انتہائی پریشانی اور بے چینی کے عالم میں بسر کیا، بادشاہ نے قسم کھا کر کہا میں ہرگز ہرگز تم سے بدگمان نہیں ہوں، لیکن میں نے جس وقت تم کو تاج الدین کے نام سے پکارا تھا اس وقت میں باوضو نہیں تھا، مجھے یہ مناسب معلوم نہ ہوا کہ بغیر وضو محمد کا مقدس نام اپنی زبان پر لاؤں۔[2]

۶۶۳ھ مطابق ۱۲۶۳ء میں ناصرالدین محمود بیمار ہوا، اور ۱۱ر جمادی الاولیٰ ۶۶۴ھ مطابق ۱۲۶۵ء کو اس نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی، اس کی مدت حکومت بائیس (۲۲) سال سے کچھ زیادہ ہے۔

جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

سلطان غیاث الدین بلبنؒ

سلطان ناصرالدین کی زندگی میں ہی امور سلطنت کی باگ ڈور اس کے نائب غیاث الدین بلبن کے ہاتھ میں تھی، اور جب اس نے ۶۶۴ھ مطابق ۱۲۶۵ء میں وفات پائی تو بلبن بغیر کسی مزاحمت کے بادشاہ ہو گیا۔

ؒ بلبن ترکوں کے کسی گروہ کا خاندانی نام ہے۔ 1. تاریخ فرشتہ اول ص ۲۷۶ 2. تاریخ فرشتہ اول ص ۲۷۷

بلبن کی بلند نظری

غیاث الدین بلبن ایک باشعور، سمجھ دار اور صاحب وقار حکمران تھا، اس کے ہر حکم میں عقلمندی اور سنجیدگی کے آثار پائے جاتے تھے، وہ ہمیشہ سلطنت کے اہم امور قابل اور موزوں افراد کے سپرد کرتا تھا، اُسے جب تک لوگوں کی قابلیت، ایمانداری، معقولیت اور پختہ کاری کا تجربہ اور اندازہ نہ ہو جاتا تھا وہ اس وقت تک کوئی اہم کام ان کے سپرد نہ کرتا تھا، ان صفات کے ساتھ ساتھ عمال کی اعلیٰ نسبی اور شرافتِ خاندانی کا بھی بہت خیال رکھتا تھا، تقرری کے وقت عاملوں صوبہ داروں کی نیک نیتی اور پرہیزگاری کو جانچ لیتا، اگر ابتدائی جانچ پڑتال میں کچھ کمی رہ جاتی اور بعد میں ظاہر ہوتی تو فوراً اس کو عہدے سے برخاست کر دیا جاتا، بلبن نے غیر مسلموں کو کبھی کوئی ذمہ داری کا عہدہ نہیں دیا، اس خیال سے کہ غیر مسلم حاکموں کی وجہ سے مسلمان رعایا کو تکلیف نہ پہنچے، بلبن نے اپنے تمام عہدِ حکومت میں جو بائیس سال کے عرصہ پر پھیلا ہوا ہے، کبھی بھی اربابِ لہو ولعب سے بات چیت نہیں کی اور نہ انہیں منہ لگایا، اس کی بارگاہ تک ایسے لوگوں کا پہنچنا بہت مشکل بلکہ ناممکن تھا۔[1]

آب کوثر میں سلطان غیاث الدین بلبن کے بارے میں لکھا ہے کہ اسلامی ہندوستان کے بادشاہوں میں بلبن ایک خاص رنگ اور شان کا بادشاہ ہوا ہے، بلبن اصل میں ایک ترک امیر زادہ تھا، چنگیز خانی حملہ میں گرفتار ہوا اور بغداد میں بطور ایک غلام کے فروخت ہوا، وہاں ایک بزرگ جمال الدین بصری نے اُسے خریدا اور تربیت کی، پھر وہ دہلی میں آیا، شروع میں ایک معمولی سپاہی بلکہ بہشتی اور فراش کا کام کیا، رفتہ رفتہ نائب الملک بن کر پوری سلطنت پر حاوی ہو گیا، اس کے عہدِ حکومت تک بادشاہ فقط امراء کا سردار ہوتا تھا، لیکن بلبن کا بادشاہت اور ملوکیت کی نسبت ایک نقطۂ نظر تھا جو اس کے پیش رؤں بالخصوص درویش مزاج اور سادی طبع ناصر الدین محمود (بلکہ صوفی منش التمش) کے طریقِ کار سے بالکل مختلف تھا اور اس نے بادشاہ کو امراء سے بہت بالا و برتر ایک جداگانہ ہستی بنا دیا۔[2]

بلبن کا قول تھا کہ "نبوت کے بعد خلقِ خدا کی خدمت کا سب سے عمدہ ذریعہ بادشاہت ہے، اس کے حقوق کا پاس ضروری ہے اور جو بادشاہ اپنا جاہ و حشم، رعب و دبدبہ قائم نہیں رکھتا، وہ اپنے فرائض پوری طرح بجا نہیں لا سکتا، اور اس کی رعایا بغاوت اور دوسری خرابیوں میں مبتلا ہو جاتی ہے، بلبن اپنی خانگی زندگی میں بھی رعب و وقار کا بڑا خیال رکھتا، ضیاء الدین برنی لکھتا ہے کہ بلبن اپنی تمام مدتِ بادشاہی میں کسی مجلس میں قہقہہ مار کر نہیں ہنسا اور نہ کسی کو جرأت ہوتی کہ اس کے سامنے قہقہہ مار کے ہنسے۔[3]

---

[1] تاریخ فرشتہ اول ص ۲۷۹ [2] آب کوثر ص ۱۰۲ [3] ایضاً ص ۱۰۳

جب بلبن تخت نشین ہوا تو شمس الدین التمش کے چالیس غلام تھے جو سلطنت کے سیاہ و سفید پر حاوی تھے، وہ چہل گاں اور خواجہ تاش کہلاتے تھے اور بادشاہ کے انتخاب و تعین میں ان کا ہاتھ ہوتا، خود بلبن انہی میں سے ایک تھا، لیکن بادشاہت کی نسبت اس کا جو نظریہ تھا، اس کا تقاضہ تھا کہ بادشاہ امراء میں سے نہ گنا جائے بلکہ ان سے بہت بلندی پر ہو، چنانچہ بلبن نے ان کے اقتدار کو توڑ دیا اور جو امیر بادشاہ کے لئے کسی خطرے کا باعث تھا، اُسے جاہ و منصب سے محروم کر دیا۔[1]

اندرونی امن و امان اور خارجی حملہ آوروں سے ملک کے بچاؤ کے علاوہ بلبن کے نزدیک بادشاہ کا بڑا فرض عدل و انصاف کی ترویج تھا، اس کا وہ سختی سے اہتمام کرتا، اس کے زمانہ میں جن امراء نے غریبوں پر ظلم کیے بلبن نے انہیں سخت سزائیں دیں۔ بدایوں کے ایک جاگیردار نے ایک نوکر کو اتنا پٹوایا کہ وہ مر گیا، جب بلبن بدایوں گیا اور مقتول کی بیوہ نے فریاد کی تو بلبن نے جاگیردار کے ساتھ وہی سلوک کیا جو اس نے اپنے نوکر کے ساتھ کیا تھا اور جس سرکاری خبر رساں نے اس واقعہ کی خبر بادشاہ کو نہ دی تھی اسے بھی عبرتناک سزا دی، اس کے زمانہ میں اس طرح کے کئی واقعات ہوئے، وہ کہا کرتا تھا کہ اگر میرے بیٹے ایسا کریں گے تو میں ان کے ساتھ بھی یہی سلوک کروں گا۔[2]

دستور جہاں بانی

بلبن اپنے بیٹوں سے ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ سلطان التمش سید مبارک غزنوی کے واسطہ سے فرمایا کرتے تھے کہ "بادشاہوں کے اکثر افعال شرک کی حدوں کو چھو لیتے ہیں اور بہت سے ایسے کام کرتے ہیں جو سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہوتے ہیں لیکن وہ اس وقت اور بھی زیادہ گنہگار ہو جاتے ہیں، جب کہ وہ اِن چار باتوں پر عمل نہیں کرتے، وہ چار باتیں یہ ہیں، (۱) بادشاہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی شان و شوکت کے رعب و دبدبہ کو مناسب موقع پر استعمال کرے اور خدا ترسی اور خلقِ خدا کی بھلائی ہمیشہ اس کے پیشِ نظر رہے (۲) بادشاہ کو ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے کہ اس کے ملک میں بدکاری مروج نہ ہو، فاسقوں اور بے غیرتوں کو ہمیشہ ذلیل و رسوا کرنا چاہئے، (۳) امور سلطنت کو عقلمند اور مہذب لوگوں کے سپرد کرنا چاہئے۔ خلقِ خدا پر جن کو حاکم مقرر کیا جائے وہ دیانتدار اور خدا ترس لوگ ہونے چاہئیں بدعقیدہ لوگوں کو ملک میں پنپنے نہیں دینا چاہئے۔ کیونکہ ایسے لوگ رعایا کو غلط راستہ پر ڈال

---

[1] آب کوثر ص ۱۰۴، [2] ایضاً ص ۱۰۶

Scanned by CamScanner

دیتے ہیں۔ چوتھی اور آخری بات یہ ہے کہ بادشاہ کو چاہئے کہ وہ انصاف سے پورا پورا کام لے، ماتحتوں کی کارگزاری کا بنظر عدل جائزہ لیتا رہے تاکہ ملک سے ظلم وستم کا نشان تک مٹ جائے۔" پس تم سب جو میرے جگر گوشے ہو، یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ اگر تم میں سے کسی نے کسی عاجز اور لاچار کو ستایا تو میں ظالم کو اس کے ظلم کی پوری پوری سزا دوں گا۔[1]

بلبن کی شخصیت

مؤرخین تحریر کرتے ہیں کہ جب کبھی غیاث الدین بلبن کسی شہر کے کنارے یا کسی دریا کے پل کے قریب پہنچ جاتا تو خود کنارے پر کھڑا ہو جاتا اور اپنے عہدیداروں کو حکم دیتا کہ وہ ہاتھوں میں لکڑیاں لے کر انتظام کریں اور سب سے پہلے مریضوں، عورتوں، بچوں اور کمزور جانوروں کو پار اتروائیں اور یہ عام حکم تھا کہ صحت مند و توانا لوگ معذوروں اور لاچاروں کی مدد کریں، اس کے بعد گھوڑے، ہاتھی اور بار برداری کے دوسرے جانور پانی کو عبور کریں، ایسے انتظامات کے سلسلہ میں بلبن نے اکثر مقامات پر کئی کئی دن بسر کئے، لیکن اس کے دل پر کسی قسم کا خوف طاری نہ ہوا، تخت نشینی سے پہلے یعنی زمانہ امارت میں بلبن کو شراب خوری کی بہت عادت تھی اور اس کی محفل خوش آواز ساتھیوں اور فن کار گویوں سے بھری رہتی تھی، متعدد امراء اور رئیس اس محفل میں بلائے جاتے اور بلبن بڑے شوق کے ساتھ ان سے چوپڑ کھیلتا اور اہل محفل پر سونا اور چاندی نثار کرتا، لیکن جب حکومت کی باگ ڈور بلبن کے ہاتھ میں آئی، تو اس نے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے ان افعال سے توبہ کر لی اور بادہ خواری اور دوسرے تعیشات کا نام و نشان تک اپنے ملک سے مٹا دیا اور بڑی سختی سے ارکانِ مذہب یعنی نماز، روزہ وغیرہ کا پابند ہو گیا، فرائض کے علاوہ اس نے کبھی تہجد، چاشت اور اشراق کی نمازیں بھی قضا نہیں کی، وہ ہر وقت باوضو رہتا تھا، عالموں، صوفیوں اور بزرگانِ دین وغیرہ کی موجودگی میں دسترخوان پر کبھی پیش دستی نہ کرتا بلبن کی عادت تھی کہ کھانے کے وقت علماء سے مختلف مسائل کی تحقیق کرتا، وہ امیروں، وزیروں وغیرہ کی قیام گاہوں پر ان سے ملاقات کے لئے جاتا اور اس طرح ان کی عزت افزائی کرتا، اس کا معمول تھا کہ جمعہ کی نماز پڑھنے کے بعد مشائخ اور علماء کرام کے گھروں میں جاتا، شیخ برہان الدین بلخی، مولانا سراج الدین سنجری اور مولانا نجم الدین دمشقی جیسے جید اور بزرگ علماء کی صحبت سے فیض یاب ہوتا۔

[1] تاریخ فرشتہ ص ۲۸۲

بلبن قبرستان میں جا کر قبروں کی زیارت بھی کیا کرتا تھا، جب حکومت کے کسی رکن یا بزرگ کا انتقال ہو جاتا تو وہ اس کے جنازہ پر جاتا اور تجہیز و تکفین میں شریک ہوتا، بعد میں مرنے والے کے گھر پر جا کر صبر کی تلقین اور راضی برضائے خدا رہنے کی تاکید کرتا، مرحوم امراء کے وارثوں کو خلعت اور انعامات وغیرہ سے سرفراز کرتا اور یتیم بچوں کی پرورش کے لئے بھاری وظیفے مقرر کرتا اور ان کے غم میں برابر کا شریک رہتا۔ بلبن کی عادت تھی کہ کہیں سوار ہو کر جاتا اور راستے میں یہ معلوم ہوتا کہ یہاں وعظ ہو رہا ہے تو وہ سواری سے اتر کر مجلسِ وعظ میں شریک ہو جاتا، وہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کو بہت غور سے سنتا اور زار و قطار روتا، مؤرخین تحریر کرتے ہیں کہ بلبن کے قدیم غلاموں اور خاص ملازموں کا بیان ہے کہ ان میں سے کسی نے کبھی بادشاہ کو ننگے سر اور ننگے پاؤں نہیں دیکھا، وہ محفل میں کبھی قہقہہ نہ لگاتا تھا، بلبن کا قول ہے کہ بادشاہ کا رعب اور اس کے وقار کا سکہ رعایا کے دل پر جس قدر سنجیدگی اور متانت سے بیٹھتا ہے، اسی قدر سیاست کا اثر نہیں ہوتا، وہ یہ بھی کہا کرتا تھا کہ اگر کوئی بادشاہ بارعب نہیں ہوتا تو اس کی رعایا سرکشی اور بغاوت کی طرف مائل ہو جاتی ہے، جو بادشاہ اپنے ذاتی وقار کا تحفظ کرتا ہے وہ بڑے اطمینان کے ساتھ مدتوں حکومت کر سکتا ہے، بصورت دیگر اس کی حکومت فتنہ خیزیوں اور ہنگامہ آرائیوں کا مرکز بن جاتی ہے، قوانینِ انصاف محض کتابوں کی زینت بن کر رہ جاتے ہیں اور عملی زندگی میں ان کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا، ظلم و جور کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔

بلبن ان تمام صفات اور اعلیٰ عادات کے باوجود بغاوت و سرکشی کو ناپسند کرتا تھا، باغی چاہے مسلم ہو یا غیر مسلم اس کی سرزنش میں کسی قسم کی رُو و رعایت نہ کرتا تھا، اس کے عہدِ حکومت میں ملک میں امن و امان برقرار رکھنے کے لئے مفسدوں کو ہر طرح کی سزائیں دی جاتی تھیں، قتل کرنے یا قید خانہ میں ڈال دینے کی سزاؤں میں وہ قطعاً دریغ نہ کرتا تھا، یہی وجہ تھی کہ کوئی بلبن کی اطاعت کا منکر نہ ہوتا تھا، شمس الدین التمش کے عہد کے وہ قوانین اور ضابطے جو اس کے جانشینوں کی غفلت اور نااہلی کی وجہ سے تقریباً منسوخ ہو گئے تھے اس کو بالکل اسی طرح مروج کیا جیسے کہ وہ التمش کے عہد میں مروج تھے۔[1]

بغرا خان اپنے والد بلبن کے بارے میں کہتا ہے کہ جب میں اور میرے بڑے بھائی خان شہید نے خطاط کے سامنے مفردات لغت اور نوشت و خواند ختم کر لی تو شاہی ملازم سلطان غیاث الدین بلبن کی خدمت میں گئے اور عرض کیا کہ اب شہزادے صرف و نحو اور فقہ میں کس چیز کی تعلیم حاصل کریں اور کون سے استاد اس مقصد کیلئے مقرر ہوں، بادشاہ نے جواب دیا، خطاط کو خلعت اور انعام دے کر رخصت کیا جائے اور میرے بیٹوں کو دانا مؤرخین اور سمجھدار استاذ "آداب السلاطین" اور "مآثر السلاطین" جیسی کتابیں

[1] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۲۶۲

جو ہند ہو سے سلطان التمش کے بیٹوں کے لئے لائی گئی تھیں، پڑھائی جائیں، اور اس کے بعد میرے بیٹے ان تجربہ کار بوڑھوں کی صحبت میں رہیں جو علم تاریخ اور احوال بزرگان میں مہارت رکھتے ہوں، اور کم ہمت، گدا طبع لوگ ان کے قریب نہ آئیں جو علم کہ وہ سکھاتے ہیں وہ میرے بیٹوں کو امور مملکت میں مفید ہو گا اور جہاں تک نماز، روزہ اور وضو کا تعلق ہے انہیں سکھانا لازمی ہے، لیکن اس قدر وہ سیکھ چکے ہیں۔[1]

شکار کا شوق

بلبن کو شکار سے بہت دلچسپی تھی، سلطنت و حکومت کے فرائض کو بخوبی انجام دینے کے ساتھ ساتھ اکثر تمام دن سیر و شکار میں بسر کرتا، سردی کے موسم میں شکار کے لئے دہلی کے چاروں طرف بیس بیس[2] کوس کے راستے کی حفاظت کی جاتی تھی، بلبن کا معمول تھا کہ وہ شکار کے لئے اس وقت نکلتا جبکہ تھوڑی سی رات باقی ہو اور دوسری رات کا دو تہائی حصہ جب گزر جاتا تو وہ شکارگاہ سے اپنی قیام گاہ پر واپس آ جاتا، اس کے ساتھ ہمیشہ ایک ہزار سوار اور ایک ہزار پیادہ تیر انداز رہتے تھے، جن کے تمام اخراجات شاہی خزانے سے ادا کئے جاتے تھے، کہا جاتا ہے کہ جب ہلاکو خان نے بلبن کے اس شوق کی تفصیل سنی تو اس خونخوار فرماں روا نے کہا "بلبن ایک تجربہ کار اور عاقبت اندیش بادشاہ ہے، بظاہر تو وہ شکار کا شوق کرتا ہے، لیکن دراصل اس صورت سے وہ سواری کی ورزش اور اپنے لشکر کی حفاظت کرتا ہے۔ بلبن نے جب ہلاکو خاں کی یہ بات سنی تو وہ اسکی عقل مندی اور شعور کا بے حد معترف ہوا اور کہنے لگا فرماں روائی اور سیاست کے قواعد و ضوابط وہی شخص بہتر طور پر جان سکتا ہے، جس نے اپنی تلوار کے بل پر جہاں بانی کی ہو۔[2]

بلبن کی عاقبت اندیشی

جب غیاث الدین بلبن کی سلطنت اور حکومت کی بنیادیں اچھی طرح مضبوط اور پائے دار ہو گئیں تو اس کے چند قابل اعتبار امیروں نے بلبن سے عرض کیا کہ "گجرات اور مالوہ کے علاوہ چند دیگر مقامات جو قطب الدین ایبک اور سلطان التمش کے زمانہ میں اسلامی حکومت میں شامل ہو گئے تھے، اب خودسر ہو گئے ہیں، اب یہی مناسب ہے کہ ان خودسر علاقوں کی طرف توجہ کی جائے تا کہ ان مقامات کو دوبارہ شاہ

---

۱ آب کوثر ص ۱۱۸ ایضاً بحوالہ فیروز شاہی

۲ تاریخ فرشتہ اول ص ۲۸۴

دہلی کا مطیع و خراج گزار بنایا جا سکے" بلبن نے یہ سن کر امیروں سے کہا ان دنوں مغلوں کی ہنگامہ خیزیاں بہت بڑھی ہوئی ہیں، انہوں نے ہندوستان کے ایک حصے پر قبضہ بھی کر لیا ہے اور ان کی ایک جماعت ہندوستان پر باقاعدہ چھاپے مارتی رہتی ہے، اس صورت حال میں دہلی سے نکلنا اور دور دراز علاقوں کو فتح کرنے کے لئے دارالسلطنت کو محافظوں سے خالی کرنا بعید از دانش مندی ہے، اس وقت یہی مناسب ہے کہ اپنے ملک میں رہ کر سلطنت کو دشمنوں سے محفوظ رکھا جائے، نہ کہ نئے علاقے فتح کرنے کا ارادہ کیا جائے۔[1]

میواتی لٹیروں کا خاتمہ

مؤرخین تحریر کرتے ہیں کہ التمش کے جانشینوں کے زمانہ میں میواتیوں کی ایک جماعت دہلی کے آس پاس کے علاقے میں جنگلوں میں چھپ چھپا کر قتل و غارت کیا کرتی تھی، یہ لٹیرے راتوں کو لوگوں کے گھروں میں زبردستی گھس جاتے اور مال و اسباب اٹھا کر لے جاتے اور شہر کے آس پاس کی سراؤں کو تباہ اور برباد کرتے رہتے تھے، سوداگر اور تجارت پیشہ لوگ بھی ان لٹیروں کی دست برد سے محفوظ نہ تھے، ان کے خوف کی وجہ سے شہر کے دروازے مغرب کے وقت بند کر دئے جاتے تھے، نماز عصر کے بعد کسی شخص کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ وہ قبرستان تک جائے، بلبن کو جب میواتیوں کی اس لوٹ مار اور رعایا کی مصیبتوں کا حال معلوم ہوا تو اس نے اس مفسد گروہ کے قتل کو حکومت کے بقیہ تمام کاموں پر مقدم رکھا، اور ان سفاکوں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے دہلی سے روانہ ہوا، بلبن نے ان میواتیوں کو گھیر لیا، اور تقریباً ایک لاکھ ظالموں کو موت کے گھاٹ اتارا، اس کے بعد بلبن نے اس جنگل کو جس میں یہ لٹیرے رہا کرتے تھے بالکل صاف کروا دیا اور زمین کو زراعت پیشہ لوگوں میں تقسیم کر دیا، بلبن نے اس مقام پر سپاہیوں کی چند چوکیاں بھی مقرر کیں اور ان چوکیوں کی حفاظت کے لئے اپنے کچھ معتبر سرداروں کو وہاں چھوڑ کر واپس دہلی آیا۔[2]

بلبن کا محبوب ترین بیٹا سلطان محمد خان شہید

سلطان غیاث الدین بلبن کے دو بیٹے تھے، بڑے بیٹے کا نام محمد سلطان خان شہید اور چھوٹے کا نام بغرا خان تھا، خان شہید ملتان کا حاکم تھا اور بغرا خان لکھنوتی[3] کا حاکم تھا، محمد سلطان خان شہید یہ

---

۱ تاریخ فرشتہ اول ص ۲۸۴ ۲ ایضاً ص ۲۸۵ ۳ بنگال

شہزادہ غیاث الدین بلبن کا محبوب ترین بیٹا تھا، وہ تمام عمدہ صفات اور پسندیدہ عادات جو ایک شہزادے میں ہونی چاہئیں خان شہید میں موجود تھیں، یہ شہزادہ عقل و خرد اور ہنر پروری میں بلا شبہ اپنے زمانہ کا بہترین آدمی تھا، اس کی محفل میں ہمیشہ نامی گرامی علماء، فضلاء اور بڑے بڑے شاعر شرکت کرتے تھے اور وہ اپنے ہمدردوں اور بہی خواہوں سے ہمیشہ لطف و کرم سے پیش آتا تھا، امیر خسرو اور خواجہ حسن جیسی مقدس ہستیاں اسی شہزادے کی محفل کی رونق تھیں، ان دونوں بزرگوں نے خان شہید کی ملازمت میں ملتان میں پورے پانچ سال بسر کئے، خان شہید ان دونوں کی سب سے زیادہ عزت اور حوصلہ افزائی کرتا تھا، یہ شہزادہ اس قدر مہذب اور سلیقہ مند تھا کہ اگر تمام شب و روز کسی محفل میں بیٹھتا تو تب بھی اپنا زانو او نچا نہ کرتا تھا، خان شہید کی محفل میں ہمیشہ علمی چرچے رہتے تھے اور وہاں خاقانی، انوری، مولانا نظامی اور امیر خسرو کا کلام پڑھا جاتا تھا، خان شہید ہر شعر کو پوری طرح سمجھتا تھا اور اس کے مناسب داد دیتا تھا، بڑے بڑے اساتذہ اور سخن فہم اس کی سخن فہمی کے قائل تھے، امیر خسرو نے ایک بار فرمایا میں نے سخن فہمی، نکتہ رسی، پختگی ذوق صحیح اور تمام نئے پرانے شعراء کے اشعار یاد رکھنے میں خان شہید جیسا فاضل شخص کوئی اور نہیں دیکھا۔[1]

محفلِ وجد و حال

جس زمانہ میں خان شہید کا قیام ملتان میں تھا، اس زمانہ میں شیخ عثمان ترمذیؒ جو اپنے دور کے بہت بڑے عالم اور عارف کامل تھے، اتفاق سے ملتان تشریف لائے، خان شہید نے شیخ صاحب کی بہت تعظیم کی اور خاطر تواضع کی، ان کی خدمت میں نذرانہ اور ہدیہ پیش کیا، اور بڑی عاجزی سے ان سے ملتان میں قیام کرنے کی درخواست کی اور کہا اگر آپ یہاں قیام کرنا پسند فرمائیں گے تو حکومت کے خرچ سے ایک خانقاہ تعمیر کروادی جائے گی، لیکن شیخ صاحب نے ملتان میں مستقل رہائش کو ناپسند کیا اور واپس چلے گئے، جن دنوں شیخ صاحب ملتان میں تھے اور حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے صاحبزادے اور جانشین حضرت شیخ صدر الدین عارف کے ساتھ خان شہید کی محفل میں تشریف رکھتے تھے، اس محفل میں عربی اشعار پڑھے جاتے تھے، اتفاق سے کوئی ایک شعر سن کر ان بزرگوں پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی اور ان کے ساتھ ساری محفل کھڑی ہوگئی، خان شہید نے بھی اہلِ محفل کا ساتھ دیا اور دست بستہ کھڑا ہو گیا جب

[1] تاریخ فرشتہ ص ۲۸۹

تک ان بزرگوں کو سکون نہ ہوا تو خان شہید کی حالت بھی اضطراری رہی اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری رہے۔[1]

شیخ سعدیؒ سے عقیدت

خان شہید کی بالغ نظری، عقل مندی اور قدر شناسی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے دو مرتبہ ملتان کی امارت کے زمانے میں اپنے قاصد بیش قیمت اور اعلیٰ تحائف کے ساتھ شیراز روانہ کئے اور حضرت شیخ مصلح الدین سعدیؒ سے درخواست کی کہ آپ یہاں تشریف لا کر ہمیں نوازیں، آپ کے لئے ملتان میں ایک خانقاہ تعمیر کروادی جائے گی اور اس کے مصارف کے لئے چند گاؤں وقف کر دیئے جائیں گے، چونکہ شیخ سعدیؒ ضعیف العمری کی وجہ سے بہت کمزور ہو چکے تھے، اس لئے انہوں نے دونوں مرتبہ ملتان آنے میں عذر کیا، لیکن ہر بار اپنے ہاتھ سے اپنے اشعار اور غزلیات لکھ کر خان شہید کی خدمت میں بطور تحفہ روانہ کئے اور امیر خسرو کی سفارش فرمائی، ملتان کی امارت کے زمانے میں خان شہید کا یہ معمول تھا کہ وہ ہر سال بہت سے گراں بہا اور نادر تحائف لے کر اپنے باپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور چند روز دہلی میں قیام کر کے واپس چلا جاتا۔[2]

خان شہید کی دہلی میں آمد

حسبِ معمول خان شہید اپنے باپ سے ملاقات کرنے کے لئے ملتان سے دہلی آیا، بلبن اپنے بیٹے کی آمد اور اس کی سعادت مندی سے خوش ہوا، اور اُسے شفقتِ پدرانہ سے مسرور و محظوظ کیا، خان شہید نے تین ماہ تک دہلی میں قیام کیا، اسی زمانہ میں مغلوں کی ہنگامہ آرائیوں کی خبریں پہنچیں، جب خان شہید ملتان جانے کے لئے تیار ہوا تو بلبن نے تنہائی میں اسے بلا کر کہا کہ میری زندگی کا بہت بڑا حصہ بادشاہت اور حکومت کے کاموں میں گزرا ہے، اس وجہ سے میرے تجربات کا دائرہ وسیع ہے، میں چاہتا ہوں کہ تجھے کچھ ایسی نصیحتیں کروں جن پر عمل کرنا ہر حکمران کا فرض ہے، یہ نصیحتیں میرے بعد تجھے بہت کام آئیں گی۔[3]

[1] تاریخ فرشتہ اول ص ۲۹۰ [2] تاریخ فرشتہ اول ص ۲۹۰ [3] تاریخ فرشتہ اول ص ۲۹۶

Scanned by CamScanner

بلبن کی خان شہید کو نصیحتیں

(۱) تم اپنی عظمت اور حکومت کی شان کو پوری توجہ کے ساتھ برقرار رکھنا، اپنی نفسانی خواہشوں کی تکمیل کے لئے بادشاہی کی قوت کو کبھی کام میں نہ لانا، تمہیں جو کام بھی کرنا ہو وہ خدا کے لئے کرنا، اور شاہی خزانوں اور دفینوں کو جو در اصل عطیۂ خداوندی ہیں ہمیشہ اچھے کاموں میں صرف کرنا اور خلقِ خدا کی بھلائی کی طرف توجہ کرنا، دین کے دشمنوں کو پنپنے نہ دینا اور ان کی سرکوبی بڑی اچھی طرح کرنا، تاکہ وہ ہمیشہ ذلیل وخوار رہیں۔

(۲) جب خدا تعالیٰ تمہیں مخلوق کی سرداری اور بادشاہت عطا کرے تو اس منصب کو آسان نہ سمجھنا، فرائض حکمرانی کو خدا کی نیابت سمجھنا اور یہ بہت مشکل چیز ہے، تم اس پاک اور بڑے کام کو ناشائستہ حرکات اور ناپسندیدہ عادات کی گندگی سے آلودہ نہ کرنا، کمینے اور رزیل لوگوں کی صحبت سے دور بھاگنا۔

(۳) تم اپنے ملک کے حالات اور اپنے مقرر کردہ حاکموں کے افعال سے پوری طرح باخبر رہنا، اور ان حاکموں کو ہمیشہ یہ تاکید کرنا کہ وہ بہترین افعال اور اعلیٰ عادات اختیار کریں۔

(۴) ہمیشہ متقی اور پرہیزگار لوگوں کو قاضی اور حاکم مقرر کرنا، تاکہ رعایا انصاف اور دین داری کی برکتوں سے مستفید ہوتی رہے۔

(۵) جاہ وحشمت اور شاہی رعب وداب اور بادشاہت کے تمام آداب ولوازمات کا خلوت وجلوت میں ہر جگہ خیال رکھنا اور کسی وقت بھی عیش کوشی اور بے کار کاموں میں مصروف نہ ہونا۔

(۶) پاک طینت اور عالی ہمت لوگوں کو ہمیشہ انعام واکرام سے مالا مال کرنا اور ان کی دل جوئی اور خاطرداری پوری طرح کرنا، عقل مندوں اور اہلِ ہنر کی مدد اور ہمت افزائی کرتے رہنا، لالچی اور بے رحم لوگوں سے کبھی کسی بھلائی کی توقع نہ رکھنا، کیونکہ ملک اور مذہب کی بہتری اسی میں ہے کہ یہ لوگ سلطنت کے انتظامی امور سے علیحدہ رہیں۔

(۷) عالی ہمتی اور بادشاہت دونوں ایک دوسرے کے لئے ناگزیر ہیں، دنیا کے تمام عقلمندوں اور دانش وروں نے ان دونوں کو جڑواں بھائیوں سے تشبیہ دی ہے اور یہ کہا ہے کہ بادشاہ کی ہمت کو بھی تمام ہمتوں کا بادشاہ ہونا چاہئے، کیونکہ اگر بادشاہ کی ہمت اور عام لوگوں کی ہمت میں کوئی فرق نہ ہوگا تو پھر بادشاہ اور عام لوگوں میں بھی کوئی فرق باقی نہیں رہے گا، بے ہمتی اور بادشاہت کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔

(۸) جس شخص کی تم ایک بار عزت کرواُسے چھوٹی سی خطا پر کبھی ذلیل نہ کرنا، اپنے ہمدردوں اور مخلصوں کو سوائے کسی ملکی ضرورت کے کبھی رنجیدہ نہ کرنا، اور اپنے سلوک سے دشمنوں کو دوست بنانے کی کوشش کرنا، اگر کسی دشمن کو سیاست کے پنجے میں گرفتار کرنا ہو تو نرمی اور عاقبت اندیشی کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھنا، شرفاء کو تکلیف واذیت دینے میں عجلت سے کام نہ لینا، اس لئے کہ ایسے لوگوں کی بے عزتی کا زخم آسانی سے نہیں بھرتا اور پھر اس کی تلافی مشکل ہو جاتی ہے۔

(۹) بدزبان لوگوں پر کبھی اعتبار نہ کرنا اور اُن سے زیادہ تعلقات نہ بڑھانا، کیونکہ ایسے لوگوں کا اعتبار کرنے اور ان سے تعلقات رکھنے کی وجہ سے اطاعت گزار اور فرماں بردار غلاموں اور ہمدردوں میں خوف وہراس پیدا ہو جاتا ہے اور حکومت کے کاموں میں خلل پیدا ہوتا ہے، جس کام کے پورا ہونے میں تمہیں شبہ ہو اس میں کبھی ہاتھ نہ ڈالنا، کیونکہ کسی کام کو ادھورہ چھوڑ دینا بادشاہوں کے لئے بڑی ذلت اور رسوائی کا باعث ہوتا ہے۔

(۱۰) عقل مندوں اور دانش وروں کے مشورے کے بغیر کسی کام کو پورا کرنے کی کوشش نہ کرنا، بادشاہ کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ وہ رعایا کی اچھی، بُری بات سے واقف ہو، اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہر معاملہ میں وہ اعتدال سے کام لے، نیز غصہ کی تیزی نہ دکھائے، کیونکہ ایسے بادشاہوں سے لوگوں کو نفرت ہو جاتی ہے، سستی اور غیر ضروری نرمی کو بھی پاس نہ پھٹکنے دیں، کیونکہ اس سے سرکشوں اور باغیوں کی ہمت بڑھتی ہے، اور رعایا بدامنی کا شکار ہو جاتی ہے، ہر وقت اپنی حفاظت کرتے رہنا چاہئے، کیونکہ بادشاہ کی جان رعایا کے لئے ڈھال کا کام کرتی ہے اور اُسے ہر طرح کے مصائب سے بچاتی ہے، اپنے دروازے پر ہمیشہ مخلص اور قابل اعتبار پاسبانوں کو مقرر کرنا، اپنے چھوٹے بھائی سے ہمیشہ محبت اور نرمی کا سلوک کرنا اور اسے اپنا دست وبازو سمجھنا، اس کی جاگیر کو اسی طرح بحال رکھنا اور کسی کے چغلی کھانے پر اس کے خلاف کسی قسم کی کوئی کارروائی نہ کرنا[1] (تلک عشرۃ کاملۃ)

تیمور خان کا حملہ

بلبن نے اپنے بیٹے کو یہ نصیحتیں کرکے رخصت کیا، خان شہید نے ملتان پہنچ کر بے شمار مغل ڈاکوؤں کو جو سرحدی مقامات پر لوٹ اور غارت گری کا بازار گرم کیا کرتے تھے تہ تیغ کرکے اپنا ملک ان کے قبضہ سے نکال لیا، انہی دنوں ایران کے تختِ حکومت پر ارغوں خان بن اباق خان بن ہلاکو خان

[1] تاریخ فرشتہ اول ص ۲۹۸

Scanned by CamScanner

بیٹا تھا، اور نامی گرامی چنگیزی امیر تیمور خان جو قندھار، ہرات، بلخ، بدخشاں، غزنی اور بامیاں وغیرہ کا حاکم تھا۔ (اپنے ان عزیزوں اور ہم قوموں کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے جو خان شہید کے مقابلہ میں مارے گئے تھے) ملتان کی طرف بڑھا، خان شہید نے جب تیمور خان کی آمد کی خبر سُنی تو اس نے صبح سویرے ملتان سے کوچ کیا اور آب لاہور کے کنارے جو ملتان میں بہتا ہے دوپہر کے وقت تیمور خان سے جنگ کا ارادہ کیا۔

شہزادہ سلطان محمد (خان شہید) کی شہادت

جنگ میں خان شہید کی فوج نے اپنی جاں بازی کے جوہر دکھائے اور چند نامی گرامی مغل سرداروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور تیمور خان کو شکست دی، جب مغل سپاہی میدانِ جنگ سے بھاگ نکلے تو ہندوستانیوں کی فوج نے بڑی عاقبت نااندیشی اور انجام فروشی کے ساتھ اِن مفرور سپاہیوں کا تعاقب کیا، سلطان محمد کا آخری وقت قریب آچکا تھا، اس خوش فطرت شاہزادے نے ظہر کی نماز کے لئے دریا کے کنارے جائے نماز بچھائی، اور اپنے پانچ سو سپاہیوں کے ساتھ نماز میں مشغول ہو گیا، اسی اثنا میں دو ہزار سپاہیوں کا ایک دستہ جو کمین گاہوں میں چھپا ہوا تھا موقع پا کر نکلا اور اس نے خان شہید پر حملہ کر دیا، خان شہید نے اپنے سپاہیوں کو لے کر مقابلہ کیا، اگرچہ خان شہید کے لشکری اور سواری کے گھوڑے تھکن سے چور چور ہو رہے تھے، لیکن خان شہید معرکہ آرائی پر مجبور ہو گیا، قبل اس کے کہ مغل شکست کھا کر میدان جنگ سے فرار ہوتے، اتفاق سے ایک جاں گداز تیر خان شہید کو آکر لگا اور اسی سے ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی، اس کے بعد مغل سپاہی بڑی تیزی سے بھاگ کھڑے ہوئے [1]

بلبن کی بیماری اور اس کی وفات

غیاث الدین بلبن کی عمر اسی[80] سال ہو چکی تھی، خان شہید کی دائمی مفارقت سے اس کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی، اگرچہ بظاہر یہی کہتا تھا کہ میں راضی برضا ہوں، لیکن وہ تنہائی میں راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اپنے محبوب اور ولی عہد بیٹے کو یاد کرتا تھا اور زار و قطار روتا تھا، جب بلبن چند روز کا مہمان رہ گیا تو اس

[1] تاریخ فرشتہ ص ۲۹۹

نے نامی گرامی وزراء کو بلا کر اپنا ولی عہد خان شہید کے بیٹے کیخسرو کو نامزد کیا اور امراء کو وصیت کی، اس واقعہ کے تیسرے دن ۶۸۵ھ مطابق ۱۲۸۶ء کے آخر میں بلبن نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا، اس نے بائیس سال تک حکومت کی، غیاث الدین بلبن کی خوش نصیبی کہ اس کے عہد حکومت میں شیخ فریدالدین شکر گنج، شیخ الشیوخ خواجہ نظام الدین اولیاء، اور بہاء الدین زکریا ملتانی" کے صاحب زادے شیخ صدر الدین عارف، شیخ بدر الدین غزنوی خلیفۂ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور سیدی مولا جیسے بزرگاں، صاحب حال درویشانِ کامل اپنے فیض سے ہندوستان کی سرزمین کو سیراب کر رہے تھے [1]

ارادے جن کے پختہ ہوں، نظر جن کی خدا پر ہو
تلاطم خیز موجوں سے وہ گھبرایا نہیں کرتے

سلطان معز الدین کیقباد

غیاث الدین بلبن کے انتقال کے بعد امیروں اور ارکانِ سلطنت وغیرہ نے مل کر خان شہید کے بیٹے کیخسرو کو محروم کر کے بغرا خان کے بیٹے کیقباد کو بلبن کا جانشین بنا دیا تھا، یہ بھی بلبن کا پوتا تھا، تخت نشینی کے وقت کیقباد کی عمر اٹھارہ[18] سال تھی، اس نے بڑی موزوں طبیعت پائی تھی اور وہ نکتہ رسی، سخن فہمی اور بہت سی عمدہ صفات کا مجموعہ تھا۔

عیش کوشی

پیدائش سے لے کر تخت نشینی کے وقت کیقباد کی پرورش بلبن کی نگرانی میں ہوئی تھی اور اس کا سارا وقت تحصیل علم ہی میں صرف ہوا تھا، نیک طبیعت اور بااخلاق استادوں، اچھی عادتیں رکھنے والے ندیموں کے ساتھ اس کا وقت گزرتا تھا اور یہ لوگ کیقباد کے ہر کام کی نگرانی کرتے تھے، جب قسمت نے کیقباد کو شہزادگی سے فرماں روائی کے درجے تک پہنچا دیا تو وہ نگرانی کی ہر طرح کی قیدوں سے آزاد ہو گیا، اور اس نے بڑی فراخ دلی سے عیش کوشی اور نفس پرستی میں اپنا وقت ضائع کرنا شروع کر دیا، ان کاموں میں وہ اس طرح مصروف ہو گیا کہ اسے نفس پرستی کے سوا اور کوئی بات یاد نہ رہی، گویّوں، مسخروں،

[1] تاریخ فرشتہ اول ص ۳۰۰

Scanned by CamScanner

شرابیوں اور عیش پرستوں کے اقبال کا ستارہ بلند ہو گیا اور گلی گلی، کوچے کوچے گانے بجانے، ناچ، رنگ برنگ کی محفلیں جمنے لگیں، بادشاہ کا یہ عالم دیکھ کر "الناس علی دین ملوکھم" (یعنی لوگ بادشاہ کے طریقے پر ہوتے ہیں) کے مصداق پر امیر اور دولت مند عیش و عشرت اور بادہ خواری کے گرویدہ ہو گئے، شہر کے بوڑھے، بچے اور جواں سب ہی ایک ہی رنگ میں رنگ گئے اور دہلی کے ہر گوشے سے غزل خوانی کی شیریں آوازیں آنے لگیں، شرعی قوانین کی کوئی پرواہ نہ تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہیں شراب کے سیلاب میں بہادیا گیا ہے، حالت یہاں تک پہنچی کہ قاضی اور محتسب جیسے لوگ بھی ان اعمال خبیثہ میں مبتلا ہو گئے، شاہی دربار میں مسخروں اور گویّوں کے سوا کوئی اور نظر نہ آتا تھا۔

بے راہ روی اور بیماری

حکمران اور رعایا دونوں ہی اپنے انجام سے بے خبر ہو کر دادِ عیش دینے لگے، سب کی آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑ گئے، چند دن اسی عالم میں گزرے، شراب نوشی اور عیش کوشی کی کثرت کی وجہ سے بادشاہ کی صحت کو نقصان پہنچا اور وہ کمزور اور نحیف ہو کر بستر مرگ پر پڑ گیا، اور اسی عالم میں موقع دیکھ کر کسی نے قتل کر دیا، اور لاش کو دریائے جمنا میں بہادیا، یہ واقعہ ۶۸۷ھ مطابق ۱۲۸۸ء کے آخر میں پیش آیا، کیقباد نے تین سال سے کچھ زائد حکومت کی، کیقباد کے انتقال کے بعد سلطنت غور کے ترکی زاد غلاموں کے ہاتھ سے نکل کر خلجیوں کے قبضے میں آگئی [1]

(خاندان خلجی)

سلطان جلال الدین خلجی

جب غوری فرماں رواؤں اور ان کے پروردہ غلاموں نے ہندوستان فتح کیا تو خلجیوں کے گروہ کے گروہ ہندوستان آ کر شاہی ملازمتیں اختیار کرنے لگے، ان خلجیوں میں سے بعض افراد نے بہت اقتدار اور رسوخ حاصل کیا، اور وہ شاہی امراء اور اراکین سلطنت کے معزز عہدوں تک پہنچے، ان مقتدر امراءِ خلجی میں سلطان جلال الدین بھی تھا، تخت نشینی کے وقت اس کی عمر ستر (۷۰) سال تھی، گذشتہ حکمرانوں کے دستور العمل کے خلاف جلال الدین نے ظلم و شقاوت سے کنارہ کشی اختیار کر کے لطف و کرم کو اپنا

[1] تاریخ فرشتہ اول ص ۳۱۳

شعار بنایا، ان صفات کو اس نے پوری طرح اپنایا اور زندگی بھر کسی کو تکلیف نہ پہنچائی اور اس نے اپنا مستقر کیلوکھری کو بنایا، اور ان عمارتوں کو جن کی تعمیر کیقباد نے شروع کروائی تھی مکمل کروایا۔

قدیم دہلی میں ورود

جب جلال الدین کے لطف و کرم کی عام شہرت ہوئی، اور یہ فرماں رواں اپنی اعلیٰ خصوصیات کی بنا پر لوگوں میں ہر دل عزیز ہو گیا، سب نے بڑے خلوص، عقیدت اور محبت کے ساتھ جلال الدین کے ہاتھ پر بیعت کی اور اس کے ہمدردوں میں شامل ہو گئے، جب جلال الدین نے یہ دیکھا کہ عام و خاص سب ہی لوگ مطمئن ہیں اور ہر طرف امن و امان کا دور دورہ ہے تو وہ کیلوکھری کا محل چھوڑ کر قدیم دہلی میں آیا، جب وہ دہلی کے بادشاہی محل کے قریب پہنچا تو اس نے دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی اور دہلی کے بادشاہوں کے تخت پر رونق افروز ہوا، تختِ شاہی پر بیٹھ کر جلال الدین نے بلند آواز سے کہا کہ "میں سوچتا ہوں کہ خداوند تعالیٰ کا شکر کس طرح ادا کروں، ایک وہ دن تھا کہ جب میں اسی تخت کے سامنے زمین بوس ہو کر ہاتھ باندھے کھڑا رہتا تھا، اور آج خود اس تخت پر بیٹھا ہوں، اور بہت سے میرے عزیز اور ہمدرد جو ہر لحاظ سے مجھ سے بہتر ہیں دست بستہ میرے سامنے کھڑے ہوئے ہیں۔" تخت شاہی پر تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد جلال الدین نے غیاث الدین بلبن کے خاص محل "کوشک لعل" کا رخ کیا، سلطان جلال الدین سے امراء نے کہا کہ یہ کوشک لعل آپ کا شاہی محل ہونا چاہئے اور اسی میں آپ کو قیام کرنا چاہئے، یہ سن کر جلال الدین نے کہا کہ سلطان مرحوم غیاث الدین بلبن نے اپنی ذاتی ملکیت سے یہ محل تیار کروایا ہے، لہٰذا یہ غیاث الدین کے ورثاء کی ملکیت ہے، مجھے شرعاً اس کے قبضے کا کوئی حق نہیں ہے، اس کے بعد جلال الدین کوشک میں داخل ہوا، اس محل کے ایسے مقامات پر جہاں غیاث الدین بلبن بیٹھتا تھا، جلال الدین نے حفظِ مراتب کے پیشِ نظر وہاں پاؤں نہ رکھا، بلکہ اسی چبوترے پر بیٹھا جس پر بلبن کے زمانہ میں امراء اور اراکین سلطنت بیٹھا کرتے تھے، جلال الدین نے اپنے امراء کو مخاطب کر کے کہا باوجود اس تزک و احتشام رعب و داب، کثرت امراء و ملازمین کے سلطان غیاث الدین کے ساتھ سلطنت نے وفا نہ کی اور اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی اس کی اولاد تباہ و برباد ہو گئی تو میرے بعد میری اولاد کا کیا حشر ہوگا، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میرے وارث کیا کریں گے اور زمانہ ان کے ساتھ اچھی طرح پیش آئے گا یا نہیں؟ بادشاہ کی اس تقریر سے بیش تر حاضرین جو دانش مند اور تجربہ کار تھے بہت متاثر ہوئے اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب پھوٹ پڑا۔

Scanned by CamScanner

جلال الدین کی شخصیت اور کردار

جلال الدین بہت ہی نیک طبیعت، خوش اخلاق اور پسندیدہ عادات رکھتا تھا، جس کسی کو ایک بار جاگیر عطا کرتا تھا تو پھر اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کرتا تھا، امراء اور ارکینِ سلطنت سے اگر کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تو بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ معاف کر دیتا، خطا کاروں کو کبھی ذلیل و رسوا نہ کرتا، ظالم و شقی بادشاہوں کی طرح لالچ، ظلم اور سختی سے اُسے کوئی لگاؤ نہ تھا۔

باغی حاکم کے ساتھ معرکہ آرائی

سلطان جلال الدین خلجی کی تخت نشینی کے دوسرے سال "ملک چھجو[1]" جو "کڑہ" کا حاکم تھا، اس نے بغاوت کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور ایک بڑا لشکر لے کر دہلی کی طرف مقابلہ کے لئے روانہ ہوا، جب جلال الدین خلجی کو اس کا علم ہوا تو اس نے اپنے بڑے بیٹے[2] کو لشکر لے کر مقابلہ کرنے کے لئے روانہ کیا، بالآخر دونوں لشکروں میں معرکہ آرائی ہوئی، شاہی لشکر کامیاب ہوا اور ملک چھجو اور دیگر بڑے امراء کو قید کر کے جلال الدین خلجی کے پاس دہلی بھیج دیا، جب یہ قیدی جلال الدین کے سامنے پیش ہوئے تو ان کا برا حال دیکھ کر بادشاہ کو رحم آیا اور ان کے ساتھ خاطر مدارات کا برتاؤ کیا اور سب کو رہا کر دیا، ملک چھجو کو اس کے بال بچوں سمیت ملتان کے مر... کے پاس بھیج دیا اور ہدایت کر دی کہ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے۔

سلطان جلال الدین کی باغیوں کے ساتھ رحم دلی کا معاملہ دیکھ کر امراء نے کہا کہ باغیوں کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ مناسب نہیں ہے، اگر ان کو سزا دی جاتی تو دوسروں کو عبرت ہوتی، اس کے بجائے ان کے ساتھ ہمدردانہ برتاؤ اور خاطر مدارات دوسروں کے لئے ہمت افزائی کا باعث ہوگی۔
جلال الدین نے ان امراء کو جواب دیا کہ تم لوگوں نے جو کچھ کہا وہ بالکل درست ہے، لیکن میں کسی مسلمان کے خون سے اپنے ہاتھوں کو رنگنا نہیں چاہتا، اس وقت میری عمر ستر (۷۰) سال کی ہے، آج تک میں نے کسی مسلمان کی جان نہیں لی، تو بھلا اس عمر میں کیسے یہ کام کروں، اگر میں ان لوگوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا ہوتا اور یہ مجھے قتل کر دیتے تو قیامت کے روز اِن لوگوں کو جواب دینا پڑتا، نہ کہ مجھے، میں نے کئی سال غیاث الدین بلبن کا نمک کھایا ہے، اب اس کے امراء اور وارثوں کو قتل کرنا مجھے زیب

[1] ملک چھجو غیاث الدین بلبن کا بھتیجا تھا۔ [2] بیٹے کا نام ارکلی خان تھا۔

نہیں دیتا، اور یہ فعل میری نمک حرامی کی دلیل نہ ہوگا، الغرض جلال الدین نے اپنے امراء کی گفتگو کا کوئی اثر نہیں لیا، اور ان سے یہ درویشانہ باتیں کر کے انہیں رخصت کر دیا، اور یہ امیر بوڑھے اور رحم دل بادشاہ کی بے موقع نرمی سے رنجیدہ ہو کر اسے دل ہی دل میں برا بھلا کہتے ہوئے رخصت ہو گئے۔
دانش مندوں نے کہا ہے کہ سلطنت و حکومت کی بنیاد دو چیزوں پر ہے، ایک نرمی دوسرے قہر، ان دونوں میں سے اگر کسی ایک میں کمی ہوتی ہے تو سلطنت زوال پذیر ہو جاتی ہے۔[1]

المجاہد فی سبیل اللہ کا لقب

جلال الدین کی نیک طبعی اور پاک نفسی کی طرح طرح کی حکایات مشہور ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک بار جلال الدین کے دل میں خیال آیا کہ اس نے غیر مسلم مغلوں کے ساتھ بارہا جنگ کی ہے، اور مسلمانوں کو ان کے ظلم و تعدی سے بچایا ہے، اس لئے اگر مساجد کے امام منبر پر اُسے "المجاہد فی سبیل اللہ" کے لقب سے یاد کریں تو کچھ نامناسب نہ ہوگا، اس خیال کے پیش نظر ایک روز جلال الدین نے اپنی بیوی ملکۂ جہاں سے کہا جب کسی مبارک باد کے موقع پر علماء اور قاضی یہاں حاضر ہوں تو ان کے پاس کسی آدمی کو بھیج کر کہنا کہ جمعہ کے خطبوں میں وہ مجھے "المجاہد فی سبیل اللہ" کے لقب سے یاد کریں، مہینے کی پہلی تاریخ کو جب یہ قاضی اور علماء کی جماعت بادشاہ کی دست بوسی کے لئے حاضر ہوئی تو علماء کے سردار قاضی فخر الدین نے بادشاہ سے درخواست کی کہ ہم تمام علماء، قاضیوں اور مفتیوں کی یہ خواہش ہے کہ چونکہ آپ نے بارہا غیر مسلموں کے ساتھ جنگ کی ہے، اس لئے آپ کے نام کے ساتھ خطبوں میں "المجاہد فی سبیل اللہ" کا اضافہ کر دیا جائے، بادشاہ اس درخواست کو سن کر رونے لگا، اور اس نے کہا کہ "ملکۂ جہاں" کو میں نے ہی اس طرف متوجہ کیا تھا، اور اس نے میرے ہی ایماء پر آپ سے یہ درخواست کی تھی، لیکن ملکۂ جہاں سے بات کرنے کے بعد میں نے اپنے ارادے پر غور کیا تو مجھے بڑی ندامت ہوئی، میں اپنے آپ کو ہرگز ہرگز اس لقب کا مستحق نہیں سمجھتا، میں نے اب تک جتنی بھی جنگیں کی ہیں، ان میں کوئی جنگ ایسی نہ تھی کہ جو خداوند تعالیٰ کی رضا جوئی، شوقِ شہادت یا کلمۂ اسلام کو بلند کرنے کے لئے کی گئی ہو، میں نے یہ لڑائی اس مقصد کیلئے سر کی کہ میری شہرت میں اضافہ ہو، اور میرا آقا غیاث الدین بلبن مجھ پر زیادہ سے زیادہ اعتبار کرے اور عزیز رکھے، علماء کرام نے ہر چند جلال الدین

[1] تاریخ فرشتہ اول ص ۳۲۰

کے شکوک کو رفع کرنے کی کوشش کی، اور مذکورہ بالا لقب کے استعمال کی اجازت طلب کی، لیکن جلال الدین نے ان کی ایک نہ سنی، اور یہ لوگ مایوس ہو کر واپس لوٹ آئے۔[1]

مغلوں کا حملہ

۶۹۱ھ میں ہلاکو خان کے ایک رشتہ دار نے ایک لشکرِ جرار ہمراہ لے کر ہندوستان پر حملہ کیا، جلال الدین کو جب اس کا علم ہوا تو وہ بھی ایک زبردست فوج لے کر دشمن کے مقابلہ کیلئے آگے بڑھا، اور ایک بڑے میدان میں جنگ کا آغاز ہوا، اس میں بے شمار لشکریوں کی جانیں تلف ہوئیں، خلجیوں نے بڑی بہادری سے کام لیا اور آخر کار انہی کو فتح نصیب ہوئی، بے شمار مغل سردار موت کے گھاٹ اتارے گئے، دو ہزار مغل سرداروں کو زندہ گرفتار کیا گیا، اس کے بعد باہم فریقین میں صلح صفائی ہو گئی، اور مغلوں کا لشکر اپنے ملک کو واپس چلا گیا اس واقعہ کے بعد چنگیز خان کا نواسہ جس کا نام "الغوخان" تھا، اپنے لشکر کے ساتھ مشرف باسلام ہوا، اور جلال الدین نے اپنی بیٹی اس کے نکاح میں دے دی، بعد ازاں بادشاہ نے اپنے بیٹے ارکلی خان کو ملتان، لاہور اور سندھ کا حکمران بنا دیا اور خود دہلی واپس آ گیا، "الغوخان اور اس کے ساتھیوں نے "نومسلموں" کے خطاب سے شہرت پائی، اور انہوں نے موضع غیاث پور کو جہاں حضرت شیخ نظام الدین اولیاء آرام فرما ہیں اپنا مستقر قرار دیکر اس مقام کو مغلپورہ کے نام سے موسوم کیا۔[2]

سلطان جلال الدین کی شہادت

جلال الدین خلجی کی نرمی اور خلق خدا کے ساتھ ہمدردی اور عفو و درگزر، بعضِ امراء کو یہ طرزِ حکومت راس نہیں آتا تھا اس لئے جلال الدین کے خلاف سازش شروع کر دی تھی، بالآخر چند مفسدوں نے موقع پا کر شہید کر دیا۔[3]

جلال الدین خلجی نے دنیا سے نیک نامی کے ساتھ داعی اجل کو لبیک کہا، اور یہ مفسدین قدرت کے انتقام سے نہیں بچ سکے، اور دونوں جہاں کا خسارہ ان کے حصہ میں آیا، جو شخص اپنے ہاتھوں سے برائی کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے، وہ ایک لمحہ کے لئے بھی آرام سے سو نہیں سکتا، ایسا آدمی سوئے ہوئے فتنے جگا کر اپنی دنیا اور آخرت دونوں ہی برباد کر لیتا ہے، جو جلال الدین کے قتل کی سازش میں شریک تھے بہت ہی

[1] تاریخ فرشتہ اول ص ۳۳۳ [2] تاریخ فرشتہ اول ص ۳۲۹ [3] - جلال الدین خلجی ۶۹۵ھ مطابق ۱۲۹۵ء میں شہید ہوا

جلد خونِ ناحق کی سزا میں بُری طرح موت سے ہم کنار ہوئے، اور دونوں جہاں کا خسارہ ان کے حصے میں آیا۔ سلطان جلال الدین خلجی نے سات سال سے کچھ زیادہ عرصہ تک حکومت کی۔

سلطان علاؤالدین خلجی

۶۹۵ھ مطابق ۱۲۹۵ء میں علاؤالدین خلجی (جو جلال الدین خلجی کا بھتیجا تھا) تخت نشین ہوا، اس کے بعد علاؤالدین نے اپنے بھائی الغ خان کے مشورے سے ان تمام امراء کی طرف توجہ کی، جنہوں نے لالچ اور طمع میں آکر جلال الدین خلجی کی اولاد سے بے وفائی کر کے اپنی عاقبت اور دنیا دونوں ہی خراب کر لی تھی، ایسے تمام نمک حرام امیروں کو گرفتار کیا گیا، بیشتر کی آنکھوں میں لوہے کی گرم سلائیاں پھیری گئیں اور بہت سوں کو مختلف قلعوں میں قید کر دیا گیا، اور ان تمام امیروں کے مال و دولت پر قبضہ کر کے تقریباً ایک کروڑ روپیہ شاہی خزانے میں جمع کیا گیا، جلال الدین خلجی کے دربار کے امراء میں سے کسی قسم کی باز پرس نہ کی گئی، کیونکہ ان امیروں نے جلال الدین خلجی کی اولاد کے ساتھ کوئی بے وفائی نہ کی تھی، اور نہ ہی علاؤالدین سے اس سلسلہ میں کوئی معاوضہ اور صلہ لیا تھا، یہ امیر زندگی بھر عزت اور شادمانی کے ساتھ وقت گزارتے رہے۔[1]

گجرات کی فتح

۶۹۷ھ مطابق ۱۲۹۷ء کی ابتداء میں علاؤالدین نے گجرات کی تسخیر کے لئے ایک لشکر روانہ کیا، اس نے نہروالہ پٹن اور گجرات فتح کر لیا، حاکمِ نہروالہ راجہ رائے کرن دکن کے حکمران راجہ رام دیو کے پاس پناہ گزیں ہوا۔ علاؤالدین خلجی کے امراء نے راجہ رائے کرن کی رانیوں (جن میں سب سے زیادہ قابل توجہ "کنولا دیوی" تھی) اور اس کے خزانے اور ہاتھیوں وغیرہ پر قبضہ کر لیا، گجرات میں ایک مشہور[2] بت تھا، جو سومنات کا ہم نام ہی نہیں ہم مرتبہ بھی سمجھا جاتا تھا، مسلمانوں نے اس بت کو یہاں سے اٹھوا کر دہلی بھجوا دیا تھا، تاکہ یہ آنے جانے والوں کے پاؤں کے نیچے آ کر پامال ہو، ان تمام امور سے فارغ ہونے کے بعد گجرات قابلِ اعتبار امیر کے سپرد کیا اور لشکر بطور غنیمت بے شمار زر و جواہر اور سامان لے کر

[1] تاریخ فرشتہ اول ص ۳۴۹ [2] تاریخ گجرات کی مشہور کتاب "مرآۃ احمدی" میں لکھا ہے کہ یہ مشہور بت سومنات ہی کا "بار" توڑا گیا تھا، جس کو پہلے محمود غزنوی نے پاش پاش کیا تھا، ہم نام سے دوسری جگہ کا سمجھ میں آتا ہے۔[12]

دہلی کی طرف روانہ ہوا، علاؤالدین نے رانی کنولا دیوی کو جو صورت اور اخلاق و عادات اور خوش گفتاری کی وجہ سے اپنا جواب آپ تھی، مسلمان کر کے اس کے ساتھ شادی کر لی۔

علاؤالدین کی خام خیالیاں

مؤرخین کا بیان ہے کہ علاؤالدین کی تخت نشینی کے تین۳ سال بعد تک اُسے اپنے بیش تر منصوبوں میں پوری پوری کامیابی ہوئی، اور بے شمار عورتوں کو حرم میں داخل کرنے کی وجہ سے اس کی اولاد میں بہت اضافہ ہوا، نیز گجرات کا ملک بھی اس کے قبضے میں آ گیا، سارا ملک علاؤالدین کے دشمنوں اور مدعیان سلطنت سے پاک وصاف ہو گیا، ان تمام کامیابیوں اور کامرانیوں کے بعد علاؤالدین کے دل میں طرح طرح کے عجیب وغریب خیالات آنے لگے، ان خیالات میں سے ایک خیال یہ بھی تھا کہ جس طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوت اور شوکت سے شریعت قائم کی، اور ان کے چاروں خلفاء نے اس شریعت کو مضبوط بنایا، اسی طرح اگر میں بھی اپنے چاروں امراء کی قوت اور سہارے کے بل پر ایک نیا مذہب جاری کروں تو پھر یقیناً روزِ قیامت تک میرا نام دنیا میں باقی رہے گا۔ علاؤالدین محفل میں اکثر وبیش تر اپنے اسی خبط کا ذکر کیا کرتا تھا، اور اپنے مصاحبوں سے مشورے کیا کرتا تھا کہ آخر کون سا طریقہ اختیار کرنا چاہئے کہ میرا جاری کیا ہوا نیا مذہب محدثین اور اہلِ علم کی نگاہ میں وقار حاصل کرے، اور ان کے حلقے میں یہ مروج ہو، علاؤالدین کا دوسرا خیالِ خام یہ تھا کہ شاہی خزانے میں بے شمار دولت ہے، اور ہاتھی، گھوڑوں وغیرہ کی بھی کثرت ہے، اس لئے علاؤالدین یہ چاہتا تھا کہ دہلی کی حکومت کسی قابل اعتبار امیر کے سپرد کر کے خود سکندر کی طرح ساری دنیا کو فتح کرنے کے لئے روانہ ہو جائے، اس کا ارادہ یہ تھا کہ سب سے پہلے خراساں، ماوراء النہر اور ترکستان فتح کر کے وہاں کے لوگوں کو اپنے (نئے) مذہب میں داخل کر لے، اور اس کے بعد دنیا کو فتح کرنے کا سلسلہ آگے بڑھائے، اور روم، فارس، عراق، عرب، عجم، شام اور حبش وغیرہ ممالک میں اپنی فتح کے جھنڈے گاڑ کر وہاں اپنے نئے مذہب کو مروج کرے اور سکندر کی طرح اپنی جہاں گیری و جہاں داری کا چرچا کرے، علاؤالدین جب کبھی ان خام خیالیوں کا تذکرہ اپنے امراء اور اراکین سلطنت سے کرتا تو وہ اس کی بدمزاجی اور درشت طبعی سے واقف ہونے کی وجہ سے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے، اور اس کے حسب منشا جواب دیتے، جب علاؤالدین کے لشکر نے دو لاکھ مغل جاں بازوں کی فوج کو جس کا سردار قتلق خان جیسا جری شخص تھا

شکست دے دی، تو علاؤالدین کا دماغ اور بھی عرش پر چڑھ گیا، اور اس کے غرور کی کوئی انتہا نہ رہی، اور اس نے حکم دیا کہ خطبوں میں اس کے نام کے ساتھ "سکندرِ ثانی" کے لقب کا اضافہ کیا جائے، سکوں اور ظروف پر بھی اس نے یہ لقب نقش کروایا اور ساری دنیا کو فتح کرنے اور نیا مذہب جاری کرنے کی خواہشیں تیز تر کر دیں، علاؤالدین جاہل محض تھا، اس کی ساری زندگی جاہل طبقوں میں بسر ہوئی تھی، لکھنے پڑھنے سے وہ بالکل نا آشنا تھا، اجڈ پن اور حیوانیت اس کی طبیعت کے جوہر تھے، اس لئے اہل مجلس اسے کبھی کوئی نصیحت بھی نہ کرتے تھے، جب بادشاہ اپنی مذکورہ خام خیالیوں کے بارے میں گفتگو کرتا تو بعض حاضرین اس وقت بالکل خاموش رہتے، اور بعض شوخ اور بے باک شرکاء مجلس اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہتے، یہ لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ بادشاہ کے اس قسم کے خیالات سودائے محض کے سوا کوئی اہمیت نہیں رکھتے، لیکن وہ پھر بھی علاؤالدین کی بہادری اور مستقل مزاجی کی تعریفوں کے پل باندھ باندھ کر اسے غلط فہمی میں مبتلا کرتے رہتے تھے، عام مسلمان اور بزرگانِ دین علاؤالدین کی اس قسم کی باتوں کو سن سن کر بہت رنجیدہ ہوتے تھے، یہ سب لوگ اور خاص طور پر حضرت سلطان نظام الدین اولیاءؒ و دیگر بزرگانِ دین بادشاہ کے لئے ان شیطانی خیالات سے نجات پانے اور مذہب اسلام پر ثابت قدم رہنے کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔

علاء الملک کوتوال کی دانشمندی

کوتوالِ دہلی ملک علاؤالدین عرف علاء الملک بادشاہ کی خدمت میں آداب بجالانے کے لئے حسب معمول حاضر ہوا تو علاؤالدین نے اس سے اپنے مذکورہ بالا دونوں خیالات کے بارے میں مشورہ کیا، علاء الملک سچا مسلمان اور مذہبی امور سے تھوڑا بہت واقف تھا، اس نے اپنے دل میں سوچا کہ اب موت کا وقت قریب ہے، چند روزہ زندگی کے لئے بادشاہ کی خوشی کی پروا کرنا اور کسی بات پر پردہ ڈالنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے، علاء الملک نے یہ بھی سوچا کہ اس وقت بادشاہ کے عتاب سے بالکل نہیں ڈرنا چاہئے، عمر کے آخری ایام میں اگر شہادت نصیب ہو گئی تو کچھ برا نہیں ہوگا، ان خیالات کے پیش نظر علاء الملک نے ہاتھ باندھ کر بادشاہ سے عرض کی "شریعت کا تعلق انبیاء کرام سے ہے، اور ان کی نبوت وحی آسمانی سے تعلق رکھتی ہے، نبوت کا منصب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکا ہے، اگر آپ نے کسی نئے مذہب کے اجراء کا اعلان کیا تو تمام مسلمان آپ کے خلاف ہو جائیں گے اور سارے ملک

Scanned by CamScanner

میں فتنہ وفساد کا دروازہ کھل جائے گا، میرے ناقص خیال میں یہی بہتر ہے کہ آپ اس قسم کا خیال ہرگز ہرگز دل میں نہ لائیں، کیونکہ اب کسی بھی انسان کے لئے اس منصب عظیم کا حاصل کرنا ناممکن ہے، حضور کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ چنگیز خاں اور اس کی اولاد نے سالہا سال تک مذہب اسلام کو نیست ونابود کرنے اور اپنے مذہب کو جو ہزاروں سال سے ترکستان میں رائج تھا جاری کرنے کی کوشش کی اور اس مقصد کے پیش نظر انہوں نے بے شمار مسلمانوں کو قتل کیا، لیکن انہیں اس سلسلہ میں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی، آخرکار مذہب اسلام کی راستی اور استحکام نے ان دشمنوں کے دل میں جگہ پیدا کی، اور ان کی پوری قوم مشرف باسلام ہوئی، اس دین کی عزت وحرمت کی خاطر ان لوگوں نے بارہا کافروں سے لڑائیاں کیں، علاؤالدین کوتوال کی یہ باتیں سن کر تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوگیا، اور پھر اس نے کہا تو نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل درست ہے، انشاء اللہ آئندہ میں کبھی اس قسم کی باتیں نہ کروں گا، لیکن میرے دوسرے خیال کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟

علاء الملک کوتوال نے جواب دیا کہ عالی جاہ آپ کا دوسرا خیال بالکل درست ہے، یہ معاملہ جو آپ کی بلند ہمتی اور اُولو العزمی کی وجہ سے آپ کے پیش نظر ہے، اس پر اکثر گذشتہ فرماں رواؤں نے بھی غور کیا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ بادشاہ کے لئے اپنی شخصی بہادری اور جرأت مندی خزانہ ولشکر کی مدد سے ہفت اقلیم کو فتح کرنا کچھ مشکل نہیں ہے، لیکن یہاں یہ بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب بادشاہ دارالسلطنت سے نکل کر دوسرے ممالک پر حملہ آور ہوگا، اور ایک طویل مدت تک غیر ممالک میں قیام کرے گا تو اس وقت ایسا کون سا بہادر امیر ہوگا جو بادشاہ کی عدم موجودگی میں حکومت کے فرائض انجام دے گا۔

اس کے علاوہ یہ مسئلہ بھی غور کے قابل ہے کہ جب بادشاہ کسی ملک کو فتح کرنے کے بعد وہاں کسی کو اپنا نائب مقرر کر کے خود دہلی یا دوسرے کسی ملک کی طرف روانہ ہوگا، تو اس کی عدم موجودگی میں ہوسکتا ہے کہ اس مفتوحہ ملک کا حاکم بادشاہ کی اطاعت گزاری سے منحرف ہوجائے، کیونکہ آج کا زمانہ سکندر کے عہد سے بہت مختلف ہے، سکندر کے زمانہ میں عہد شکنی، مکاری اور چال بازی وغیرہ کا رواج بہت کم تھا، اُس زمانہ کے لوگ اپنے وعدے کے پکے ہوتے تھے، اس کے علاوہ یہ حقیقت بھی مدنظر رہنی چاہیے کہ سکندر کے پاس ارسطو جیسا عالی دماغ اور دانش مند وزیر تھا، یہ ارسطو ہی کی دانش مندی اور عاقلانہ تدابیر کا نتیجہ تھا کہ ملک روم جیسی وسیع اور عظیم الشان سلطنت کے باشندے ہمیشہ سکندر سے خوش رہے اور اس کی اطاعت گزاری کو اپنا فرض سمجھتے رہے، سکندر کامل تیئس (۲۳) سال تک اپنے ملک سے باہر رہ کر اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کرتا رہا، لیکن اس کی غیر موجودگی کی وجہ سے نظامِ سلطنت میں کسی قسم کی کوئی خرابی پیدا نہ ہوئی۔ ساری دنیا کو فتح کرنے کی مہم سے فراغت پا کر جب سکندر اپنے ملک میں واپس پہنچا

تو اس نے ہر شخص کو پہلے کی طرح اپنا سچا اطاعت گزار پایا، اگر حضور کو بھی اپنی رعایا اور امراء پر ایسا ہی اعتماد ہے، جیسا کہ سکندر کو اپنی رعایا اور امراء پر تھا تو حضور پھر اپنے ارادے میں حق بجانب ہیں، اور اس سلسلہ میں آپ کی مخالفت کرنا کسی طرح بھی درست نہیں ہے، علاؤالدین نے اپنے ہم نام کوتوال کی تقریر بڑے غور سے سُنی اور کہا اگر میں ان رکاوٹوں کا خیال کروں جو تو نے بیان کی ہیں، تو پھر مجھے دنیا کے فتح کرنے کے ارادے کو ترک کرنا پڑے گا، اور میں صرف دہلی کی بادشاہت پر قناعت کر کے بیٹھا رہوں گا، اگر ایسا ہوا تو پھر میری یہ شان وشوکت، یہ غلام اور خادم، یہ بھرے ہوئے خزینے اور دفینے کس کام آئیں گے، اور ساری دنیا کو مسخر کرنے کی میری خواہش کس طرح پوری ہوگی؟

علاء الملک نے یہ بات سن کر بادشاہ کو جواب دیا کہ اس وقت حضور کے پیشِ نظر دو مہمات ایسی ہیں کہ جن پر آپ کے تمام جمع کے ہوئے خزانے کا صرف ہوجانا ممکن ہے، پہلی مہم تو یہ ہے کہ سرحدی علاقوں کے بعض شہروں کو فتح کیا جائے، جو باغیوں اور سرکشوں کے اڈے ہیں، تو ہندوستان ہر طرح کے فتنہ وفساد سے محفوظ ہوجائے گا، دوسری مہم مغلوں کے ہنگاموں کو فرو کرنے سے متعلق ہے، حضور کے لئے یہ مناسب بلکہ ضروری ہے کہ دیپالپور اور ملتان جیسے سرحدی شہروں کے قلعوں کو جو مغلوں کی لشکر کشی کے راستے میں سنگِ گراں کی حیثیت رکھتے ہیں، انہیں مضبوط اور مستحکم کیا جائے اور ہر وقت ان کی نگرانی کی جائے، ان دونوں عظیم الشان مہمات سے فارغ ہونے کے بعد حضور دارالسلطنت میں امن وآرام سے حکمرانی فرما سکتے ہیں، اور اپنے قابلِ اعتبار امراء کو عظیم الشان لشکروں کے ساتھ چاروں طرف دور دراز ممالک کی تسخیر کے لئے روانہ کر سکتے ہیں، تاکہ یہ امراء حضور کی جہاں کشائی کے جھنڈے گاڑ کر اپنا اور اپنے آقا کا نام روشن کریں، لیکن ان تمام مقاصد کو اسی وقت حاصل کیا جاسکتا ہے جب حضور شراب نوشی، عیش کوشی اور سیر وشکار وغیرہ کی طرف کم توجہ فرمائیں، اور تمام مہمات کی بذاتِ خود نگرانی کریں، سلطان علاؤالدین اپنے اس تجربہ کار اور سیاس امیر کی فکر انگیز تقریر سن کر بہت متاثر اور محظوظ ہوا، اور اس نے علاء الملک کے عقل وشعور کی بہت تعریف کی، نیز اُسے گراں قدر انعامات سے نوازا، بقیہ حاضرین مجلس بھی علاء الملک کی گفتگو سے خوش ہوئے اور ہر ایک نے کچھ نہ کچھ رقم بطور تحفہ اُسے دی، حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ نے بھی اس کے حق میں دعائے خیر کی۔[1]

---

[1] تاریخ فرشتہ اول ص ۳۵۲

بغاوتوں کو روکنے کی تدابیر

سلطان علاؤالدین خلجی ملک میں جابجا ہنگامہ خیزیوں سے تشویش میں مبتلا ہو گیا، اس لئے اس نے اپنے مخصوص معاملہ فہم امیروں سے یہ مشورہ کیا کہ ایسی کون سی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں جن پر عمل کرکے بغاوت و سرکشی کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کئے جائیں، ان امیروں نے جواب دیا کہ ہنگامہ خیزی اور بغاوت کا سبب عام طور پر چار چیزیں ہوا کرتی ہیں، جو یہ ہیں:۔

اول۔ بادشاہ کا رعایا سے بالکل بے خبر رہنا اور اس کی بھلائی یا برائی کی پرواہ نہ کرنا۔

دوم۔ ملک میں شراب نوشی کا عام رواج ہونا، شراب نوشی کی وجہ سے انسان کی نفسانی خواہشات میں شدت پیدا ہو جاتی ہے، اس میں بدخلقی کا مادہ ابھرنے لگتا ہے، انسان نشہ کی حالت میں اپنے آپ سے باہر نکل کر اپنی خواہشات کو تسکین پہنچانے کے لئے طرح طرح کی حرکات کرتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے ارادے سے واقف ہو جاتے ہیں، پھر ہم خیالی کی وجہ سے آپس میں مل جل کر ملک میں ہنگاموں اور شورشوں کی آگ بھڑکاتے ہیں۔

سوم۔ امراء اور اراکین سلطنت کا آپس میں گہرے مراسم رکھنا، جب امراء آپس میں شیر و شکر ہوتے ہیں تو اس وقت ان میں سے اگر کوئی ایک کسی فعل کا ارتکاب کرتا ہے تو باقی تمام اس کا ساتھ دیتے ہیں۔

چہارم۔ مال و دولت کی فراوانی، جب کم ظرفوں اور کمینوں کو ان کی حیثیت سے زیادہ روپیہ مل جاتا ہے تو وہ اپنی حد سے بڑھ جاتے ہیں، ان کے ذہنوں میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہوتے ہیں، وہ ہر چیز پر قابض ہونے کی تمنا کرنے لگتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی حریص نگاہیں زمام حکومت کو بھی ہاتھ میں لینے کے لئے تڑپ اٹھتی ہیں۔

سلطان علاؤالدین خلجی کو اپنے اراکین سلطنت کی یہ باتیں بہت پسند آئیں اور اس نے ان خرابیوں کو دور کرنے کا ارادہ کر لیا، رعایا کے حالات سے باخبر رہنے کے لئے خبر رسانی کے محکمہ کو اس قدر ترقی دی کہ ملک کے تمام اچھے برے حالات کی خبریں ملنے لگیں۔

دوسرا مشورہ شراب نوشی کی ممانعت سے متعلق تھا، اس سلسلہ میں علاؤالدین نے سب سے پہلے یہ اقدام کیا کہ خود شراب پینی ترک کر دی، اور یوں گویا بادہ نوشی کا دور ختم ہو گیا، عیش و عشرت کی محفلیں برباد

جو تھی شہر میں عام اعلان کر دیا گیا کہ بادشاہ نے شراب نوشی سے توبہ کر لی ہے لہٰذا جو شخص شراب پیئے گا یا بیچے گا اس کو سخت سزا دی جائے گی، تمام مقبوضہ علاقوں میں اس قسم کے فرامین بھیجے گئے، اور لوگوں نے بسر و چشم شاہی حکم کی تعمیل میں اپنے گھروں سے شراب نکال کر سڑکوں اور شاہراہوں پر بہا دی۔

علاؤالدین کے مخصوص امراء نے جو تیسرا مشورہ دیا تھا اس پر اس طرح عمل کیا گیا کہ شاہی حکم کے ذریعہ امراء اور درباریوں کو آپس میں بادشاہ کے حکم کے بغیر رشتے ناتے کرنے پر پابندی لگا دی گئی، اس کے علاوہ ایک دوسرے کی دعوتیں کرنے کا دستور بھی ختم کر دیا گیا، اس حکم پر فوراً عمل کیا گیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امراء اور اراکین سلطنت ایک دوسرے کے لئے بیگانے ہو گئے۔

چوتھا مشورہ دولت کی فراوانی سے متعلق تھا، اس پر یوں عمل کیا گیا کہ وہ تمام قصبات جو معافی یا وقف یا کسی اور وجہ سے رعایا کے قبضے میں تھے وہ شاہی تحویل میں لے لئے گئے، بادشاہ نے ہر امیر و غریب پر جائز و ناجائز ہر طرح کا اثر ڈال کر اس کی تمام دولت حاصل کرکے شاہی خزانے میں جمع کر دی، اس اقدام کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ کھانے پینے سے بھی محروم ہو گئے، اور روزگار حاصل کرنے کے لئے دوڑ دھوپ کرنے لگے، انہیں اتنی فرصت ہی نہ رہی کہ وہ فتنوں اور ہنگاموں کی طرف توجہ کرتے۔

فاسد خیالات اور ان کی اصلاح

سلطان علاؤالدین خلجی کبھی کبھی اپنے خیال کا اظہار یوں کرتا کہ حکمرانی اور بادشاہت کے نظام کو صرف بادشاہ کی رائے اور اس کی مصلحتوں سے تعلق ہوتا ہے، ان سیاسی کاموں سے خدا تعالیٰ کی شریعت کو کوئی واسطہ نہیں ہے، مذہبی علماء کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ مختلف قسم کے مقدموں کا فیصلہ کریں، خاندانی جھگڑوں کو ختم کریں، اور خداوند تعالیٰ کی عبادت کے بہترین طریقے بتائیں، اپنی اس غلط رائے پر علاؤالدین ہمیشہ عمل کرتا تھا، اور کسی معاملہ میں شرعی احکام کی کوئی پرواہ نہ کرتا تھا، جب شاہی گماشتوں کے مراسلے بادشاہ کی خدمت میں پیش ہونے لگے تو اس وقت بادشاہ کو لکھنے پڑھنے کی ضرورت محسوس ہوئی، اور اس نے اس طرف توجہ کی، اور کوشش کرکے اس نے اتنی استعداد پیدا کر لی کہ خط شکستہ کی عبارت بآسانی پڑھنے لگا، اس سلسلہ میں بادشاہ نے فارسی کی چند کتابوں کا مطالعہ بھی کیا، اور علماء سے علمی معاملات میں گفتگو کرنے لگا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے فاسد خیالات اصلاح پذیر ہوئے اور اسے اس بات کا یقین آ گیا کہ علماء اور قاضی نیک نیت اور پاک باطن لوگ ہیں، یہ لوگ

Scanned by CamScanner

دنیاوی فوائد کے لالچ میں گرفتار ہو کر مسائل گمڑا نہیں کرتے، خیالات کی اس تبدیلی کے بعد علاؤالدین کبھی کبھار علمار کی مجلس میں شرکت کرتا، اور ان سے شرعی مسائل کے بارے میں معلومات حاصل کرتا اور کسی مسئلہ میں گفتگو بھی کرتا تھا۔[1]

حضرت خواجہ نظام الدین اولیار کا ارشاد

جس زمانہ میں ملک نائب ورنگل پر لشکر کشی کی تھی، چند روز تک علاؤالدین کو اپنے لشکر کے حالات کا علم نہ ہو سکا، جس کی وجہ سے اُسے بہت پریشانی ہوئی، آخرکار بادشاہ نے قاضی مغیث اور ملک قرابیگ کو حضرت نظام الدین اولیار کی خدمت میں روانہ کیا، اور یہ کہلوایا، "مذہب اسلام کا خیال حضور کو مجھ سے زیادہ ہے، اگر آپ کو اپنے کشفِ باطن کی وجہ سے لشکر اسلامی کا حال معلوم ہو تو از راہِ عنایت مجھے بھی اس سے آگاہ فرمائیں، ورنگل کی طرف جو لشکر روانہ کیا ہے، اس کی خیر خیریت کی کوئی خبر نہیں ملی، اس وجہ سے میں سخت پریشان ہوں۔ علاؤالدین نے قاضی مغیث کو تاکید کر دی تھی کہ حضرت نظام الدینؒ جواب میں جو کچھ فرمائیں، وہ بغیر کسی کمی بیشی کے اس کے روبرو بیان کیا جائے، قاضی مغیث اور ملک قرابیگ شاہی حکم کے مطابق حضرت محبوب الٰہی کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور بادشاہ کا پیغام ان سے کہا، انہوں نے جواب میں پرانے زمانہ کے ایک بادشاہ کی فتح کی داستان بیان کی، اور اس کے ساتھ یہ کہا "اس کے علاوہ مزید فتوحات کی بھی خداوند تعالیٰ کی بارگاہ سے امید ہے" قاضی اور ملک حضرت محبوب الٰہیؒ سے رخصت ہو کر علاؤالدین کی خدمت میں پہنچے، اور جو کچھ حضرت نے کہا تھا وہ حرف بحرف بادشاہ سے بیان کر دیا، علاؤالدین حضرت محبوب الٰہی کی گفتگو سن کر بے حد خوش ہوا، اور اُسے یقین ہو گیا کہ ورنگل کا معرکہ سر ہو گیا ہے۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیار سے عقیدت

خدا کی قدرت کہ اسی روز عصر کے وقت قاصد آئے، اور انہوں نے ورنگل کا فتح نامہ علاؤالدین کی خدمت میں پیش کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علاؤالدین حضرت محبوب الٰہیؒ کی روحانی بلندی کا پہلے سے زیادہ

معتقد ہو گیا، علاؤالدین نے اگرچہ حضرت خواجہ سے کبھی ملاقات نہیں کی، لیکن ان سے خط و کتابت کا سلسلہ باقاعدہ جاری رکھا، اور اپنے خطوط میں ہمیشہ خلوص و محبت کا اظہار کر کے ان کے انوار باطنی سے طالب مدد رہا، علاؤالدین کی سلطنت جب کابل و سندھ کی سرحد سے لے کر بنگالہ، دکن، اور گجرات کی حدود تک پہنچ گئی اور سارے ہندوستان کے شہر اور علاقے اور تمام راجاؤں کے محل اور خزانے بادشاہ کے قبضہ میں آگئے، اور سارے ہندوستان میں کہیں دس بیگہ زمین بھی ایسی نہ رہی، جہاں علاؤالدین کے نام کا خطبہ و سکہ جاری نہ ہو، تو اس نے کچھ اور اونچی فضاؤں میں اڑنے کی سوچی، اور وہ دریائے عمان کے ساحلی علاقوں اور دکن کے دور دراز خطوں کی طرف متوجہ ہوا۔[1]

علاؤالدین خلجی کا آخری دور

مؤرخین کا بیان ہے کہ علاؤالدین خلجی کو جس قدر فتوحات حاصل ہوئیں، اتنی ہندوستان کے کسی اور حکمران کو نصیب نہ ہوئیں، اس نے جس کثرت سے مسجدیں، تالاب، سرائیں، خانقاہیں اور قلعے وغیرہ تعمیر کروائے اتنے کسی اور بادشاہ نے نہیں کئے، اہلِ فن اس کے زمانہ میں بہت بڑی تعداد میں جمع تھے، ان کا اتنا بڑا گروہ کسی اور باشاہ کے زمانہ میں جمع نہیں ہوا، علاؤالدین کے زمانہ میں انصاف اور سچائی کا جو بول بالا ہوا، اطاعت و فرماں برداری کا جو نام اونچا ہوا، اور بغاوت و سرکشی کا جس طرح قلع قمع ہوا، اس کی مثال کسی اور بادشاہ کے عہد میں نہیں ملتی، اسی طرح اس دور میں اولیار اللہ، علمار کرام اور مشائخ عظام کا جیسا گروہ تھا ویسا مقدس گروہ دہلی میں کسی اور زمانہ میں جمع نہیں ہوا، علاؤالدین خلجی کے عہد حکومت کے شعرار کی شیریں کلامی، جدتِ طبع اور بلند خیالی پر صرف اہلِ دہلی ہی نہیں، بلکہ پورا ہندوستان فخر کرتا تھا، ان شعرار عالی مقام میں سے بعض دارالسلطنت دہلی ہی میں مقیم تھے، اور شاہی دربار سے تعلق رکھتے تھے، درباری شعرار کے گل سر سبد حضرت امیر خسرو تھے، ان کے کمالات محتاج تعارف نہیں ہیں، ان کے فضل و کمال کی شہادت ان کی تصانیفِ نظم و نثر سے مل سکتی ہے، فنِ شاعری کے علاوہ امیر وخسرو بہت بڑے صوفی اور صاحب وجد و حال تھے، ان کے وقت کا بیش تر حصہ عبادات میں صرف ہوتا تھا، اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیار کے صرف مرید ہی نہیں، مراد تھے، دوسرے معزز درباری حسن سنجریؒ تھے، آپ کا کلام سلاست اور لطافت بیان کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور ہے، اس وجہ سے آپ کو عام طور پر "حسن

---

[1] تاریخ فرشتہ اول ص ۲۸۸

ہجری "سعدیٔ ہندوستان" کہا جاتا تھا، قناعت، گوشہ نشینی اور تہذیب الاخلاق میں آپ اپنے عہد میں بے نظیر تھے، حضرت حسنؒ کو خواجہ نظام الدین اولیاءؒ سے خلافت ملی تھی، آپ نے حضرت کی زبان سے جو کچھ سنا اُسے یکجا کر کے ایک کتاب مرتب کی، جس کا نام "فوائد الفؤاد" ہے، اس کے علاوہ حضرت حسنؒ کی اور بھی بہت سی تصانیف نظم ونثر دونوں میں موجود ہیں، جو آپ کے فضل وکمال کی زندہ جاوید یادگاریں ہیں۔

سلطان علاؤالدین خلجی سکندرِ ثانی

جلال الدین خلجی کی نرم مزاجی اور حلم وتحمل اور عفو درگزر کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے، اس کا جانشین، علاؤالدین خلجی اس معاملہ میں اس کی عین ضد تھا، وہ اپنے چچا کے عہد حکومت میں دیکھ چکا تھا کہ ایک بادشاہ کی نرم دلی سے ملکی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، اور ہر کس وناکس تختِ شاہی کا خواب دیکھنا شروع کر دیتا ہے، اس نے جلال الدین کے طریقِ کار کو بالکل بدل دیا اور اپنے دشمنوں اور باغیوں کو وہ عبرتناک سزائیں دیں کہ سن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، سلطان علاؤالدین خلجی کی تند مزاجی کی کئی مثالیں گنائی جا سکتی ہیں، لیکن ان خصلتوں کا ظہور عموماً اس وقت ہوتا جب کوئی بادشاہ کی مخالفت کرتا اور ملک میں فساد ڈالنا چاہتا، سلطان میں اعلیٰ حکمرانوں کی خوبیاں بھی کئی تھیں اور تختِ دہلی پر بہت تھوڑے بادشاہ ایسے ہوئے ہوں گے جو اس کی طرح اولوالعزم، محنتی اور صاحبِ تدبیر ہوں، اس کی فتوحات کی تفصیلات ایک طویل حکایت ہے ہندوستان کا جس قدر علاقہ اس کے زیرِ نگیں تھا برطانوی حکومت سے پہلے کسی کو نصیب نہیں ہوا۔[1]

نظم ونسق کا بھی اُسے بڑا ملکہ تھا، اور اکثر معاملات میں وہ نتیجتاً صائب رائے ہی اختیار کرتا، اس کی انتظامی قابلیت کی بہترین مثال اصلاحوں کی وہ کامیاب حکمت عملی ہے جو اس نے اجناس کی قیمتوں کو کم کرنے، ملکی شورشوں کی پیش بندی اور اندرونی حالات کو ٹھیک رکھنے کے لئے جاری کیا، اپنی محنت اور خوش تدبیری سے کامیاب کر کے دکھایا، آج بھی جب کہ اجناس کے ایک جگہ سے دوسری جگہ لانے اور واقعات وحالات سے خبردار رہنے کے ذرائع بے حد وسیع ہو گئے ہیں اس کے باوجود اجناس کی نرخ بندی کس قدر مشکل ہے، لیکن علاؤالدین نے اس کے لئے آج سے سات سو، آٹھ سو سال پہلے قواعد وضوابط وضع کئے، ان کی تعمیل کے لئے آسانیاں بہم پہنچائیں اور اپنے ارادے میں پوری طرح کامیاب ہوا۔[2]

علاؤالدین کے قہر وظلم کی نسبت یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہلاکو خان اور اس کے جانشینوں کا ہم عصر

[1] آب کوثر ۱۴۵ [2] آب کوثر ص ۱۴۶

تھا، اس زمانے میں رحم دلی اور حلم وتحمل دکھانا، مفسدوں اور باغیوں کو جرأت دلاتا تھا، اس کی ایک مثال مغلوں کے سدِ باب سے ملے گی، جلال الدین خلجی نے ان کے ساتھ رحم کا برتاؤ کیا تھا، لیکن نتیجہ یہی ہوا کہ اس کے بعد بھی وہ ہر سال ہندوستان پر حملے کرتے رہے، علاؤالدین خلجی نے ان کا قتل عام کیا، اور ان کے ساتھ وہی درشتی اور سخت گیری روا رکھی جو اپنے مفتوحین سے دوسرے ممالک میں برتتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب انہیں ہندوستان آنے کی ہمت نہ پڑی، اور جس اہم کام کو بلبن نے شروع کیا تھا اُسے علاؤالدین نے تکمیل تک پہنچا دیا۔[1]

برکاتِ عہدِ علائی

اگرچہ باغیوں اور نافرمانوں کے لئے علاؤالدین قہرِ عظیم تھا، لیکن امن پسند شہریوں اور عام رعایا کیلئے اس کا وجود ایک رحمت الٰہی تھا، عہد علائی کی جو خصوصیات ہیں وہ بالاختصار یہ ہیں۔

(۱) غلہ اور سامانِ معیشت کی فراوانی اور ارزانی جس پر بارش کی کمی بیشی کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ (۲) بادشاہ کی غیر معمولی اور مسلسل فتوحات۔ (۳) منگول حملہ آوروں کا قلع قمع۔ (۴) تھوڑے سرمایہ والوں کے پاس جاہ وحشمت کی فراوانی (۵) مغرور اور متکبروں کی طرف سے بادشاہ کی اطاعت اور غریبوں پر شفقت (۶) ملک اور راستوں کا امن وامان (۷) تاجروں اور دوکان داروں کی ارزاں فروشی اور قواعدِ شاہی کی پابندی۔ (۸) بے شمار نئی عمارتوں مثلاً: مسجدوں، قلعوں، سرایوں کی تعمیر۔ (۹) عام رعایا کی روحانی اور اخلاقی ترقی۔ (۱۰) ملک بالخصوص دارالخلافت میں ہر علم وفن کے جید علماء اور ہر فن کے کامل ماہروں کا اژدحام۔

عہدِ علائی میں ضروریاتِ زندگی کی یہ ارزانی وکثرت تھی، اور ملک میں اس قدر امن وامان تھا تو جائے حیرت نہیں کہ علاؤالدین کی وفات کے بعد لوگ اس کے عہدِ حکومت کو یاد کر کے کفِ افسوس ملتے تھے، حضرت سلطان المشائخ کے خلیفہ حضرت چراغ دہلیؒ کے ملفوظات میں لکھا ہے کہ حضرت چراغ دہلوی نے اس وقت کی فراخ سالی اور ارزانی بیان کی ہے، جو سلطان علاؤالدین کے وقت میں تھی ان دنوں موسم سرما میں ہر فقیر لبادہ پوش ہوتا، کافور نامی ایک شخص اکثر لبادے سلوا کر فقیروں کو تقسیم کرتا، بعضے دو، دو پاتے۔

[1] آب کوثر، ص ۱۴۸

حضرت چراغ دہلویؒ کے ملفوظات سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ علاؤالدین خلجی کی وفات کے بعد عوام الناس نے اُسے ولی کا درجہ دے دیا، اور اس کی قبر پر جا کے دھاگے باندھتے اور مرادیں مانگتے رہے[1]

مؤرخین تحریر کرتے ہیں کہ علاؤالدین خلجی کے زمانے میں چوراسی (۸۴) چھوٹی بڑی لڑائیاں لڑی گئیں، اور ہر لڑائی میں یہ اقبال مند بادشاہ کامیاب و کامران رہا، علاؤالدین کی شان و شوکت کا اندازہ محض اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس کے دربار میں ستر ہزار شاگرد پیشہ ملازم تھے، ان میں سات ہزار معمار بیل دار اور گلکار تھے، جو بڑی سے بڑی عمارت بھی دو ہفتے میں تیار کر لیتے تھے، اور چھوٹی چھوٹی عمارتیں دو تین دن ہی میں تعمیر ہو جاتی تھیں، عمارت کی تعمیر کے لئے بادشاہ جتنے عرصے کا تعین کر دیتا تھا اس میں ایک لمحہ کی کمی بیشی نہ ہوتی تھی۔[2]

علاؤالدین کا زوال اور اس کی وفات

جب علاؤالدین ایک عرصہ تک کامیابی اور کامرانی کے ساتھ حکومت کر چکا اور اس کی خوش قسمتی اپنے عروج کو پہنچ گئی تو مشہور مثل "ہر کمالِ را زوال" کے مصداق اس کے برے دن بھی نزدیک آنے لگے، علاؤالدین سے بہت سے ایسے کام بھی سرزد ہونے لگے جو اس کی سلطنت کے زوال کا باعث ہوئے، اور حکومت کے استحکام کی راہ میں سنگِ گراں ثابت ہوئے، آخر کار ۶ رشوال ۷۱۶ھ مطابق ۱۳۱۶ء کی رات اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی، بے شمار زر و جواہر اور دولت جو محمود غزنوی کو بھی میسر نہیں ہوئی تھی جس کو بڑی محنت سے علاؤالدین نے جمع کیا تھا، دوسروں کے لئے چھوڑ گیا، علاؤالدین نے بیس سال سے کچھ زیادہ عرصے تک حکمرانی کی۔[3]

نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا
مٹے نامیوں کے نام کیسے کیسے

نامبارک پنج سالہ دور

علاؤالدین خلجی کی وفات کے بعد تین (۳) حکمرانوں[4] نے پانچ سال تک حکومت کی حکمران کی نااہلیت اور عیش کوشی کے سبب پورے ملک میں ابتری پھیل گئی، نظام درہم برہم ہو گیا، اور خزانۂ شاہی

[1] آبِ کوثر ۱۵۰ [2] تاریخ فرشتہ اول ص ۳۹۹ [3] تاریخ اول فرشتہ، ص ۳۹۹ [4] یہ تین حاکم یہ ہیں: (۱) محمد بن علاؤالدین خلجی (۲) مبارک شاہ خلجی (۳) خسرو خاں اس میں اول اور سوم کی حکومت چند مہینوں کے لئے تھی اور مبارک شاہ کی حکومت چار سال رہی ہے

تمام ختم ہو گیا، ملک کے یہ حالات دیکھ کر سرحد کے حاکم غیاث الدین تغلق نے (جو اس وقت ملتان کا حاکم تھا، خلجی خاندان کا وفادار تھا، نہایت جری اور مغلوں کو دندان شکن جواب دینے والا جس کو علاؤالدین خلجی نے سرحد کی حفاظت کے لئے اور مغلوں کو دفع کرنے کے لئے متعین کیا تھا، جس طرح غیاث الدین بلبن نے اپنے بیٹے خان شہید کو سرحد کی حفاظت کے لئے ملتان کا حاکم طے کیا تھا) دوسرے حاکموں کی مدد سے اس پنج سالہ دور کا آخری فرمانروا خسرو خان اور اس کے حواریین کے ساتھ جنگ کر کے اس کو قتل کیا، اور میدان صاف کرنے کے بعد غیاث الدین تغلق نے امراء و صلحاء سے کہا، جس کو چاہو بادشاہ طے کر لو ہم سب مل کر اس کی اطاعت اور فرماں برداری کریں گے، اس کے بعد امراء، صلحاء نے متفقہ طور پر غیاث الدین تغلق ہی کو بادشاہ منتخب کر لیا اور وہ تخت نشین ہوا، خلجی خاندان کا چراغ گل ہو گیا اور خاندانِ تغلق برسرِ اقتدار آ گیا، یہ ۷۲۱ھ مطابق ۱۳۲۱ء کا سال تھا۔

(خاندانِ تغلق) سلطان غیاث الدین تغلق

شروع میں سلطان تغلق ایک سوداگر کے گھوڑے چرانے پر مامور تھا، پھر سلطان علاؤالدین کے بھائی الغ خان کے پیادوں میں بھرتی ہو گیا، وہاں سے ترقی کرتا ہوا سوار فوج کا افسر اعلیٰ ہوا، اور پھر تو اتنی ترقی کی کہ مملکت کی سب سے بڑی مہم یعنی مغلوں کی روک تھام اس کے سپرد ہوئی، اسے مغربی پنجاب میں وہی فرائض ادا کرنے پڑے جن کی بجا آوری کے لئے بلبن نے اپنے بیٹے خان شہید کو ملتان میں متعین کیا تھا، ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ سلطان تغلق نے ملتان میں ایک مسجد بنائی تھی، اس کے مقصورہ پر میں نے خود یہ لکھا ہوا دیکھا ہے "میں تاتاریوں سے انتیس (۲۹) دفعہ لڑا ہوں، اور ان کو شکست دی ہے، اس واسطے میرا لقب "غازیٔ ملک" ہوا، اس کے نظم و نسق کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر ایشوری پرشاد (جنہوں نے کسی ایسے مسلمان بادشاہ کی نسبت جو اپنے مذہب سے بے پرواہ نہ ہوا اپنی تاریخ میں کلمۂ خیر نہیں لکھا) اس کی نسبت رقم طراز ہے: "غیاث کا انتظامِ سلطنت انصاف اور میانہ روی پر مبنی تھا، مال گزاری کے نئے اصول وضع کئے گئے، اور سلطان نے اس امر کی بڑی احتیاط کی کہ اس سے خرابیاں پیدا نہ ہوں، خسرو نے جو جاگیریں تقسیم کی تھیں وہ واپس لے لی گئیں، اور ملک کی مالی حالت درست کی گئی، کاشت کاروں سے نیک سلوک کیا گیا، اور جو سرکاری افسر بدعنوانی کرتا اُسے سخت سزا دی جاتی، عدالت اور پولیس محکمے تسلی بخش تھے، اور ملک کے دور دراز حصوں میں انتہائی درجے کا امن و امان تھا۔"[1]

[1] آبِ کوثر ص ۳۹۶

غیاث الدین کا کردار

سلطان غیاث الدین نے اپنی خوش انتظامی سے زندگی میں نئی لہر دوڑا دی اور عوام کے دلوں میں بھی اپنے لئے جگہ پیدا کرلی، یہ بہت ہی خداترس نیک اور پرہیزگار تھا، سنجیدگی، حلم اور بردباری اس کی طبیعت کے نمایاں جوہر تھے، عقل وفہم اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، قوانین مذہب کی پابندی اپنا فرض سمجھتا تھا، پانچوں وقت نماز باجماعت ادا کرتا تھا، ملکی انتظام میں بڑی مہارت رکھتا تھا، دیوان عام میں بیٹھ کر رعایا کے حالات سنتا، ان کی معاشی بدحالی کی طرف توجہ کرتا اور ان کی معاشی مشکلات دور کرنے کی کوشش کرتا، یہ عام بادشاہوں کی طرح مسند نشینی کا قائل نہ تھا، بلکہ اپنے آپ کو رعایا کا ایک ادنیٰ خادم سمجھتا تھا۔

ہر شخص کی استعداد اور قابلیت کے اعتبار سے عہدے پر تقرر کرتا، علماء اور مشائخ، ارکان دولت اور امرائے سلطنت کو انعام واکرام اور خلعت شاہانہ سے ہمیشہ سرفراز کرتا، گوشہ نشین فقیروں اور درویشوں کی نہ صرف فکر رکھتا تھا، بلکہ ان کے حالات معلوم کرتا، اور انہیں ہر طرح کا آرام پہنچاتا، رعایا کی بدحالی کو حتی الوسع دور کرتا، اس نے مغلوں کے حملوں کا مکمل طور پر سدِ باب کیا، غیاث الدین کے عہد حکومت میں کبھی مغلوں نے ہندوستان کا رخ نہ کیا، غیاث الدین کو تعمیرات کا بھی شوق تھا، تغلق آباد کا مشہور قلعہ اور سر بفلک ایوانات اس کے بلند ذوق کا بین ثبوت ہیں، شراب نوشی سے سخت نفرت تھی، اور ملک میں شراب پینے کی بہت سختی سے ممانعت تھی، اپنے خاندان والوں، غلاموں، اور پرانے نوکروں سے اس کا جو سلوک امارت اور خانین کے زمانے میں تھا وہی بدستور حکمرانی کے عہد میں قائم رکھا، علائی امیروں کی بہت عزت کرتا، اور انہیں باقاعدہ جاگیریں عطا کیں، اور جس کو اپنی اور رعایا کی فلاح کی فکر میں دیکھتا اس کو اعلیٰ عہدہ عطا کرتا، جو شخص کوئی اہم کارنامہ انجام دیتا اس پر لطف وکرم کر کے اس کو ہم چشموں سے ممتاز کرتا۔

غیاث الدین تغلق کی وفات

۷۲۴ھ میں لکھنوتی[1] اور سنارگاؤں کے باشندوں نے دہلی میں یہ عرضیاں بھیجیں کہ وہاں کے حاکم رعیت پر ظلم وستم کر رہے ہیں، غیاث الدین تغلق نے اپنے بیٹے الغ خان (محمد تغلق) کو دہلی میں قائم مقام بنایا اور خود مشرقی ہندوستان کی طرف روانہ ہوا، بادشاہ نے ترہٹ پہنچ کر بغاوت ختم کی اور نئے حاکموں

[1] بنگالہ مراد ہے۔

تقرر کر کے دہلی واپس ہوگیا، الغ خان نے جب سنا کہ اس کا باپ مع لشکر کے دہلی واپس آرہا ہے تو اس نے افغان پور کے قریب ایک نیا محل بنوایا، یہ محل صرف تین دن میں تیار کرایا گیا تھا، وہ چاہتا تھا کہ اس کا باپ اسی محل میں رات بسر کرے، اور اس وقت جب کہ شہر میں اس کی آمد کی خوشی میں ہر طرف آئینہ بندی ہو جائے، طرح طرح کے لوازمات مسرت فراہم کر لئے جائیں، تب اس کا باپ بڑی شان وشوکت سے شہر میں داخل ہو، غیاث الدین تغلق افغان پور کے نزدیک پہنچا اور نئی عمارت بنوانے کا سبب پوچھا اور جب بیٹے کی یہ خواہش معلوم ہوئی تو اس کا دل رکھنے کے لئے اسی محل میں مقیم ہوگیا، تغلق آباد میں اس کی آمد پر شادیانے بجے، اور سارے شہر میں خوشیاں منائی گئیں، دوسرے روز الغ خان مع ارکانِ دولت بادشاہ کی قدم بوسی کے لئے آیا، بادشاہ مع استقبالیوں کے اسی کے دسترخوان پر بیٹھا، کھانا کھانے کے بعد تمام حاضرین محل سے باہر آگئے کہ بادشاہ اسی وقت دار الخلافہ جائے گا، الغ خان جس کی زندگی باقی تھی وہ بھی گھوڑوں، ہاتھیوں اور دوسرے لوازمات شاہی کی ترتیب کے لئے باہر چلا آیا، جنہیں وہ بادشاہ کی خوشنودی کے لئے لایا تھا، الغ خان کے باہر آتے ہی اس کمرے کی چھت گر پڑی جہاں غیاث الدین مع اپنے مصاحبین کے بیٹھا تھا، وہ اس صدمہ سے جانبر نہ ہو سکا، حاجی محمد قندھاری لکھتے ہیں کہ بادشاہ کھانے سے فارغ ہو کر ہاتھ دھو رہا تھا کہ آسمان سے بجلی گری اور چھت کو توڑتی ہوئی بادشاہ کے سر پر آگری۔ **واللہ اعلم بالصواب**

غیاث الدین تغلق کی وفات ۷۲۵ھ مطابق ۱۳۲۴ء میں ہوئی، اس نے کچھ مہینے چار سال تک حکومت کی، امیر خسرو جو علائی عہد میں ایک ہزار تنکہ ماہوار پاتے تھے غیاث الدین کے عہدِ حکومت میں اور بھی زیادہ خوش حال اور فارغ البال زندگی گزارتے تھے، انہوں نے تغلق نامہ اسی بادشاہ کے نام سے معنون کیا۔[1]

سلطان غیاث الدین کی وفات اسلامی ہندوستان کے لئے ایک مصیبت عظمیٰ تھی اور سلطان کی وفات کے ساتھ اسلامی حکومت کی انتہائی وسعت کا زمانہ ختم ہوگیا، علاؤالدین خلجی نے جو علاقے فتح کئے تھے وہ ابھی تک دہلی کے تابع تھے، اور سلطان غیاث الدین نے اپنے حسنِ انتظام سے بنگال اور دکن ہر طرف پورا قابو رکھا تھا، اس کے بعد سلطان محمد تغلق فرماں رواں ہوا، جس کے عہدِ حکومت میں بغاوتیں شروع ہوئیں، کئی صوبے دہلی سے آزاد ہو گئے، اور سلطنتِ دہلی وسیع ہونے کے بجائے کمزور ہونی شروع ہوگئی۔[2]

[1] تاریخ فرشتہ [2] آب کوثر ص ۴۰۰

سلطان محمد شاہ تغلق

غیاث الدین تغلق کی وفات کا غم تین دن تک دارالسلطنت میں منایا گیا، اور بیٹے نے چوتھے دن کے بعد تاج و تخت سنبھالا، ہر طرف خوشی اور مسرت کے شادیانے بجائے گئے، الغ خان نے اپنے کو محمد شاہ سے موسوم کیا۔

سلطان محمد شاہ تغلق کا کردار

محمد تغلق بہت ہی بلند ہمت حکمراں تھا، اور بہت زیادہ سخی تھا، ایک معمولی فقیر کو اپنا شاہی خزانہ دے کر مطمئن نہ ہوتا، اور یہی سمجھتا کہ ابھی کچھ نہیں دیا ہے، حاتم کی سخاوت اس کے سامنے بے حقیقت نظر آتی تھی، جب وہ سخاوت پر اتر آتا تو امیر غریب، ادنیٰ اعلیٰ، اپنے اور پرائے کا امتیاز نہ کرتا، آبِ کوثر میں لکھا ہے کہ "سلطان محمد تغلق مؤرخین کے لئے ایک معمہ ہے، وہ قرآن مجید کا حافظ تھا، نماز و روزہ کا بڑا پابند تھا، عربی فارسی میں بہت اعلیٰ خطوط لکھتا تھا، اس کے سیاسی مسلک کی نسبت ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں "وہ اپنے مذہب کی پوری پیروی کرتا اور اس کی خانگی زندگی بے عیب تھی، وہ متعصب ہرگز نہ تھا، تنگ نظر فقہاء کی رائے کو بہت اہمیت نہ دیتا تھا، اور ہندوؤں کے ساتھ اس نے رواداری کا سلوک کیا، اس نے ان کی معاشرتی زندگی کی اصلاح کرنے کی کوشش کی اور رسمِ ستی کو موقوف کرنا چاہا، اس نے ایک ہندو کو سندھ کا گورنر مقرر کیا اور دوسرے کو بڑے بڑے عہدے دئے۔[1]

اس کی قابلیت اور جدتِ طبع سب کے نزدیک مسلم ہے، لیکن اس کے باوجود اس سے ہندوستان کو نقصان زیادہ ہوا اور فائدہ کم، اس کی وجہ یہ تھی کہ جو بات اس کے دل میں بیٹھ جاتی اُسے پورا کرنے کے لئے وہ انتہائی شدت سے کام لیتا، حتی کہ کبھی ظلم اور کبھی احمقانہ افعال پر اتر آتا، اس نے دہلی کو چھوڑ کر دولت آباد کو دار الخلافہ بنانا چاہا، کیونکہ دولت آباد زیادہ مرکزی جگہ تھی، مگر اس ارادے کی تکمیل کے لئے اہلِ دہلی پر بڑے مظالم ڈھائے۔[2]

محمد تغلق کے دورِ حکومت میں یہ سلسلہ برابر جاری رہا کہ عراق، خراسان، ماوراء النہر، ترکستان، روم اور عرب سے علماء اور فضلاء اور باکمال لوگ نیز غربت زدہ مسافر انعام و اکرام کے لئے اس کے دربار

[1] مختصر تاریخ ہند (انگریزی) بحوالہ آبِ کوثر [2] آبِ کوثر ص ۱۰۳

میں آتے رہتے تھے اور وہ ہمیشہ اپنے حوصلہ سے زیادہ پاتے تھے، مسافروں میں سے جو لوگ اپنے وطن جانا نہیں چاہتے تھے اور یہیں کی سکونت اختیار کرنا چاہتے ان کو دربار سے وظیفہ ملتا تھا۔

علم نوازی

محمد تغلق بہت اچھا مقرر تھا، اس کی تقریروں میں شیرینی اور فصاحت ہوتی، عربی اور فارسی میں خطوط اور مراسلے فی البدیہ لکھتا اور ان میں اپنی علمیت کا دریا بہا دیتا کہ بڑے بڑے انشاء پرداز اور ادبار ان کو دیکھ کر حیران رہ جاتے، یہ اتنا خوش نویس تھا کہ چوٹی کے کاتب بھی اس کی عمدہ خطاطی اور خوش نویسی کا لوہا مانتے تھے، انتظامِ سلطنت اور وضعِ قوانین میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا، فہم و ادراک کی تیزی اور ذکاوت میں یہ اپنے تمام ہم عصر حکمرانوں میں امتیاز رکھتا تھا، مردم شناس اس قدر کہ صورت دیکھتے ہی اچھائی اور برائی بتا دیتا تھا، اس کا حافظہ غضب کا تھا، اور علمِ تاریخ کا بہت بڑا ماہر تھا، شاہ نامہ کے تمام قصے، ابو مسلم اور امیر حمزہ کی داستانیں اس کو ازبر تھیں، منطق اور معقولات سے بھی دلچسپی تھی، اس کے علاوہ طب، حکمت، نجوم اور ریاضی سے خصوصیت کے ساتھ لگاؤ تھا، اکثر اوقات بیماروں کی تشخیص اور علاج کرتا اور بعض اوقات علماءِ طب سے بحثیں کرتا اور انہیں قائل کر دیتا تھا؛ اکثر وقت دورانِ حکومت معقولات کی کتابوں کے مطالعہ میں صرف ہوتا تھا، منقولات سے زیادہ دلچسپی نہ تھی، اسی وجہ سے فقیہوں اور منقولی علماء کی اس کے دربار میں رسائی نہ تھی، منقولات کا جو مسئلہ علمِ معقول کے مطابق ہوتا اس کو مان لیا کرتا، نیز بے حد جری اور بہادر تھا، اس لئے ہر وقت تسخیرِ ممالک کا خیال دل میں رہتا، یہی سبب ہے کہ اس کی زندگی کا بڑا حصہ لشکر کشی اور جنگ جوئی میں گزرا ہے، مؤرخین اس کو "عجائب المخلوقات" کے نام سے یاد کرتے ہیں، اور یہ بات کسی حد تک درست بھی ہے، اس کے حالاتِ زندگی پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بیک وقت نیکی اور بدی دونوں صفتوں کا مالک تھا، ایک طرف اس کی خواہش تھی کہ بادشاہ کے ساتھ مرتبۂ نبوت بھی اس کو مل جائے، دوسری طرف اس کی یہ حالت تھی کہ اسلام کے قوانین اور احکامات پر پوری طرح عمل کرتا، مسکرات سے دور بھاگتا، فسق و فجور سے ہمیشہ الگ رہتا، حرام چیزوں کی طرف نہ دیکھتا لیکن طرفہ یہ ہے کہ اس کو بندگانِ خدا کا ناحق خون کرنے میں اور ان پر طرح طرح کے ظلم توڑنے میں کوئی برائی نظر نہ آتی تھی، ایسے کام کرتے ہوئے نہ اس کے سامنے معقولات کے مسائل رہتے تھے، اور نہ شرع ہی ان افعالِ بد میں مانع ہوتی، طبیعت کی دورنگی کا یہ عالم تھا کہ جہاں بخشش و کرم

Scanned by CamScanner

میں حاتم و معن سے بھی آگے بڑھ جاتا، وہاں ظلم و ستم میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا، اور کوئی ہفتہ ایسا نہ جاتا کہ جس میں مشائخ و سادات، صوفی، قلندر، اہل قلم اور سپاہی اس کی سیاسی حکمت عملی کا شکار نہ ہوتے ہوں۔[1]

زوال سلطنت کے اسباب

سلطان محمد تغلق کے عہد حکومت کا درمیانی اور آخری حصہ بہت ہی بدانتظامی اور اندرونی خلفشار کا گزرا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ گجرات کے علاوہ اور کوئی حصہ سلطنت کے ماتحت نہ رہا، اس کے اسباب درج ذیل بتائے جاتے ہیں:

(۱) دوآب کے درمیان خراج بہت وصول کیا جاتا تھا۔

(۲) سونے اور چاندی کے سکوں کے بجائے تانبے اور پیتل کے سکے استعمال ہو رہے تھے۔

(۳) خزانہ علائی کے خالی ہو جانے کی ایک یہ بھی وجہ تھی کہ خراسان اور ماوراء النہر کو فتح کرنے کے لئے تین لاکھ ستر ہزار سپاہیوں کا لشکر مرتب کیا گیا تھا۔

(۴) کوہ ہماچل کے لئے محمد تغلق نے اپنے بھانجے خسرو ملک کی سرکردگی میں ایک لاکھ سوار تیار کر کے بھیجے۔

(۵) بلا تفریق مذہب قتل عام کا رواج بھی اس کا ایک سبب تھا۔

ان وجوہات کی تفصیل یہ ہے:-

خراج کی زیادتی:- خراج زیادہ وصول کرنے کے بارے میں تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ محمد تغلق نے محض چند خیالی باتیں اپنے ذہن میں تخلیق کیں، اور انہیں کے تحت درمیان دوآب کا خراج دس سے بیس اور بیس سے چالیس تک بڑھا دیا، اس زیادتی سے عوام میں بغاوت کے جذبات پیدا ہو گئے، کاشت کاری میں رکاوٹ پیدا ہونے لگی، کاشت کاری کے کاموں میں خلل پڑتے ہی قہر خداوندی نازل ہوا، بارش اتنی کم ہوئی کہ دو تین سال تک برابر قحط پڑتا رہا، قحط سالی سے ہزاروں گھر برباد ہو گئے، اور فوجی لشکر کا شیرازہ بکھر گیا۔

خزانے کی تباہی:- شاہ محمد تغلق نے تسخیر ممالک کے نظریہ کو سامنے رکھا، اور موروثی سلطنت کی تباہی اور بربادی کا خیال دل سے نکال کر اس کی حفاظت اس طرح کرنا چاہی کہ خزانہ سونے اور چاندی کے سکوں سے معمور ہو گیا، اور ملک میں تانبے اور پیتل کے سکوں کا رواج کر دیا، محمد تغلق نے اپنی حد تک

[1] تاریخ فرشتہ اول ص ۴۴۳

یہ سوچا کہ وہ چین کی پیروی کر رہا ہے، اور جیسے چین میں کاغذ کا سکہ رائج ہے اسی طرح ہندوستان میں تانبے اور پیتل کے سکوں کا رواج ہو گیا، ہندوستان میں یہ طریق کار کامیاب ثابت نہ ہوا اور یہاں کے ہندو بے حساب تانبہ اور پیتل دار الضرب میں لانے لگے، اور اس سے لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں سکے ڈھلوا کر ان سے سامان اور ہتھیار خریدنے لگے، اور پھر اس مال کو دوسرے ملکوں میں چاندی اور سونے کے سکوں کے عوض فروخت کرنے لگے، اور اسی طرح سنار بھی شاہی سکہ کی ہو بہو نقل کر کے اپنے گھروں میں سکے ڈھالنے لگے۔ اس بدانتظامی کی وجہ سے بادشاہی فرمان دور دراز ملکوں میں اپنی اہمیت [illegible] اور منسوخ ہو گیا، اور لوگ بغاوت اور سرکشی کرنے لگے، یہ سرکشی اس حد تک پہنچ گئی کہ خود پایۂ سلطنت اور اس کے آس پاس کے ملکوں میں تانبہ اور پیتل کے سکے کوڑیوں کے بھاؤ بھی نہ خریدے جاتے تھے۔

بادشاہ کو اس بغاوت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا اور اس نے حکم دیا کہ تمام تانبہ اور پیتل کے سکے خزانہ شاہی میں جمع کر دیئے جائیں، اور اس کے عوض چاندی اور سونے کے سکے لوگوں کو دے دیئے جائیں، بادشاہ نے اس خیال کے تحت یہ حکم نافذ کیا تھا کہ شاید اس طرح پیتل اور تانبے کے سکوں کی لوگ قدر کرنے لگیں، لیکن اس کا اثر بادشاہ کی توقع کے خلاف الٹا ہوا، اور لوگ بوریوں میں بھر بھر کر تانبہ اور پیتل کے سکے لاتے، اور خزانہ شاہی میں داخل کر دیتے اور اس کے عوض سونے چاندی کے سکے وصول کر لیتے، اس تبادلہ سے رعیت تو مالا مال ہو گئی، لیکن خزانہ شاہی تانبہ اور پیتل کے سکوں کی آماجگاہ بن گیا، خزانہ کی تباہی کا اثر انتظام سلطنت پر پڑنا لازمی تھا، نتیجہ میں سلطنت کا نظام بگڑ گیا اور ملک میں ابتری پھیل گئی۔

ملک گیری کا سودا:- بادشاہ کے سر میں ملک گیری کا سودا سمایا ہوا تھا، محمد تغلق کے دربار میں ایران و خراسان کے شہزادے اور امراء اور اراکین دولت اپنے اپنے وطن سے بیزار ہو کر ہند میں آئے، اور بادشاہ سے قربت حاصل کی، دربار میں ان کا عمل دخل شروع ہو گیا، ان لوگوں نے بادشاہ کو یقین دلایا کہ ایران و توران کو سر کرنا بہت آسان ہے۔

محمد تغلق نے جہاں گیری کا ارادہ مصمم کر لیا، ان ایرانی اور خراسانی امراء اور شاہزادگان کو انعام و اکرام سے سرفراز کرنا شروع کیا، تاکہ وہ حکومت سے بددل نہ ہوں، لشکر میں سرحدی فوج کے علاوہ تین لاکھ ستر ہزار سواروں کا اضافہ کیا، اور ان فوجیوں کے لئے گھوڑے اور دیگر ساز و سامان فراہم کیا گیا، پہلی مرتبہ تو ان نئے سپاہیوں کو سالانہ تنخواہ خزانہ شاہی سے دی گئی، لیکن مستقل طور پر ان سپاہیوں کو مطمئن کرنا بہت دشوار تھا، کیونکہ انہیں جس مقصد کے لئے رکھا گیا تھا وہ پورا ہوتا ہوا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان ملازمین

[1] [illegible]

سے کوئی کام بھی نہ لیا گیا، اور جب نئے ملک تسخیر نہیں کیے گئے تو مالِ غنیمت بھی نہیں ملا، ان وجوہ کی بنا پر سپاہیوں کے حسابات چکانا مشکل ہو گیا، اخراجات کے بوجھ سے خزانہ بالکل خالی ہو گیا اور ابھی ایک ہی سال گزرا تھا کہ ساری فوج میں بدانتظامی پھیل گئی اور سیاسی بساط بالکل ہی الٹ گئی۔

کوہ ہماچل کی تسخیر کا ارادہ:۔ بادشاہ نے کوہ ہماچل کو فتح کرنے کے لئے ایک لشکر عظیم روانہ کیا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ اس کو چین اور ہماچل (جو ہندوستان اور چین کے مابین واقع ہے) فتح کرنے کی دھن سمائی، لہٰذا اس نے اپنے بھانجے خسرو ملک کی سرکردگی میں ۷۳۸ھ میں ایک لاکھ تجربہ کار سوار، درباری امراء اور ارکین دولت کو اس مہم پر روانہ کیا، ارکین دولت نے بارہا اشارتاً بادشاہ کو سمجھایا کہ یہ کام مشکل ہے، کیونکہ آج تک کسی بادشاہ ہند نے چین پر قبضہ کرنے میں کامیابی حاصل نہیں کی، لیکن شاہ محمد تغلق کا ارادہ بڑا ہی مستحکم تھا، اور اس نے اس سے سرمو تجاوز نہیں کیا، آخر کار مجبوراً خسرو ملک اور اس کے ساتھی کمربستہ ہوئے اور دہلی چل کر کوہ ہماچل جا پہنچے، جب خسرو ملک مع لشکر چین کی سرحد پر پہنچا تو وہاں کی آبادی، امرائے چین کی شوکت و عظمت، جاہ و جلال، شہر کے قلعوں کی اونچائی، راستوں کی تنگی، رسد رسانی کی مشکلوں کا تصور کر کے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، اور اس بات پر آمادہ ہو گیا کہ بغیر لڑائی کیے ہوئے ہی واپس لوٹ جائے، اسی دوران برسات کا موسم آ گیا، اور اس سفر میں مسلمان جن راستوں سے سرحد تک پہنچے تھے وہ بارش کی وجہ سے مٹ گئے، اس لئے اسلامی لشکر کو واپسی میں بے حد مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا۔

اور مزید ستم یہ ہوا کہ قحط کی بلا نے آگھیرا، مصیبتوں کی کوئی حد نہ رہی اور اسی رات بہت زوروں کی بارش ہوئی اور سیلاب نے سارے لشکر کو اس بری طرح سے گھیر لیا کہ گھوڑوں پر سوار ہو کر چلنا اور تیرنا بھی دشوار ہو گیا، تمام فوج پندرہ دن کی بھوک سے پریشان ہو کر راہی ملک عدم ہوئی، گنتی کے چند سپاہی، اور بعض وہ لوگ جو لشکر سے تھوڑی دور نکل آئے تھے زندہ بچے اور اس بلائے ناگہانی سے بچ کر ہندوستان واپس لوٹ آئے۔[۱]

مرکز کی تبدیلی

ملک میں ان حالات کی وجہ سے جابجا بغاوتوں کا دور شروع ہو گیا، بادشاہ کو بھی اس کا احساس ہو گیا کہ غالباً سارا ہندوستان دہلی کی شہنشاہیت سے منحرف اور باغی ہوتا جا رہا ہے، لہٰذا اب پایۂ تخت کے لئے کسی ایسے مقام کو منتخب کیا جائے جس سے ساری رعایا کی حفاظت اچھی طرح ہو سکے، چند ارکان

۱ تاریخ فرشتہ اول ص ۴۴۳

سلطنت نے دیوگڑھ[۱] کی طرف بادشاہ کا رجحان دیکھ کر اُسے مرکز سلطنت بنانے کا مشورہ دیا، لہٰذا بادشاہ کو ان امراء کا مشورہ پسند آیا، اور فرمان جاری کر دیا کہ وہ دہلی جس پر مصر بھی رشک کرتا تھا ویران اور سنسان کر دی جائے، اور تمام شہری، مرد، بچے، بوڑھے، جوان سب دیوگڑھ منتقل ہو جائیں، جو غریب ہوں اور جن کے پاس سفر خرچ نہ ہو اُسے خزانہ شاہی سے روپیہ دیا جائے، اور حکم تھا کہ دہلی سے دیوگڑھ تک ہر ہر منزل پر مسافروں کے لئے سرائیں بنوائی جائیں اور سڑک کے آس پاس سایہ دار درخت لگائے جائیں، دیوگڑھ کا نام دولت آباد رکھا، اور اس میں عظیم الشان عمارتیں بنوانا شروع کیں، نقلِ مرکز سے رعیت کی حالت بھی بدل گئی اور سلطنت کی مہمات میں افراتفری پھیل گئی، اس زمانہ تغیر و تبدل میں خواجہ حسن دہلوی کا انتقال ہو گیا، اور ان کا مدفن بھی دولت آباد ہوا، جس کی آبادکاری کی کہیں اور مثال نہیں ملتی، اس طرح دنیا میں اور کوئی شہر آباد نہ کیا گیا ہو گا، اگرچہ آب و ہوا کے لحاظ سے دولت آباد اچھا شہر ہے، لیکن سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ایران و توران سے بہت دور تھا۔[۲]

محمد تغلق کی سیاست

دوران سفر بادشاہ نے ایک دن ضیا برنی سے کہا (یہ تاریخ فیروز شاہی کا مصنف ہے) کہ عام خیال ہے کہ ملک میں ریشہ دوانیاں بادشاہ کی سیاست سے پھیلتی ہیں، لیکن بادشاہ نے کہا کہ وہ اپنا ہاتھ بے کار رکھنا نہیں چاہتا ہے، اس نے تاریخ دان ضیا برنی سے دریافت کیا کہ تم نے تاریخ کی بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔ بتا سکتے ہو کہ بادشاہ کی سیاست کن کن موقعوں پر درست اور حق بجانب ہوتی ہے؟ علامہ برنی نے جواب دیا کہ تاریخ کسروی میں رقم ہے کہ بادشاہ کے پاس سات مواقع ایسے ہیں جب وہ اپنی سیاسی حکمتِ عملی سے کام لے سکتا ہے، یہ ساتوں (۷) مواقع مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) دین حق سے ہٹ جانا (مرتد ہو جانا) (۲) جان بوجھ کر خونِ ناحق کرنا (۳) شادی شدہ مرد کا شوہر والی عورت کے ساتھ زنا کرنا۔ (۴) بادشاہ وقت کے ساتھ سرکشی کرنا (۵) کسی ہنگامہ اور بغاوت کا سردار بن کر فساد برپا کرنا، (۶) جب رعایا سرکشوں، باغیوں سے مل جائے، اور اسلحہ و روپیہ پیسہ سے ان کی مدد کرے، (۷) بادشاہ کے احکام سے پھر جانا اور مکمل طور پر اس پر عمل نہ کرنا۔

محمد تغلق نے اس پر دریافت کیا حدیث صحیح سے کن کن جرائم کے متعلق ثابت ہوتا ہے، اس پر علامہ

۱ دیوگڑھ جس کا نام دولت آباد رکھا گیا دکن میں واقع ہے۔ ۲ تاریخ فرشتہ اول ص ۴۴۳

برنی نے فرمایا کہ پہلی تین قسموں کے بارے میں صحیح حدیثیں موجود ہیں، یعنی ارتداد، زنا اور قتل کے بارے میں فقہ کے مسائل اور حدیثوں کی تفصیل میں صاف لکھا ہوا ہے، اس کے علاوہ باقی چار جرائم ملک کی فلاح اور اصلاح مملکت کے خیال سے مخصوص بادشاہوں کیلئے وضع کئے گئے ہیں۔

محمد تغلق نے اس پر یہ جواب دیا کہ پرانے زمانے کی رعایا فرماں بردار تھی، اس کے اعمال و اقوال میں شرافت اور صداقت تھی، لیکن اس دور میں اچھائیاں برائیوں میں تبدیل ہوگئیں اور گردشِ لیل و نہار کی وجہ سے بادشاہ کو خود مخلوق خدا کے خون سے ہولی کھیلنا پڑتی ہے، لہذا بادشاہ کے خیال میں اس کے مظالم کا خاتمہ اسی طرح ہوسکتا ہے کہ یا تو رعایا ان افعالِ بد سے باز آجائے یا وہ دنیا سے اُٹھ جائے، ورنہ اسی سیاست پر عمل کرنا ضروری ہے، نیز بادشاہ کے پاس کوئی ایسا دانشمند وزیر بھی نہیں جو امور سلطنت میں مدد دے اور رعایا کو برہم نہ ہونے دے۔[۱]

شاہ محمد تغلق کی وفات

سفر کے دوران عاشورہ کا دن آگیا، بادشاہ نے عادت کے موافق روزہ رکھا، اور پرانا مرض بخار عود کر آیا، مرض رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا تھا، بخار کی گرمی سے بے چینی اور پریشانی بڑھ رہی تھی حتی کہ ۲۱ محرم ۷۵۲ھ مطابق ۱۳۵۱ء کو اپنی تمام شان و شوکت چھوڑ کر خالی ہاتھ دنیا سے رخصت ہوا۔

چہ بر تخت مُردن، چہ برروئے خاک (تخت پر اور مٹی پر مرنا دونوں برابر ہے)

اس بادشاہ نے ستائیس (۲۷) سال تک حکمرانی کی۔

شاہ محمد تغلق کی قساوتِ قلبی کا سبب

تاریخ فیروز شاہی کا مصنف ضیاالدین برنی جو ایک باقاعدہ صوفی اور روحانی معاملات میں اصلاحی طبقے کے خلاف قدامت پسند گروہ کا ترجمان تھا لکھتا ہے "اس بادشاہ کو عنفوانِ شباب میں بدمذہب" سعد منطقی" اور بداعتقاد "عبید شاعر" کے ساتھ صحبت و مجالست کا اتفاق ہوا، اور مولانا علم الدین جو فلسفہ کے بڑے عالم تھے بہت عرصہ تک بادشاہ کی خلوت میں آتے جاتے رہے، اور وہ نوجوان مرد جو مرض

۱ تاریخ فرشتہ اول ص ۴۴۶

معقولات میں مستغرق اور مبتلا، تھے اپنی گفتگو اور مباحثہ اور نشست و برخاست کے دوران علمِ معقولات کو (جو مذہب اہل سنت والجماعت سے بے اعتقادی کا ذریعہ اور نبوت کے ایک لاکھ چوبیس ہزار نقطوں کی تنبیہات و تعزیرات کے ضعف و نا استواری کا سبب ہے) سلطان محمد کے دل میں اس طرح پختہ کر دیا کہ معقولات کتب سماوی اور احادیث انبیاء کے لئے (جو ایمان کا سرمایہ، اسلام کے ستون اور منبع نجات و درجات ہیں) اس کے دل میں کما حقہ جگہ نہ رہی، اور جو کوئی چیز معقولات کے خلاف ہوتی وہ اُسے نہ تو سنتا اور نہ ہی قبول کرتا، اگر معقولات فلسفہ سلطان محمد تغلق کے دل کا احاطہ نہ کر لیتے، اور معقولات آسمانی سے اس کو پورا ذوق و شوق ہوتا تو وہ اپنی گوناگوں خوبیوں اور اوصاف کے باوجود ہرگز ایسا نہ کرتا کہ خدائی اور نبوی احکام کے باوجود اور انبیاء اور علماء کے ارشاد کے خلاف مسلمانوں کے قتل کا حکم دیتا، لیکن چونکہ معقولات فلاسفہ نے جو قساوت و سنگ دلی کا ذخیرہ ہیں اس کے دل پر پورا قبضہ کر لیا تھا اور معقولات کتب سماوی اور احادیث نبوی کے لئے جو رقت اور سکینت پیدا کرتی ہیں اور آخرت کا خوف دلاتی ہیں اس کے دل میں کوئی جگہ نہ رہی تھی، اس لئے مسلمانوں کی سزا دہی اور کلمہ گویوں کا قتل اس کی طبیعتِ ثانیہ ہو گئی، اور یہ جو اس نے اس تعداد میں علماء، مشائخ، سادات و صوفیا، قلندروں، منشیوں اور سپاہیوں کو سزا دی، اس کا باعث علم معقولات کے برے اثرات اور علم منقولات کی کمی تھی۔"

(ترجمہ از تاریخ فیروز شاہی ص ۶۵ بحوالہ آب کوثر)

تاریخ فرشتہ میں بھی محمد تغلق کی نسبت لکھا ہے "نیز وہ اپنا اکثر وقت فلسفیوں کی معقولات میں صرف کرتا اور روایات و نقلیات میں سے اس چیز کی تصدیق کرتا جو عقلیات کے مطابق ہوتی۔"

سلطان فیروز شاہ تغلق[۱]

حضرت شیخ نصیر الدین محمود چراغ اور دیگر علماء اور اولیاء نیز اراکینِ سلطنت کی ایک جماعت باہم صلاح و مشورہ کر کے ملک فیروز تغلق کی خدمت میں حاضر ہوئی، ان بزرگان نے مرحوم سلطان کے منتخب کردہ ولی عہد سے کہا کہ محمد تغلق نے اپنے مرتے وقت ہی آپ (فیروز شاہ تغلق) کی ولی عہدی کا اعلان کر دیا تھا، اب اس وقت یہی حالات کا تقاضہ ہے کہ سلطنت کے کاموں کو معرضِ التواء میں نہ ڈالا جائے، اور بادشاہ کا ولی عہد تخت پر مسند نشین ہو کر عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے، تاکہ ملک میں

۱ فیروز شاہ تغلق محمد تغلق کا چچازاد بھائی تھا اور غیاث الدین کا بھتیجا تھا۔

سکون و آرام پیدا ہو جائے، فیروز تغلق نے سفرِ حجاز اور زیارت حرمین شریفین کا عزم ظاہر کیا، اور مسند نشین ہونے سے انکار کر دیا، لیکن ان امراء اور علماء نے اس کی ایک نہ سنی، اور اس پاک طینت نیک نیت حکمران کو مجبور کر دیا۔

۷۵۲ھ مطابق ۱۳۵۱ء میں فیروز شاہ نے علماء اور اراکین سلطنت کے اصرار پر حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی، مسند نشینی کے وقت تقریباً پچاس سال کا تھا، سب سے پہلا کام جو اس نے کیا وہ ان قیدیوں کی رہائی تھی جنہیں محمد تغلق نے جیل خانوں میں ڈالا تھا، اور جن لوگوں کو محمد تغلق نے قتل کروایا تھا ان کے پسماندگان کو خون بہا دیا، اس کے علاوہ پرانے بادشاہوں نے جو دیہات، اراضی یا دوسری جائیدادیں، ناجائز طور پر ضبط کر کے بادشاہی مقبوضات میں داخل کر لی تھیں ان کو واپس کیا، فیروز شاہ نے اعلان کیا جو کوئی شرعی عدالت کے سامنے اپنے حقوق ثابت کرے گا اُسے اس کی جائیداد واپس مل جائے گی، چنانچہ بہت سے لوگوں نے اپنے حقوق ثابت کر کے جائیدادیں واپس لیں لے۔

فیروز شاہ تغلق نے نہایت کامیاب حکمران کی طرح حکومت کی، عدل و انصاف اس کے خاص جوہر تھے، ملک میں خوش حالی اور شادابی پھیل گئی، بادشاہ نے تمام امراء اور اراکین سلطنت کو حسب مقدور عہدے اور القاب سے نوازا، حضرت شیخ بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے بیٹے شیخ صدر الدین کو "شیخ الاسلام" کا لقب عطا فرمایا۔

شہزادے فتح خان کی تعلیم و تربیت

بادشاہ نے شہزادے کے لئے اتالیق اساتذہ اور انتظام کرنے والے جو نہایت باادب تھے متعین کیے، شہزادہ چھوٹا تھا اس کے باوجود اپنا وقت کھیل تماشوں میں ضائع نہ کرتا، اور صبح سے لے کر رات گئے تک مطالعہ میں مصروف رہتا، مجلسِ علم میں، بہت سنجیدہ اور سواری میں بہت تیز تھا، بڑے سے بڑا اہم اور مشکل کام اس کے مصاحب اس کے سامنے رکھتے اور یہ نوعمر شاہزادہ اِن مقدمات کا اس خوبی سے فیصلہ کرتا کہ دربار کے بڑے بڑے عقلاء حیرت میں انگشت بدنداں رہ جاتے۔

شہزادے کے صبر و تحمل اور ہمدردی کی مثال

ایک دن کا واقعہ ہے کہ شاہزادہ مدرسہ سے محل کی طرف چلا، راستہ میں ایک ضعیفہ نے فریاد کی کہ اس کا شوہر اور بیٹا سنار گاؤں سے کچھ مال اسباب خرید کر لا رہے تھے کہ فتنہ گروں نے ان کا مال لوٹ لیا، اور یہ دونوں اسی تباہ شدہ حالت میں لشکر تک پہنچے، لیکن شاہی سپاہیوں نے انہیں جاسوس سمجھ کر گرفتار کر کے نظر بند کر دیا، بوڑھی عورت نے اپنی درد بھری کہانی سنائی اور داد چاہی، شہزادے نے بوڑھی عورت سے کہا کہ وہ اپنے دعویٰ کو سچا ثابت کرنے کے لئے ایسے دو شاہد لائے جو قابلِ اعتماد ہوں، ضعیفہ نے کہا کہ گواہ تو بہت ہیں لیکن انہیں آپ شہزادے تک لانے کے لئے جانے اور پھر واپس آنے میں کافی وقت لگ جائے گا، پھر دوبارہ شہزادے تک آنا بہت دشوار ہو جائے گا، شہزادہ ہنسا اور کہا کہ تم جا کر گواہ لاؤ، میں یہیں کھڑا ہوا ہوں، بڑھیا اطمینان کے ساتھ چلی گئی، سلطنت ہند کا نگہبان تخت و تاج کا حکمران سخت دھوپ میں تپتے ہوئے میدان میں کھڑا رہا، لوگوں نے بار بار کہا کہ کسی درخت کے سایہ میں آرام کریں، شہزادے نے جواب دیا کہ ضعیفہ اسی جگہ پر آئے گی، اور میں نے اس سے وعدہ کیا ہے، لہٰذا اس جگہ سے سرمو تجاوز کرنا وعدہ خلافی ہوگا۔ اور ایفائے عہد نہ کرنا بادشاہوں کے لئے سب سے بڑا عیب ہے، مختصر یہ ہے کہ شہزادہ اسی طرح دھوپ میں کھڑا رہا یہاں تک کہ ضعیفہ اپنے گواہ لے آئی، اس کو لے کر اپنے باپ کے دربار میں دادخواہی کے لئے حاضر ہوا۔

دربار میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بادشاہ ہنوز آرام فرما رہے ہیں، شہزادے نے بادشاہ کے بیدار ہونے کا انتظار کیا، کافی دیر کے بعد بادشاہ بیدار ہوا اور شہزادے نے بڑھیا کا سارا حال بیان کیا، اس کے خاوند اور بیٹے دونوں کو قید سے رہائی دلائی، اس کے بعد ہی شہزادہ محل میں آیا اور دس بجے دن کا کھانا اس نے سہ پہر کے وقت کھایا۔

فتوحاتِ فیروز شاہی

سلطان فیروز شاہ تغلق کے خود تحریر کردہ حالات ایک تصنیف میں پائے جاتے ہیں، جو "فتوحات فیروز شاہی" کے نام سے موسوم ہے، یہ پہلا حکمران تھا جس نے افغانوں پر رحم و کرم کی بارش کی، اور ان افغان امراء کو بڑے بڑے منصب دیئے، اور سرحد کے تحفظ کے لئے بھی انہیں امراء کو مقرر کیا، سلطان

فیروز امیر تیمور صاحبقران کا ہم عصر تھا، علامہ ضیا برنی نے تاریخ فیروز شاہی کی تصنیف اسی حکمران کے عہد میں کی، اسی فرماں رواں کے نام سے یہ کتاب موسوم کی، نظام الدین احمد اپنی کتاب میں تحریر کرتا ہے کہ بہت سے قوانین اور آئین عدل وانصاف فیروز شاہ کے ہی دور حکومت میں وضع کیے گئے، جس کی وجہ سے تمام رعایا اور مخلوق خدا نے چین وامن سے زندگی گزاری، ان تمام قوانین میں سے تین ضابطے قابل قدر اور ناقابل فراموش ہیں۔

پہلا ضابطہ:۔ بادشاہ نے سیاست کو جو حکمرانی کا عظیم حصہ ہے بالکل چھوڑ دیا، اپنے عہد حکومت میں کسی ذمی یا غیر مسلم کو کسی طرح کی سزا نہیں دی، اس بلند ہمت فرماں رواں نے اپنی سخاوت اور دریا دلی سے حکومت پر جو سیاہ داغ پڑ گئے تھے انہیں دھو دیا، دفتر حکمرانی سے سیاست کو پاک کیا، وہ صرف بادشاہ ہی نہیں، بلکہ مربی تھا، ساری رعایا اس کی شیدائی تھی، ملک کا بچہ بچہ اس کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔

دوسرا ضابطہ:۔ رعایا کی حیثیت اور استطاعت کا لحاظ کر کے خراج وصول کرتا، خراج میں زیادتی کرنا بالکل بند کر دیا تھا، وہ کسی کی چغلی اور شکایت بالکل نہ سنتا، یہی وہ قانون تھا جس نے فیروز شاہ کے عہد حکومت کو بلند اقبالی کی برکتیں عطا کی تھیں۔

تیسرا ضابطہ:۔ ہمیشہ خدا ترس، رحم دل اور نیک لوگوں کو عامل مقرر کرتا، کسی بد طینت اور خراب شخص کو کبھی حکمرانی کا درجہ نہ دیتا تھا، چونکہ بادشاہ خود مجسمہ محاسن تھا، اسی باعث تمام امراء اور حاکموں میں بھی اس کی انہیں خوبیوں کا عکس نظر آتا ہے، فیروز شاہ کی بخشش وکرم وسخاوت کا پلہ دوسرے حکمرانوں کے مقابلہ میں ہمیشہ بھاری رہا، اس عادل حکمران نے اپنی تصنیف ''فتوحات فیروز شاہی'' کی ساری عبارت فیروز آباد کی مسجد کے آٹھوں گنبدوں پر کندہ کرائی ((یہ مسجد اسی کی تعمیر کردہ ہے) اس کتاب میں وقائع فیروز شاہی کو آٹھ اسباق میں تقسیم کیا گیا ہے، مشہور ہے کہ بادشاہوں کا کلام سارے کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے، اسی خیال کے تحت ''فیروز شاہی'' کی مختصر عبارت تبرک کے طور پر تحریر کی جارہی ہے، اس سے مقصود یہ ہے کہ اس بلند ہمت، رحم دل بادشاہ کی نیک نیتی اور ستودہ صفاتی سے قارئین اور اہل نظر پوری طرح واقف ہو جائیں۔

پہلی فصل میں مسجد کے اوقاف اور اس کے اخراجات کے بارے میں نصیحت کی ہے، اور وصیت کے بیان میں ہے، دوسری فصل میں فیروز شاہ تحریر کرتا ہے کہ قدیم زمانے میں معمولی جرائم کی بھی سزائیں بہت سخت ہوتی تھیں، بے خطاؤں کا خون بہانا، اور دیگر ہیبت انگیز عذاب نازل کرنا، مثلاً ناک، کان، ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالنا، آنکھیں نکلوا دینا، ہڈیوں کو لوہے کی سلاخ سے توڑنا، زندہ آگ میں جلا دینا، ہاتھ اور پاؤں میں لوہے کی میخیں ٹھونکنا، کھال اتروا دینا، بیچ کاٹ ڈالنا، جسم کے دو ٹکڑے کر دینا یا

اسی طرح کی بہت سی وحشت ناک سزائیں تجویز کرنا، سیاسی حکمت عملی کے لئے بہت ہی آسان کام تھا، اور خداوند رب العزت نے مجھے یہ توفیق عطا کی کہ ان تمام سزاؤں کو ایک قلم ختم کر دیا، پرانے بادشاہ جن کی عالی ہمتی اور جاں فشانی سے ہندوستان مسلمانوں کا دار السلطنت بنا ان کے وفات پا جانے کے بعد رعایا کے دلوں میں ان کی یاد بھی باقی نہ رہی، ان کے نام خطبات سے نکال دیئے گئے تھے میں نے اپنے عہد حکومت میں ان شاہان سلف کے نام خطبہ میں از سر نو داخل کرائے، تاکہ دلوں میں ان کی یادگار قائم رہے، اور ان کی روح کو ثواب پہنچتا رہے، رقم کی بہت سی مدیں محض ظلم واستبداد کے تحت رعیت سے وصول کی جاتی تھیں، اور خراج کے ساتھ شاہی خزانے میں جمع کر دی جاتیں، مثلاً۔ رقومات چرائی، گل فروشی، نیکیری، ماہی فروشی، ریسمان فروشی، کوتوالی اور احتساب وغیرہ وغیرہ، میں نے ان تمام رقومات کو وصول کرنا بالکل بند کر دیا اور یہ عہد کر لیا کہ جو مال سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہے وہ خزانہ فیروز شاہی میں ہرگز داخل نہ کیا جائے گا۔ میرے عہد سے پہلے یہ طریقہ تھا کہ مال غنیمت کا چوتھائی حصہ سپاہیوں کو بانٹ دیا جاتا تھا، اور باقی تین حصے خزانہ شاہی میں داخل ہو جاتے، میں نے اس رسم کو بھی موقوف کر دیا، اور پانچواں حصہ جیسا کہ شرع میں جائز ہے خزانہ میں رکھا جاتا، اور چار حصے سپاہیوں میں تقسیم کر دیئے جاتے، بد مذہبوں، بدعہدوں، ملحدوں، کافروں، اور بدعتیوں کو اپنی راجدھانی سے نکال دیا جو خدا کی مخلوق کو گمراہ کر رہے تھے، ان فرقوں کی کتابوں کی عبارتیں اور رسم ورواج کو بھی ایک قلم منسوخ کر دیا، مردوں میں سونے چاندی کے برتن استعمال کرنے اور ریشمی لباس پہننے کا رواج عام ہو گیا تھا، میں نے ان تمام عادتوں کو سرے سے ختم کر دیا، مسلمان اور ضرورت مند عورتیں مزاروں اور بت خانوں میں جا کر شور وشر کا سبب ہوتی تھیں میں نے حکم دے دیا کہ ایسے اجتماع میں عورتیں ہرگز ہرگز شرکت کے لئے نہ جائیں، بت خانوں کے بدلے مسجدیں بنوائیں، پرانی بادشاہوں کی بنوائی ہوئی پرانی مسجدیں، خانقاہیں، مدارس، کنویں، پل اور مقبرے جو بہت بوسیدہ ہو گئے تھے ان کی از سر نو تعمیر کرائی، اور ان کے لئے الگ الگ اوقاف مقرر کر دیئے، جن اشخاص کو میرے مالک وسلطان محمد تغلق شاہ۔ نے اپنی آہنی سیاست کے شکنجہ میں جکڑ کر ان کے بدن کے اعضاء کٹوائے تھے میں نے ان تمام اعضاء بریدہ لوگوں کے وارثوں اور جانشینوں کو تلاش کر کے ان کا وظیفہ اور انعام واکرام مقرر کیا، اور ان سب سے سلطان مرحوم کے نام الگ الگ معافی نامے لکھوائے، اور تمام کاغذات پر شہر کے شرفاء اور عمائدین کے دستخط کرا کے تمام نوشتے مرحوم بادشاہ کے مقبرہ میں رکھوا دیئے، جہاں کہیں بھی سنتا کہ کوئی درویش اور گوشہ نشین فقیر آیا ہے وہاں آتا فوراً اس کی خدمت میں حاضری دیتا اور خدمت کرتا، جو سپاہی اور امراء ضعیف ہو چکے تھے ان کو نصیحت کرتا کہ وہ اپنے پچھلے گناہوں کی معافی مانگیں اور دوبارہ گناہوں سے باز

Scanned by CamScanner

آئیں، اور ان کے وظائف مقرر کر دیئے تاکہ فکرِ معاش نہ کریں اور پوری تندہی سے خدا کی عبادت میں مشغول ہو جائیں، ان واقعات کے بعد بادشاہ لکھتا ہے کہ مجھے دو مرتبہ زہر دیا گیا، اور میں نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے زہر کا پیالہ پی لیا، لیکن خدا نے زہر کو اپنا کام نہ کرنے دیا، اور میں محفوظ رہا۔

اس نیک نفس حکمران کے عہد میں رعیت کی فلاح و بہبود کے لئے مساجد، مدارس، خانقاہیں اور رفاہ عامہ کے بہت سے تعمیری کام ہوئے، مثلاً مقبرے، کنویں، تالاب اور پل وغیرہ کثیر تعداد میں بنوائے گئے ان کے علاوہ رعیت کی رفاہ اور ملک کی فلاح کے لئے لاتعداد باغات بنوائے تھے، بادشاہ نے ہر عمارت تعمیر کرا کے اس کے اخراجات کے لئے آمدنی وقف کر دی اور ہر وقف کا ایک نوشتہ لکھ کر اس کے اجرار کے لئے حکم نافذ کر دیا[1]

فیروز شاہ تغلق کی رحلت

تیرھویں رمضان ۷۹۰ھ میں فیروز شاہ تغلق نے تقریباً نوے (۹۰) سال کی عمر میں انتقال فرمایا، اس بادشاہ نے تقریباً انچاس (۴۹) سال تک حکمرانی کی، یہ عالم و فاضل تھا، عدل اس کے کردار کی نمایاں خوبی تھی، رحم و بردباری اس کی شخصیت کے نمایاں جوہر تھے، اس کی رعیت اور سپاہ دونوں ہی پوری زندگی اس سے خوش رہے، اس کے دورِ حکومت میں کسی متنفس کو سرکشی اور بغاوت، جور و استبداد کی اجازت نہ تھی۔

تغلق خاندان کے آخری جانشینوں کی مختصر روئیداد

فیروز شاہ تغلق کی وفات ۷۹۰ھ مطابق ۱۳۸۸ء میں ہوئی، اس کے بعد تخت کے دعوے داروں[2] میں خانہ جنگی ہوئی، جو فیروز شاہ کے جانشین ہوئے وہ بڑی ذمہ داریوں کے اہل نہ تھے، چنانچہ حکومت دہلی کا اختیار بہت کم ہو گیا، اور رہا سہا اقتدار تیمور کے حملہ نے مٹا دیا جو ۱۳۹۸ء میں افغانستان کے راستے سے ہندوستان آیا، راستے میں جہاں کہیں گزرا، قہر الٰہی کی طرح علاقوں کو تاخت و تاراج اور باشندوں کا

۱ آب کوثر ص ۴۷۰ ۲ تخت کے جانشین غیاث الدین تغلق ثانی بن فتح خان (مدت حکومت ۵ مہینے) ابوبکر شاہ بن ظفر خان بن فیروز شاہ (مدت حکومت ۱ سال چھ مہینے) محمد بن فیروز شاہ (مدت حکومت ۶ سال ساتھ مہینے) سکندر شاہ بن محمد شاہ (مدت حکومت ڈیڑھ ماہ) سلطان محمود بن محمد تغلق، تغلق خاندان کا آخری فرماں رواں (مدت حکومت ۲۰ سال دو مہینے)

قتل کرتا آیا، دہلی میں تغلق خاندان کا آخری فرماں رواں محمود تغلق بادشاہ تھا، وہ دہلی چھوڑ کر گجرات فرار ہو گیا، تیمور نے دہلی شہر کو لوٹا، اور باشندوں کا قتل عام کیا، پھر میرٹھ اور جموں کے راستے واپس گیا، بتایا جاتا ہے کہ تیمور نے دہلی میں پندرہ دن قیام کیا۔

جب تیمور چلا گیا تو محمود تغلق واپس آیا، اور تخت دہلی پر قابض ہو گیا، لیکن تیمور نے دہلی کو ایک بے جان جسم کی طرح چھوڑا تھا، دہلی میں مختلف ریشہ دوانیوں کی وجہ سے ایک طرح کا انقلاب آچکا تھا، سلطنت کی مضبوطی اور طاقت ختم ہو رہی تھی، ملک میں چاروں طرف بغاوت و سرکشی کے علم بلند ہو رہے تھے، اب دہلی کے بادشاہ میں اتنی سکت نہ رہی تھی کہ باہر کے صوبے داروں سے اپنا حکم منوا سکے، چنانچہ دہلی کا حاکم فقط دہلی اور اس کے گرد و نواح کا صوبے دار تھا، باقی تمام وسیع صوبوں پر خودمختار حکمران قابض تھے، بنگال، جونپور، مالوہ، گجرات، دکن وغیرہ میں مسلمانوں کی خودمختار حکومتیں قائم ہو گئیں، بعض جگہ ہندو راجہ خودمختار ہو گئے۔

تغلق خاندان کا آخری فرماں رواں سلطان محمود تغلق ۸۱۵ھ مطابق ۱۴۱۲ء میں انتقال کر گیا، اس کے ساتھ ہی شہاب الدین غوری کے غلاموں کی حکومت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور غلامانِ ترک کے ہاتھوں سے حکمرانی جاتی رہی، اس کے بعد خاندان سادات اور خاندانِ لودھی یکے بعد دیگرے برسر اقتدار آئے، خاندانِ سادات نے تیمور کی مدداعانت اور پشت پناہی سے سلطنت کی باگ ڈور سنبھالی۔

دوصد سالہ شاہانِ ہند کے کارناموں کا تجزیہ وتبصرہ

قطب الدین ایبک سے لے کر خاندان تغلق تک

ہندوستان کا پہلا فرماں رواں سلطان قطب الدین ایبک ۶۰۷ھ مطابق ۱۲۱۰ء (جس کو شہاب الدین غوری نے تخت نشین کیا تھا) سے لے کر اس سلسلے کے آخری فرماں روائے خاندانِ تغلق تک کا عرصہ تقریباً دو سو سال ہوتا ہے، ان سب شاہان ہند میں اکثر کے درمیان کچھ باتیں قدر مشترک رہی ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) چنگیزی[1] اور تاتاری جنہوں نے اس عرصہ میں تمام اسلامی ممالک کو تہ و بالا کر دیا تھا، ہر جگہ تاتاری بے حساب انسانوں کا قتل کر کے اپنی حکومت کے جھنڈے گاڑ رہے تھے، اسی ملک گیری کی ہوس

۱ چنگیزی، تاتاری، مغل یہ ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں

بھی سلطان التمش کے دور سے اخیر تک کئی مرتبہ انھوں نے ہندوستان کا رخ کیا، مگر ان شاہان ہند نے پوری شدت کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور جان ومال کی بازی لگادی، ہر مرتبہ ان کو پسپا کیا اور مار بھگایا اور اس پورے عرصہ میں تاتاری ہندوستان میں داخل نہ ہو سکے اور شاہان ہند نے پورے ملک کو تاراج ہونے سے بچالیا۔ شاہان ہند کی بہترین سیاست یہ تھی کہ ان سرحدی علاقوں پر جاں باز اور وفادار حاکم متعین کرتے، جس کی بنا پر مغل اور تاتاری اس کے مقابلے کی تاب نہ لا سکتے اور بھاگ کھڑے ہوتے۔

(۲) دہلی کی حکومت کی ابتدا اس کے اطراف سے ہوئی تھی، ہر بادشاہ نے مملکت کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی کوشش کی حتی کہ ہندو راجاؤں سے تمام علاقے آزاد کرا کر مملکت اسلامی میں داخل کر دیئے، سلطان علاؤ الدین خلجی کے دور میں اس کی سرحدیں دور دراز تک پھیل گئیں، الغرض وسیع تر ملک بنا کر مملکت اسلامی کا جھنڈا بلند کیا، جس سے ان دور دراز علاقوں میں رہنے والے مسلمانوں کو راحت نصیب ہوئی اور اسلامی شعائر زندہ کرنے میں تقویت بھی ملی۔

(۳) ملک کے اندر امن وامان قائم رکھنے کی ہر ممکن کوششیں کیں، جابجا اور وقتاً فوقتاً اٹھنے والی بغاوتوں کا قلع قمع کیا اور حتی الامکان مخلوق خدا کے لئے امن وامان کی راہ ہموار کی، اور ملک میں ارزانی قائم رہے اس کے لئے ایسے قوانین کا اجراء کیا جس سے غریب شخص بھی مستفید ہو سکے اور ان شاہوں کی وفات کے بعد بھی مدتوں اہل ملک نے ان کے کارناموں کو یاد کیا اور ان کے ترانے گائے۔

(۴) ملک میں مسلمان اور اسلام کے پھلنے پھولنے کے مواقع پیدا کئے اور حتی الامکان تعاون کیا، نیز زیادہ تر سرداری والے بڑے بڑے عہدوں پر مسلمانوں ہی کو سرفراز کیا اور اس وقت حکمت عملی کا یہ تقاضا بھی تھا، مساجد، مدارس اور خانقاہوں کی تعمیرات کرائی اور رفاہ عامہ کے کام بھی بہت کئے، نیز تمام شاہان ہند سلاطین حنفی تھے، مسلمانوں کے لئے ان کا سنی حنفی ہونا بھی لائق صد شکر ہے۔ الناس علی دین ملوکهم

(۵) اس قدر بڑے ملک پر شان وشوکت کے ساتھ حکومت کرنے کی وجہ سے خلفاء عباسیہ سے فرمان حکومت بھی لیتے رہے، اور پروانۂ خلافت بھی، اس وقت اسلامی ممالک میں حتی کہ دار الخلافہ بغداد میں بھی تاتاریوں کی تاراجی اور ترکوں کی ترکتازی اور مسلمانوں میں خانہ جنگی زوروں پر تھی، گویا ان حالات میں ہندوستان کی اسلامی حکومت بغداد کی حکومت کا نعم البدل تھی۔

(۶) ہندوستان کی حکومت مطلق العنان بادشاہوں کے ہاتھوں میں تھی۔ اس لئے بعضوں سے ظلم و زور کی وارداتیں بھی ہوئیں، ملک گیری کے جذبہ کے ساتھ یہ وارداتیں ناگزیر ہیں، حتی الامکان نیک دل بادشاہوں نے اپنے اور پرائے کے معاملات میں عدل وانصاف سے کام لیا، غیروں کے ساتھ بھی رواداری برتی، اور ان میں سے بعضوں سے ایسے نادر واقعات عمل میں آئے کہ ہندو اکثریت نے بھی

ان کو خراج تحسین پیش کیا، اور ان میں علی وجہ الاتم مقبولیت حاصل کی۔

(۷) ہر خاندان میں کچھ حکمران نااہل بھی تخت نشین ہوئے، اس وقت عارضی طور پر ملک میں بدنظمی پھیل گئی اور کئی قسم کا نقصان پہنچا، مگر بعد میں آنے والے باشعور بادشاہ نے اس کو سنبھالا دے کر حکومت غیروں کے حوالے ہونے سے بچالی۔

(۸) پورے ہندوستان میں ابتداءً ہندو راجہ برسر اقتدار تھے، رعیت کی کثرت بھی ہندوؤں کی تھی، مسلمانوں کی مٹھی بھر تعداد کے اعتبار سے اس وقت آٹے میں نمک کے مانند تھی، اس کے باوجود اس ملک پر حکومت کرنا ان کی کمال بہادری، جرأت وہمت کا ثبوت ہے، وہاں ان کی حسن سیاست اور رواداری کا بھی بین ثبوت ہے۔

(۹) ہندوستان کا یہ دور صوفیائے کرام کا عہد زریں تھا، سلطان التمش اور بعض دوسرے بادشاہ اور اراکین سلطنت کے دل میں مذہبی رہنماؤں کا بڑا پاس ولحاظ تھا، اور ان کے ساتھ بعضوں کے عظمت وعقیدت کے ساتھ روابط تھے، سلطان علاؤ الدین خلجی جو مذہب سے نابلد تھا اور خود سر بادشاہ تھا پھر بھی اس نے مذہبی رہنماؤں کا پاس کیا، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء سے کئی دفعہ ملنے کی خواہش کی، لیکن حضرت نے کہلا بھیجا کہ میرے گھر کے دو دروازے ہیں اگر بادشاہ ایک دروازے سے داخل ہوا تو میں دوسرے دروازے سے باہر نکل جاؤں گا، اس ظالم وجابر بادشاہ نے برا نہ مانا، بلکہ حضرت کی خواہشات کا احترام کیا اور ان سے ملاقات کا ارادہ ترک کر دیا، ملتان کے شیخ رکن الدین کی خدمت میں اس نے کئی لاکھ ٹنکے نذر کیے، اس کا بیٹا اور ولی عہد خسرو خاں حضرت سلطان المشائخ کا مرید تھا، الغرض معاصرانہ تجربوں سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ کی خانقاہ دربار شاہی کے مقابلہ میں دوسری بارگاہ تھی، جہاں عوام اور امراء کسی خوف حکومت سے نہیں بلکہ ارادت وعقیدت کے جذبات سے متاثر ہو کر سر جھکاتے تھے۔

وقت کے بادشاہوں کے لئے مشائخ کا قدر دان ہونا بذات خود ان بادشاہوں کی عظمت کا نشان ہے گویا ان کے دل میں دین اور دین والوں کی قدر ومنزلت اور عظمت تھی۔

(۱۰) چنگیز خان کی ہنگامہ خیزیوں سے تنگ آکر ترکستان، ماوراء النہر، خراسان، عراق، آذربائیجان، فارس، روم اور شام وغیرہ مختلف ممالک میں علماء، صلحاء، مشائخ، ادباء، شعراء اور عالی نسب خاندان والوں کا گروہ در گروہ ہندوستان آتا تھا، شاہان ہند بالخصوص غیاث الدین بلبن ان مہمانوں سے بے حد خوش ہوتا اور خدا کی بارگاہ میں سجدۂ شکر بجالاتا، اور ان کی پوری قدر دانی کرتا، اور بلبن کا قاعدہ تھا کہ وہ اپنے[1]

[1] اس دور کا رائج سکہ مراد ہے

ان مہمانوں کے لئے علیحدہ علیحدہ محلّے آباد کرتا، اس قاعدے پر عمل کرنے کی وجہ سے ان عالی نسب مہمانوں کے بڑے بڑے پندرہ محلّے آباد ہو گئے تھے، گویا تاتاریوں کی تاراجی سے بچ نکل کر آنے والے شریف خاندانوں کے لئے یہ شاہانِ ہند ملجاً اور ماویٰ بنے ہوئے تھے۔

(۱۱) بعض بادشاہوں میں دین داری کے ساتھ صفاتِ عالیہ کا وجود پاک طینت اولیاءِ کرام کی صدائے بازگشت کا پرتو تھا، چنانچہ سماع کا سوز وساز ونعرہ ہائے ھو ومقام فنا وبقاء وحال مست ومحو ان خدائی مستانوں کی یہ کیفیات جس سے عوام وخواص میں دنیائے دوں کی حقیقت آشکارا ہوتی تھی، اور امورِ آخرت مستحضر ہو کر گلی کوچے مذاکرۂ موت وبعد الموت سے آباد رہتے تھے۔ سخت دل موم ہو کر رجوع الی اللہ کا عام ماحول قائم رہتا تھا، یہاں تک کہ ان حالات کی صدائے بازگشت شاہانِ وقت کے ایوانوں میں گونجتی تھی اور وہ بھی اس کا حصۂ وافر پاتے تھے، گویا ان بادشاہوں میں صفاتِ عالیہ کا وجود اسی صدائے بازگشت کا پرتو تھا۔

رواداری کی مثالیں اور شہادتیں

رواداری کے سلسلہ میں شاہانِ دین ودنیا کی مثالیں اور اقوال اور غیر مسلم مؤرخوں کی شہادتوں کے ساتھ قدرے تفصیل درج ہے، جس میں ہمارے لئے بھی درسِ بصیرت ہے، درج ذیل اقتباسات ''ہندوستان کے عہدِ ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی رواداری'' میں سے جستہ جستہ لئے گئے ہیں۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی تعلیم یہ تھی کہ راہِ سلوک میں جو گناہِ کبیرہ ہیں ان میں سے ایک مردم آزاری بھی ہے۔ (بزم صوفیہ ۷۸)

حضرت فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ عبادت وریاضت کے بعد صرف خلق اللہ کی خدمت ہی کی فکر زیادہ رکھتے، کوئی سرکاری عہدہ دار ظلم کرتا تو اس کو ظلم سے منع کرتے، بے قصوروں کو سزا سے بچاتے، کوئی فسق وفجور میں مبتلا ہو جاتا تو اس کو صحیح راستہ پر لگاتے، اس کے اخلاق کو درست کرنے کی کوشش کرتے۔ (بزم صوفیہ ص ۱۶۹۔ ص ۱۷۰)

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ خدا کی کسی مخلوق سے عناد رکھنا طریقت کے خلاف سمجھتے تھے، (بزم صوفیہ ص ۲۸۸) وہ فرماتے ہیں کہ قیامت کے بازار میں کسی سودے کی اتنی قیمت اور پوچھ نہ ہوگی جتنی دل داری اور دل خوش کرنے کی۔ (سیر الاولیاء ص ۲۸)

ان کے مرشد خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ نے ان کو اپنے یہاں سے رخصت کر کے دہلی بھیجا تو فرمایا تم ایک سایہ دار درخت ہو، جس کی چھاؤں میں اللہ کی مخلوق آرام پائے گی۔ خواجگانِ چشت کی یہی کوشش

رہی کہ وہ اپنے اخلاق کی گھنی چھاؤں میں اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق کو پناہ دیتے رہے۔ (سیر الاولیاء، ص ۱۴۸)

حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کی تعلیم یہ تھی کہ بادشاہ کے لئے نفل نماز اور نفل روزے سے زیادہ ضروری ہے کہ بھوکوں کو پیٹ بھر کر کھلائے، طرح طرح کے کپڑے منگوائے اور ننگوں کو پہنائے، اجڑے دلوں کو آباد کرے، حاجت مندوں کی دست گیری کرے، ان کا قول تھا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں پہنچنے کی راہیں بہت ہیں، لیکن سب سے نزدیک راہ دلوں کو راحت پہنچانا ہے۔ (مکتوبات سہ صدی ۴۸۹)

حضرت اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی تعلیم یہ تھی کہ رعیت پر ظلم کرنے سے جہاں داری اور شہریاری کو نقصان پہنچتا ہے۔ (لطائف اشرفی ج ۳ ص ۱۶۸، ص ۱۶۷)

ان کی یہ تلقین تھی کہ رعایا کی نگہبانی میں ملک کے مصالح اور دربار کی بہبود پنہاں رہی ہے، حضرت خواجہ سید محمد گیسو درازؒ نے گلبرگہ کے سلطان احمد بہمنی کو یہ تعلیم دی کہ وہ فقیروں، کمزوروں، یتیموں، عاجزوں، لنگڑوں اور بیواؤں کی پوری خبر گیری کرے، ان کو برباد ہونے سے بچالینے سے زیادہ کوئی مشکل کام نہیں۔ (خاتمہ ص ۱۸۷۔۱۹۰)

ہندوستان کے مسلمان فرماں رواؤں کا سب سے نمایاں شیوہ یہ رہا ہے کہ وہ عدل وانصاف پر پورا زور دیتے تھے، وہ فاسق، فاجر اور شرابی ہونے کا الزام تو گوارا کر لیتے، لیکن ظالم، غیر عادل اور غیر منصف ہونے کا الزام کسی طرح پسند نہ کرتے۔ ''فخر مدبر کا قول ہے کہ قطب الدین ایبک عدل میں حضرت عمرؓ کی تقلید کرتا تھا۔''

التمش نے اعلان کر رکھا تھا کہ جس کسی پر ظلم ہو وہ اس کے محل کی عدل وانصاف کی لٹکی ہوئی زنجیر کو ہلائے، تاکہ وہ اس کے ساتھ انصاف کر سکے، ورنہ قیامت کے روز ان کی فریاد کا بار (بوجھ) اس کی طاقت برداشت نہ کر سکے گی۔ (فوائد السالکین ص ۲۹)

غیاث الدین بلبن کے بارے میں مؤرخ ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ وہ داد ودہش اور انصاف پروری میں بھائیوں، لڑکوں اور مقربوں کا مطلق لحاظ نہ کرتا جب تک کہ مظلوم کے ساتھ انصاف نہ کر لیتا، اور اس کے دل کو آرام نہ پہنچا دیتا۔ (برنی ص ۴۰)

اس کے عدل وانصاف کے قصے بہت مشہور ہیں، تاریخ مبارک شاہی، اور تاریخ ملا عبد القادر بدایونی دونوں میں ہے کہ سلطان محمد تغلق نے اپنے شاہی محل کے اندر چار مفتی مامور کر رکھے تھے، جب کوئی فریادی آتا تو سلطان ان مفتیوں سے مشورہ کرتا، اور ان کو تنبیہ کر رکھی تھی کہ اگر کوئی معصوم ان کے فیصلے کی بدولت تہ تیغ ہوا تو اس کا خونِ ناحق ان کی گردن پر ہوگا۔ اس لئے مفتیوں سے کوئی فروگذاشت نہ ہوتی۔

(تاریخ مبارک شاہی ص ۱۱۵، منتخب تاریخ جلد اول ص ۲۳۹)

Scanned by CamScanner

ظاہر ہے کہ خلق اللہ کی خدمت، مردم آزاری اور رعیت پر ظلم کرنے سے پرہیز، بھوکوں، ننگوں اور حاجت مندوں کی دست گیری کرنے میں مسلم اور غیر مسلم دونوں کا دائرہ ہوتا ہے اور عدل و انصاف میں تو مذہب، ذات پات کی کوئی تفریق نہیں کی جاتی۔

حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے سلطان فیروز شاہ تغلق کو اس حدیث کی پوری تفصیل لکھ کر بھیجی، جس میں ابو جہل کے مقابلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نصرانی کی حمایت کی، ابو جہل نے ایک نصرانی کا مال غصب کر لیا تھا، اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر اس وقت ایک فریاد کی جب آپ دوپہر کے وقت سخت گرمی میں قیلولہ فرما رہے تھے، آپ اسی وقت اس نصرانی کے ساتھ ابو جہل کے مکان پر تشریف لے گئے، اس کا دروازہ کھٹکھٹایا، اس کو غصہ آیا، مگر آپ اس وقت تک اس کے دروازے سے نہیں ہٹے جب تک کہ ابو جہل نے سارا مال اس نصرانی کو واپس نہیں کیا، نصرانی کو ایک تھیلا نہیں ملا، تو ابو جہل نے اس سے ایک بہتر تھیلا لا کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نصرانی سے پوچھا کہ یہ تھیلا بہتر ہے یا وہ بہتر تھا، تو اس نے کہا یہ بہتر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم کہتے کہ وہ بہتر تھا تو میں اس وقت تک واپس نہ جاتا جب تک کہ میں قیمت لے کر تم کو حوالہ نہ کرتا۔ (مکتوبات صدی ص ۲۹۲۔۲۹۳)

یہ حدیث اس بات کی کھلی تلقین ہے کہ اسلام میں عدل و انصاف کرنے میں مسلم و غیر مسلم کی تفریق نہ ہو، مظلوم کسی فرقہ کا ہو یا کسی مذہب کا اس کے ساتھ انصاف ہونا چاہئے۔

حضرت شرف الدین یحییٰ منیری نے سلطان فیروز شاہ تغلق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیثیں بھی لکھ بھیجی تھیں کہ جو کوئی کسی مظلوم کو دیکھتا ہے اور وہ مظلوم اس سے فریاد کرتا ہے، لیکن وہ فریاد نہیں سنتا تو قبر کے اندر اس کو آگ کے سو کوڑے مارے جائیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک ساعت کا عدل ساٹھ (۶۰) سال کی عبادت سے بہتر ہے۔

حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ اس سے خوش رہے کہ سلطان فیروز شاہ کی ذات مظلوموں اور درماندوں کی جائے پناہ ہے۔ (مکتوبات صدی ص ۲۹۲۔۲۹۳)

تسخیر قلوب

تمام صوفیاء کرام مسلمان فرماں رواؤں کو عدل و انصاف کی تلقین کرتے رہے اور پھر وہ خود یہاں کے غیر مسلموں کے ساتھ جس پاکیزہ اور بلند اخلاق سے پیش آتے رہے اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے اخلاق کی بلندی اور پاکیزگی سے متاثر ہو کر یہاں کے غیر مسلم دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے رہے جس کی

[illegible] داستان ہے، مگر یہ حقیقت ہے کہ جب سلاطین تخت و تاج کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ لشکر کشی میں مشغول تھے تو خانقاہ کے بوریا نشین انسانوں کے قلوب کی تسخیر میں لگے ہوئے تھے، اور یہ تسخیر ان کے روادارانہ زہد، عبادت، تفکر، اخلاص اور محبت کے ذریعہ سے ہو رہی تھی، جس کو اس زمانہ کے اہل قلم پوری تفصیل سے قلم بند کر دیتے تو ہندوستان میں اسلام کی تاریخ کچھ اور ہی نظر آتی، ہندوؤں میں جو ذات پات کی تفریق تھی اس سے ان کا بڑا طبقہ کچھ ایسا نالاں تھا کہ جب ان صوفیاء کرام نے مساوات، رواداری، حقانیت اور انسانیت نوازی کی تعلیم دے کر اپنی روحانی کشش کے جلوے دکھائے تو یہاں کے ان لوگوں کی نگاہوں میں جن کو یہاں کے سماجی نظام نے کچل رکھا تھا، اسلام کی معاشرتی مذہبی اور روحانی جاذبیت کی نشانیاں نظر آنے لگیں، جس کے بعد وہ اسلام کی طرف خود بخود مائل ہونے لگے۔

چشتیہ سلسلہ کی روادارانہ تعلیمات کی روشن مثالیں حضرت امیر خسروؒ اور امیر حسن سنجریؒ کے یہاں ملتی ہیں، دونوں حضرات حضرت نظام الدینؒ کے حلقۂ بیعت میں داخل تھے، پہلے کہا گیا ہے کہ تعجب تو یہ ہے کہ مولانا ضیاء الدین برنی بھی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مرید تھے مگر انہوں نے اپنی تلون مزاجی کی وجہ سے جو تحریریں لکھیں، اس سے یقیناً مسلمان اور اسلام کی تاریخ کو نقصان پہنچا، لیکن ان کے زہر کا تریاق حضرت امیر خسروؒ اور امیر حسن سنجریؒ کی تحریروں میں ملتا ہے جو برنی ہی کے زمانے میں نیک نفسی، فراخ دلی، وسیع المشربی اور کشادہ ذہنی کا درس دے رہے تھے، امیر خسرو کی ہی روایت ہے کہ ایک مسلمان حج کے لئے مکہ معظمہ جا رہا تھا کہ راستہ میں ایک برہمن ملا، جو سومناتھ جا رہا تھا، یہ برہمن اپنے عقیدے کی شدت میں زمیں پر لیٹ لیٹ کرتا چلا جاتا، اس حاجی نے برہمن سے پوچھا کہ اے دوست تم کہاں جا رہے ہو؟ برہمن نے کہا میں کئی سال سے اسی طرح سفر کر رہا ہوں، حاجی نے کہا کہ خدا نے تمہیں دو پاؤں دیئے ہیں تو چلنے کے بجائے اپنے سینہ سے کیوں رینگ رہے ہو، برہمن نے جواب دیا جب سے میں نے اپنی جان کو مورتی کے حوالے کیا ہے، اسی طرح سینہ کے بل رینگتا ہوں۔

(مثنوی مطلع الانوار ص ۸۷۔۸۸)

امیر خسرو لکھتے ہیں کہ ہندو بت پرستوں پر طنز کیا جاتا ہے، لیکن ان کے عقیدہ میں جو اخلاص ہے اس سے سبق لیا جا سکتا ہے۔

وہ اپنی مثنوی دول رانی خضر خاں میں لکھتے ہیں کہ ایک آتش پرست ہندو سے سوال کیا گیا کہ وہ آگ کی پرستش کیوں کرتا ہے؟ اور اس کے لئے کیوں جان دیتا ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ آگ کو دیکھ کر امید وصل فروزاں رہتی ہے اور آگ میں فنا ہو کر بقا حاصل ہوتی ہے۔

امیر خسرو نے آگ کی پرستش تو نہیں کی، لیکن اس آتش پرست کے جذبہ کی قدر کرنے کا مشورہ

دیا ہے۔ (مثنوی دول رانی خضر خاں ص ۱۹۵، ۱۹۶)

امیر خسرو کا اپنا مذہب تو اسلام تھا، اس لئے ہندو مت کو اس پر کسی طرح ترجیح دینا پسند نہ کرتے، لیکن اپنے ہم وطن بھائیوں کی دل جوئی اور دل داری کی خاطر ان کے مذہب کو دنیا کے تمام مذاہب سے بہتر سمجھنے کے لئے تیار ہو گئے، ہندو مذہب کو اپنے دلائل سے مجوسیہ، قوم مجسم، ستارہ پرست، عنصریوں، قوم شبہ اور قوم پارسی سے بہتر قرار دیا، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ہندو پتھر، جانور، آفتاب اور درخت کو ضرور پوجتے ہیں، لیکن ان کی پرستش میں اخلاص ہے، اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب ایک ہی خالق کی مخلوق ہیں، اس کی اطاعت کے منکر نہیں، ان چیزوں کی پوجا اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے آبا و اجداد ان کی پوجا کرتے آئے ہیں، امیر خسرو البیرونی کی طرح ہندوؤں کے تصور وحدانیت کے معترف رہے، لکھتے ہیں کہ ہندو ہمارے مذہب کے قائل نہیں، لیکن ان کے بہت سے عقائد ہم سے مشابہ ہیں، وہ خدا تعالیٰ کی وحدت، اس کی ہستی اور قدم کے قائل ہیں، اس کی قدرت ایجاد اور اس کے رازق، خالق، فعال، فاعل مختار اور عالم جز و کل کے قائل ہیں۔

ہندو مرد اور عورت میں وفا شعاری کا جذبہ ہوتا ہے، اس سے بھی امیر خسرو متاثر ہوئے، کہتے ہیں کہ ہندو اپنی وفا شعاری میں تلوار اور آگ سے اپنی جان دے سکتا ہے، اور ایک ہندو عورت اپنے شوہر کی خاطر جل کر راکھ ہو جاتی ہے، ہندو مرد اپنے بت اور مالک کے لئے اپنی جان بھینٹ چڑھا دیتا ہے، اسلام نے ان چیزوں کو روا نہیں رکھا ہے، لیکن یہ بڑی کارگزاری ہے، اگر ہماری شریعت میں اس کی اجازت ہوتو بہت سے لوگ اس سعادت کو حاصل کرنے میں اپنی جانیں قربان کریں۔

خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی فراخ دلی

امیر خسرو کو یہ رواداری اور فراخ دلی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی صحبت اور تربیت سے ملی، جن کے یہاں خلق اللہ کی ایذا رسانی اور دل آزاری سب سے بڑا اخلاقی گناہ اور جرم تھا، حضرت خواجہ خود بھی ہندوؤں کی بعض باتیں دیکھ کر متاثر ہو جاتے، ایک روز وہ اپنی خانقاہ سے باہر امیر خسرو کے ساتھ نکلے، تو جمنا کے کنارے ہندو عورتیں اور مرد غسل کر رہے تھے، ان کو دیکھ کر حضرت خواجہ نے فرمایا:

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے۔ (تزک جہانگیری ص ۸۲)

حضرت خواجہ برہمنوں کی بعض خوبیوں کے معترف تھے، ان کے چہیتے خلیفہ امیر حسن دہلوی المتوفی

۱۳۳۵ء ان کے ملفوظات قلم بند کیا کرتے تھے، جو "فوائد الفواد" کے نام سے اب تک بہت مشہور اور مقبول ہیں، وہ بھی امیر خسرو کی طرح شاہی دربار سے وابستہ رہے، وہ لکھتے ہیں کہ ان کو شاہی دربار سے کچھ دنوں تک تنخواہ نہیں ملی، جس سے وہ پریشان تھے، حضرت خواجہ کو ان کی پریشانی معلوم ہوئی تو امیر حسن کو یہ حکایت سنائی کہ ایک شہر میں ایک برہمن رہتا تھا، اس کے پاس بڑی دولت تھی، لیکن اس شہر کے حاکم نے اس پر جرمانہ کر کے سارا مال و اسباب ضبط کر لیا، جس سے وہ تباہ و برباد ہو کر بہت ہی مفلس ہو گیا، ایک روز وہ کہیں جا رہا تھا کہ اس کا ایک دوست راستہ میں ملا، اس نے برہمن سے پوچھا تمہارا کیا حال ہے؟ برہمن نے جواب دیا: اچھا ہے، خوش ہوں، دوست نے کہا تم سے تو تمہاری چیزیں لے لی گئیں، اب تم خوش کیسے رہ سکتے ہو، برہمن نے جواب دیا میرا جینو تو میرے پاس ہے۔ "زنارِ من با من است"

حضرت خواجہ نے یہ حکایت سنا کر امیر حسن سے کہا، تم نے سُنا؟ امیر حسن نے جواب دیا: جی ہاں، اس حکایت سے مجھ کو بڑی باطنی تسکین اور تسلی ہوئی۔ (فوائد الفواد ص ۵۵۔۵۶)

حسن دہلوی کی رواداری

امیر حسن دہلوی کے دیوان میں بہت سی ایسی منظوم حکایتیں ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہم مذہبوں کو رواداری اور فراخ دلی کی تعلیم دیتے رہے، ایک نظم میں لکھتے ہیں کہ ایک کشتی پر ایک غیر مسلم اور ننانوے مسلمان سوار تھے، یکا یک کشتی دریا میں ڈوبنے لگی، مسلمانوں نے کہا کہ ہم تو خداوند تعالیٰ کے نور سے آشنا ہیں، لیکن بیگانے کی وجہ سے یہ کشتی ڈوب رہی ہے، اس لئے اس گبر (غیر مسلم، آتش پرست) کو دریا میں ڈال کر کشتی کو محفوظ کر لینا چاہئے، گبر نے یہ سُنا تو ناامید ہو کر ایک آہ کھینچی، اور بولا کہ ایک گبر کی بدبختی کی تاثیر سے بلا آ رہی ہے، اور کشتی ڈوب رہی ہے تو پھر ننانوے مومنوں کی پاکی سے یہ محفوظ کیوں نہیں ہے، ان میں ایک دانا بزرگ بھی تھے، گبر کی یہ دردناک بات سن کر متاثر ہوئے، اور اپنے ساتھیوں کو نصیحت کی کہ ہر حال میں خداوند تعالیٰ کی رضا اور دست گیری پر بھروسہ کرنا چاہئے، اس کے بعد کشتی سلامت رہی، آخر میں امیر حسن لکھتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ کے ملک بے نیازی میں سراندازی ہی میں سرفرازی ہے، اور دوسروں کے فسق پر نظر رکھنا درست نہیں، بہر حال خدا سے خیر اور ظلمت کے چراغ کی روشنی میں فضلِ الٰہی کی امید رکھنی چاہئے، امیر حسن دہلوی نے اس واقعہ کو منظوم کیا ہے۔

(دیوان حسن سجزی ص ۵۸۱۔۵۸۲)

حسن دہلوی نے ایک غیر مسلم کی بخشش و سخاوت کا حال بہت ہی مؤثر انداز میں لکھا ہے، ایک

Scanned by CamScanner

غیر مسلم ضرورت مندوں اور حاجتوں کی مدد کرنے میں بہت مشہور تھا، ایک مسکین اس کے پاس اس وقت پہنچا جب وہ میدان جنگ میں زخمی ہو کر دم توڑ رہا تھا، مسکین نے اس کے پاس آ کر اپنا حال بتایا تو اس نے کہا اب تو میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا، میرے دانتوں میں سے سونے کی ڈوری نکال کر اپنی ضرورت پوری کر سکتا ہے، یہ لکھ کر حسن دہلوی کہتے ہیں۔

سخن در ہمت است و زر افشانی	حساب کفر و ایماں را تو دانی
اگر عاشق ورزد اے دوست	حبیب اللہ طراز دولت او است
وگر زاہد کند یا بخل پیوند	خدائش دشمن او خلق صد چند

شیخ احمد عبدالحق کی روادارانہ حکایت

مذہبی رواداری کی ایک اچھی مثال پنڈوہ (بنگال) کے ایک مسلمان حاکم کے یہاں بھی ملتی ہے۔ جس کو شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے شیخ احمد عبدالحقؒ کے ملفوظات کے سلسلہ میں بیان کیا ہے۔

شیخ احمد عبدالحق راہ سلوک کی منازل طے کرنے کے لئے بنگال جا کر پنڈوہ میں مقیم رہے، تو اس زمانہ کا وہاں کا حاکم ایک رات بھیس بدل کر شہر میں نکلا: ایک جگہ قلندروں کی جماعت کھانا کھا رہی تھی، حاکم ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے اس کو دھتکارا کہ تم ہمارے کھانے میں نظر لگا رہے ہو، اس نے اپنے فقر کا ذکر کیا تو وہ اور برہم ہوئے، جب تک کہ اس کو اپنے سامنے سے ہٹا نہ لیا خاموش نہیں ہوئے، حاکم وہاں سے ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں کچھ جوگی رہتے تھے، وہ لوگ بھی کھانا کھا رہے تھے، آپس میں برابر تقسیم کرنے لگے تو ایک حصہ حاکم کو بھی دیا، حاکم نے کہا کہ میں ایک بیگانہ آدمی ہوں، میرے لئے اتنا حصہ کیوں لگاتے ہو، جوگی بولے ہمارا طریقہ یہی ہے، اگر کتا موجود ہوتا ہے تو ہم اس کو بھی برابر کا حصہ دیتے ہیں، تم تو آدمی ہو، ہم تم کو کیسے نہ دیں، حاکم یہ سن کر بہت متاثر ہوا، صبح کو اس نے حکم دیا کہ سارے قلندر اور درویش شہر بدر کئے جائیں۔

جوگی جیسے تھے ویسے رہنے دئے گئے، شہر میں ہنگامہ برپا ہوا، شیخ احمد عبدالحق شہر چھوڑنا نہیں چاہتے تھے، وہ حاکم کی ڈیوڑھی پر جا کر بیٹھ گئے، کسی نے ان کو وہاں سے نہیں ہٹایا تو یہ کہہ کر اپنی قیام گاہ پر واپس آئے کہ یہ حاکم درویشوں کو نہیں، بلکہ بے خبروں کو شہر بدر کروا رہا ہے (انوار العیون ۳۴-۳۵)

بہمنی خاندان کے بانی کی حکایت

رواداری کی ایک بہت اچھی مثال دکن کے بہمنی سلطنت کے بانی سلطان علاؤالدین حسن گنگو بہمنی (متوفی ۱۳۵۸ ہجری یا عیسوی) کے یہاں ملتی ہے، اس کی ابتدائی زندگی بہت ہی عسرت میں گزری، وہ دہلی میں محمد تغلق کی شہزادگی کے زمانے میں اس کے ایک منجم گنگو بہمن کا ملازم تھا، اپنی تنگ دستی سے پریشان رہتا، اس نے ایک دن گنگو بہمن سے اپنی غربت کا ذکر کیا تو گنگو بہمن نے ہمدردی میں نواح دہلی میں اس کو اپنی بنجر زمین کا ٹکڑا دیا، ایک جوڑی بیل اور دو مزدوروں کا بھی انتظام کر دیا، تا کہ وہ اس زمین پر کھیتی کر کے اپنا پیٹ پال سکے، ایک دن اس کے مزدور ہل چلا رہے تھے کہ زمین کے اندر سے ایک برتن نکلا جس میں سلطان علاؤالدین خلجی کے عہد کی کچھ اشرفیاں تھیں، حسن اپنی ایمان داری کی وجہ سے یہ گوارا نہ کر سکا کہ آقا کی دی ہوئی زمین میں خیانت کرے، اس نے یہ ساری دولت گنگو بہمن کے سامنے جا کر رکھ دی، گنگو نے اس کی ایمان داری کا ذکر شہزادہ محمد تغلق سے کیا، اس نے اپنے باپ غیاث الدین تغلق کو خبر دی، سلطان غیاث الدین نے حسن کو اپنے حضور میں طلب کیا اور شاہی نوازشوں کے ساتھ اپنے شاہی زمرہ میں شامل کر لیا، (تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۲۷۴)

ایک دن گنگو بہمن نے حسن سے کہا کہ مجھ کو تمہاری قسمت کے زائچے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم بڑے اقبال مند ہو گے، خدا کی مدد اور عنایت سے بلند مرتبے کو پہنچ جاؤ گے، اس بات کا عہد کرو کہ اگر خدا تم کو کسی بڑے مرتبے پر پہنچا دے تو میرا نام بھی اپنے نام کا جزء بنا دینا، تا کہ تمہارے اقبال کی بدولت میں بھی دنیا میں زندہ رہ سکوں، دوسرے یہ کہ اپنے خزانہ میں مجھ کو اور میری اولاد کے سوا کسی اور کو نہ رکھنا، حسن نے اپنے محسن کی دونوں باتیں منظور کر لیں، اور کوئی بڑا عہدہ پانے سے پہلے ہی اپنے نام کے ساتھ گنگو لکھنے لگے، اور وہ دکن میں بہمنی سلطنت قائم کرنے کے بعد بڑا کامیاب حکمران اور فاتح ثابت ہوا، ایک بار کسی نے پوچھا کہ آپ نے اتنی بڑی سلطنت کیسے حاصل کی؟ اور کم مدت میں اتنی وسعت کیسے دی؟ اور دوسرے حکمرانوں اور رعایا کو اپنا مطیع کیسے بنایا؟ اس نے جواب دیا کہ پہلے تو میں نے مروت کو اپنا اصول بنایا، خواص و عوام سے مروت سے پیش آتا رہا۔ دوسرے یہ کہ کبھی بخل سے کام نہ لیا، سخاوت میں دوست اور دشمن کی تفریق نہیں کی، ہر ایک کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا، انہی دو باتوں کی وجہ سے سب ہی میرے مخلص، ہمدرد اور مطیع بنتے گئے۔ (تاریخ فرشتہ اول ص ۲۸۱)

صوفیاء کرام نے بھی ہندوستان کی تسخیر قلب کے لئے یہاں کی زبانیں سیکھیں، اور ان میں دوہے

Scanned by CamScanner

کہے، حضرت فرید الدین گنج شکرؒ پنجابی اشعار، ابوعلی قلندر پانی پتی، حضرت شرف الدین یحییٰ منیری، حضرت عبدالحق رودلوی، حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور شیخ برناوی کے ہندی دوہے اور اشعار آج کل ہندی زبان کے محققوں کے لئے لائق توجہ ہو گئے ہیں، دکن میں خواجہ گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے معراج العاشقین، اور شاہ میراں شمس العشاق (وفات ۱۴۹۶ء) نے خوش نامہ، خوش نغز اور شہادۃ الحقیقۃ دکنی زبان میں لکھ کر یہ صور پھونکا کہ مسلمان فارسی زبان چھوڑ کر یہاں کی ملکی زبان اپنائیں، صوفیاء کرام نے یہاں کے باشندوں سے قریب تر ہونے کے لئے فارسی اور عربی زبانوں کو چھوڑ کر جس طرح ان کی زبان اختیار کی، اس سے اردو کی جو نشو و نما ہوئی وہ نہ صرف رواداری بلکہ ہندوستان کی مذہبی اور لسانی تاریخ کا مستقل باب بن گئی ہے۔

اس عہد کے ایک ہندو مؤرخ شری ور کا بیان ہے کہ سلطان اپنے مذہبی فریضہ کا سختی سے پابند تھا، پانچوں وقت کی نماز پڑھتا، رمضان کے مہینہ میں روزے بھی رکھتا، اور امور حکومت شیخ الاسلام کے مشورے سے سرانجام دیتا، وہ صوفیاء کرام اور علماء کرام کی بڑی عزت کرتا، لیکن اسی کے ساتھ برہموں اور پنڈتوں کا بھی احترام کرتا، اس نے مندروں کی مرمت کی اور تعمیر کی اجازت دی اور کچھ اس نے خود مرمت اور تعمیر کروائے، اس نے برہموں کو ایسی زمین دی جس کا لگان معاف تھا، مندروں کے لئے زمینیں وقف کیں، وادی کشمیر میں مختلف مقدس مقامات کی یاترا کے لئے آنے والے یاتریوں کو مفت کھانا دیا جاتا تھا، اس کے لئے جاگیر وقف تھی، اس کو سلطان نے اور آگے بڑھا دیا، اور ایک عمارت ان یاتریوں کے لئے بنائی، ہندوؤں کے تہواروں میں شرکت کرتا، شری جین مٹھ کے بھکشو برتنوں کی پوجا کا جشن مناتے تو وہ اس میں شریک ہوتا۔

بھکشوؤں کو کھانا کھلاتا، ناگ یاترا کے دن اور گن چکّر کے تہوار کے زمانہ میں پانچ دن تک پجاریوں کو چاول، گوشت اور پھل وہ خود دیتا، چاند کی تیرہویں کو انہیں لحاف اور دوسری چیزوں کے تحفے دے کر رخصت کرتا، ہندوؤں کو اچھے اچھے عہدے دینے میں فراخ دلی سے کام لیتا، سیو بھٹ برہمن اور بودھ مذہب کے پیروں تلک اچاریہ اس کے بڑے معتمد سیاسی مشیر تھے، شری بھٹ اس کی عدالت انصاف کا مہتمم تھا، جب اس کا انتقال ہوا تو سلطان کو بڑا دکھ ہوا، اس نے اس کے لئے بہت بڑی رقم خیرات کی، کرپور بھٹ برہمن اس کا خاص طبیب تھا، (بحوالہ کشمیر سلاطین کے عہد میں از ڈاکٹر محب الحسن ا... ترجمہ شائع کردہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ص ۱۱۵۔۱۲۵)

وہ کشمیر میں اتنا مقبول تھا کہ لوگ محبت میں اس کو بڑشاہ کہتے تھے، اور جب اس کی وفات ہوئی تو لوگ اس کے لئے چیخ چیخ کر روئے، اس دن راجدھانی میں کھانا نہیں پکا اور نہ کسی چولہے سے دھواں

اٹھا، اور آج بھی کشمیر میں اس کا نام بڑی عزت و محبت سے لیا جاتا ہے، ہندو اور مسلمان میں سے کوئی بھی اس کا نام دشمن نہیں۔

اس کی مثالی حکومت ہندوستان کے لئے ایک پیام ہے کہ ایک حکمران لوگوں کے دلوں کو کیسے تسخیر کر سکتا ہے، اس نے اپنا مذہبی عقیدہ نہیں بدلا، اور نہ لوگوں کو ان کے عقائد کی تبدیلی کی تلقین کی، لیکن اپنی رواداری، فراخ دلی، انسان دوستی اور نیک مشربی سے لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کرتا رہا۔

سلاطینِ دہلی کی حکومت پر ہندو مؤرخین کا تبصرہ

گزشتہ اوراق سے اندازہ ہوگا کہ مسلمان فاتحین نے اپنا خون بہا کر اس سرزمین میں اپنا قدم جمایا، اس سلسلہ میں ان کو لڑائیاں لڑ کر خون ریزی بھی کرنی پڑی، مگر ان کی تاریخ صرف خون آشامی ہی نہیں بلکہ اس میں رواداری، فراخ دلی، دل جوئی اور انسانیت نوازی کے روشن پہلو بھی ہیں، جس کا اعتراف بعض ہندو مؤرخین نے بھی کیا ہے، مثلاً ڈاکٹر تاراچند اپنی کتاب "ہندوستانی کلچر پر اسلام کے اثرات" میں رقم طراز ہیں:

"جب مسلمانوں کی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی تو انہوں نے ہندوؤں کو مختلف عہدوں پر مقرر کرنا ضروری قرار دیا، محمود غزنوی کی فوج میں بھی بکثرت ہندو سپاہی تھے جو اس کی حمایت میں وسط ایشیا میں جا کر لڑے، اس کے ہندو فوجی کمانڈر تلک نے اس کے ایک مسلمان فوجی عہدے دار کی بغاوت فرو کی، اور جب قطب الدین ایبک نے ہندوستان میں رہ کر حکومت کرنے کا فیصلہ کیا، اس نے ملکی نظام کو چلانے کے لئے ہندوؤں کو ہی مقرر کیا، کیونکہ ان کے بغیر نظام درہم برہم ہو جاتا، مسلمان ہنرمندوں، محاسبوں اور محرروں کو اپنے ساتھ نہیں لائے تھے، ہندوؤں نے ہی ان کے لئے عمارتیں بنائیں، جن میں پرانی چیزیں نئے حالات کے مطابق شامل کی گئیں، ہندو سناروں ہی نے مسلمان حکمرانوں کے سکے ڈھالے، اور ہندو محاسبوں ہی نے ان کا حساب و کتاب درست کیا، پنڈتوں نے ہندو قوانین پر عمل درآمد کرانے میں ان سلاطین کو مشورے دیئے، اور برہمن نجومیوں کی رائے سے حکومت اور دربار کے مختلف کام انجام پاتے تھے، مسلمان ہندوستان آئے تو اس کو انہوں نے اپنا وطن بنایا، وہ ہندوؤں کے ارد گرد رہتے تھے، اس لئے دائمی عناد و مخاصمت کے ساتھ ان کے لئے زندگی بسر کرنا ممکن نہ تھا، اس باہمی میل جول سے ایک نے دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کی، بہت سے ہندوؤں نے اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن مذہب کی تبدیلی سے ان میں زیادہ فرق پیدا نہیں ہوا، جب مسلمانوں سے مغلوب

ہونے کا صدمہ جاتا رہا تو ہندو اور مسلمان دونوں نے ایک ایسا طرز زندگی اختیار کرنے کی کوشش کی، جس سے دونوں اچھے ہمسایہ کی طرح زندگی بسر کرسکیں۔" (۱۳۶۔۱۳۷)

پروفیسر سری رام شرما "دی کریسنٹ ان انڈیا" میں لکھتے ہیں:

"سیاسی نظام کی اچھائی اور برائی کا انحصار غلبہ اور اقتدار کی قوت پر نہیں، بلکہ ملک کے اچھے نظم ونسق پر ہے، لیکن ملک کا نظم ونسق ہر زمانہ کے لئے یکساں نہیں ہوسکتا، بلکہ زمانہ اور ماحول کے ساتھ بدلتا رہتا ہے، اس لئے مغلوں سے پہلے سلاطینِ دہلی نے جو نظم ونسق قائم کیا اس کو اسی زمانہ کے معیار کے مطابق پرکھنا چاہئے، یہ سلاطین ہندوستان میں فاتح بن کر ضرور داخل ہوئے، لیکن مفتوحین سے ان کا میل جول جیسے جیسے بڑھتا گیا، ان دونوں کے جنگ جویانہ جذبات مٹ کر خوش گوار تعلقات پیدا ہوتے گئے، معاشرتی اور ثقافتی امتزاج کے ساتھ سیاسی تعلقات کا بہتر ہونا ضروری تھا، اس لئے مسلمان حکمران سیاسی ملک ونظام کے جلد سے جلد بہتر بنانے کی کوشش میں لگے رہے، بلبن کے زمانہ سے بابر کے زمانہ تک ان فرماں رواؤں کی یہی کوشش رہی کہ حکومت کی سرحدوں کی توسیع کرنے کے ساتھ ساتھ ملک کے عام نسق ونظم میں ترقی ہوتی رہے، اس نظام کا برا یا اچھا ہونا سلاطین اور ان کے صوبہ کے گورنروں کے ذاتی اوصاف اور کردار پر ہی منحصر تھا۔" (ص ۱۸۹، ص ۱۹۰)

کے، ایم اشرف لکھتے ہیں:

"اس کو تسلیم کرنا صحیح نہیں کہ سلاطین دہلی کے عہد میں ہندوؤں کے ہاتھ سے تجارت چھین لی گئی، مسلمان حملہ آور فوجی ہی رہے، وہ تجارت کو پسند نہ کرتے تھے، ہندوستان کا تجارتی کاروبار ہنڈی اور قرض کے ذریعہ ہوتا تھا، جو مسلمانوں کے لئے عیب اور پیچیدہ چیز تھی، حکومت یا سرکاری عمال کی وجہ سے تاجروں پر بڑا بار ضرور پڑتا، لیکن بنئے اس زمانہ میں بھی سوسائٹی کے ضروری اجزا اسی طرح رہے جیسے کہ آج کل ہیں، ہندو سوسائٹی جوں کی توں محض اس لئے رہی کہ حکومت کا مقامی نظم ہندوؤں کے ہاتھوں ہی میں رہا، اونچے عہدیدار تو مسلمان ہوتے، لیکن نیچے کے تمام عہدے ہندوؤں ہی کو دیئے جاتے، پٹواری اور محاسب خزانچی، اسی طرح اور عہدے دار ہندو ہی ہوتے، گورنر، اور دوسرے بڑے عہدوں پر مسلمان مامور کئے جاتے، اسی نظام کی بنیاد پر التمش اور علاؤالدین خلجی دونوں نے مختصر مدت میں امن بحال کرکے اپنی اپنی حکومت کی عمارتیں کھڑی کرلیں، اور اسی نظام کی بدولت صوبائی گورنر قلیل فوج کی مدد سے آسانی سے صوبوں میں حکومت قائم کرلیتے۔" (وائے سرف آف انڈین ہسٹری ص ۱۳۹۔۱۴۸)

ڈاکٹر ایشوری پرساد اپنی کتاب "ہسٹری آف قرونہ ٹرکس" میں محمد شاہ تغلق کی حکومت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"پورے نظام سلطنت کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ مسلمانوں کی حکومت اب ایک مرتب شکل میں ہوگئی تھی، مسلمانوں کی فوج سے وہ پہلا سا متعصبانہ جوش وخروش بھی جاتا رہا تھا، ان کے برتاؤ میں سختی باقی نہ رہی تھی، زندگی جب پرامن ہوگئی تو سیاسی فرائض کی بھی نوعیت بدل گئی، اور ترقی پسند خیالات بھی پیدا ہونے لگے، ہندوؤں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جانے لگا، حکمران طبقہ کو رواداری اور معاشرتی یگانگت کا احساس پیدا ہونے لگا، ایک ترقی یافتہ سلطنت میں طرح طرح کے مسائل اٹھتے رہے، جس کی وجہ سے ایک حکمران کو ایسی پالیسی وضع کرنی پڑی کہ وہ خود بھی رہیں اور دوسروں کو بھی رہنے دیں، اسی لئے سلطان محمد تغلق نے ہندوؤں کے ساتھ کوئی نازیبا روش نہیں اختیار کی، اس نے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا، ان کو عہدے دیئے، اس نے ستی کو رکوا دیا، جو اس کی روشن خیالی کی دلیل ہے۔ (ص ۳۰۴)

ڈاکٹر ایشور ٹوپا نے فیروز شاہ تغلق کی حکومت کا جائزہ لے کر "پولیٹکس ان پری مغل ٹائمس" لکھا ہے:

"فیروز شاہ کی حکومت کی اسپرٹ میں رعایا کی حفاظت مضمر تھی، وہ رعایا کی فلاح وبہبود کے لئے ہمیشہ کوشاں رہا، اس کے ایک جذبہ کا بیّن ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ اس نے رعایا کو دو کروڑ ٹنکے کی معافی دی، سلطان محمد تغلق کے عہد میں ایک مرتبہ جب بڑی تباہی آئی تو حکومت کی طرف سے رعایا کو دو کروڑ ٹنکے دئے گئے، فیروز شاہ کے عہد میں جب اس قرض کی وصولی کا سوال اٹھا تو معلوم ہوا کہ یہ قرض اگر وصول کئے گئے تو رعایا کی زبوں حالی اور بے چارگی اور بڑھ جائے گی، اس لئے یہ قرض معاف کردیا گیا، اور رعایا کے اطمینان کے لئے قرض کے سارے کاغذات ان کے سامنے شاہراہِ عام پر جلا کر خاکستر کردیئے گئے، عوام کے ساتھ انتہائی ہمدردی کے مظاہرہ کا یہ عجیب وغریب طریقہ تھا، اس سے پتہ چل جاتا تھا کہ فیروز شاہ میں عوام کو مطمئن اور خوش حال بنانے کا کتنا غیر معمولی جذبہ موجود تھا، اس قسم کی شاہانہ نوازشوں سے رعایا کے دلوں میں بھی تشکر اور وفاداری کا صحیح جذبہ پیدا ہوتا تھا، جس سے دونوں کے تعلقات استوار رہتے تھے، فیاضی اور رحم دلی کا شاہانہ مظاہرہ زراعت اور لگان کے سلسلہ میں بھی کیا جاتا تھا، کسان ریاست کی ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں، اس لئے ان کے دکھ اور درد دور کرنے سے دُوررس نتائج ہوتے تھے، فیروز شاہ نے دیہی آبادی کی بدحالی اور مصیبت دور کرنے کے تمام غیر دانشمندانہ قوانین بالکل ختم کردیئے، اس کا بڑا لحاظ رکھا گیا کہ لگان کھیتوں کی پیداوار اور کسانوں کی مالی حالتوں کے مطابق وصول کیا جائے، کسی حال میں ان پر بار نہ ہونے پائے، چنانچہ ایسے تمام لگان ختم کردئے گئے جن میں کچھ زیادتی تھی۔

فیروز شاہ سے پہلے یہ رواج تھا کہ کسانوں کو صرف ایک گائے رکھنے کا حق حاصل تھا، فیروز شاہ نے

Scanned by CamScanner

اس رواج کو بھی ختم کر دیا۔ زراعت کی ترقی اور رعایا کی خوش حالی کے لئے نئے نئے قوانین بنائے گئے، اس کی خاص طور پر نگرانی رکھی گئی کہ حکومت کے واجب الادا لگان سے زیادہ رقم وصول نہ کی جائے، اگر قانون کی خلاف ورزی کی وجہ سے کسانوں کو نقصان پہنچتا تو فوراً تاوان ادا کیا جاتا۔

فیروز شاہی عہد میں عدل و انصاف کی حکومت تھی، کسی شخص کو بھی دوسروں پر ظلم اور تعدی کرنے کا حق نہ تھا، تمام ملک میں مکمل امن و سکون تھا، ایسے حالات پیدا کئے گئے کہ لوگوں کی زندگی میں خود بخود ترقی ہوتی گئی، اعلیٰ اور ادنیٰ ہر طبقہ کے لوگ مطمئن اور مسرور زندگی بسر کرنے لگے، چیزوں کی فراوانی تھی جو سستے داموں میں ملتی تھی، اس لئے عام رعایا قانع اور دولت مند ہو گئی، فیروز شاہ کا یہ کارنامہ پیغمبر اسلام کے ان قوانین کی بدولت تھا جو اس نے اپنی ریاست اور بادشاہت کے لئے اختیار کئے تھے۔

اے۔ سی چٹرجی اپنی کتاب "اے شارٹ ہسٹری آف انڈیا" میں لکھتے ہیں۔

اس دور (یعنی سلاطین دہلی کے دور) میں اسلام کی اشاعت کا اندازہ ہند کی موجودہ صورت حال سے کیا جا سکتا ہے، ہند کے شمالی مغربی خطہ یعنی کشمیر، مغربی پنجاب، سرحد اور سندھ میں تین چوتھائی سے زیادہ آبادی مسلمان ہو گئی ہے: اسی طرح بنگال میں آدھے سے زیادہ لوگ مسلمان ہیں، اس کے شمالی اضلاع میں یہ تناسب کچھ اور بڑھا ہوا ہے، اور باقی صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں، یہاں دس میں ایک یا اس سے بھی کم تعداد میں ہے، ان کی ایک بڑی تعداد شہروں اور قصبوں میں رہتی ہے، ہند کے شمالی مغربی حصہ میں مسلمانوں کی اکثریت کی وجہ یہ ہوئی کہ مغرب کی طرف سے بہت سے مسلمان یہاں آکر آباد ہو گئے تھے، مقامی باشندوں نے بھی اسلام قبول کر لیا، اس بات کی پوری تحقیق نہیں ہو سکی کہ بنگال میں اسلام پھیلنے کے کیا اسباب تھے، یہ مسئلہ اتنا پیچیدہ ہے کہ اس مختصر کتاب میں اس پر تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں۔

ظن غالب یہ ہے کہ ہندومت کی پابندیوں نے بنگال کی نیچ ذاتوں کو اس نئے مذہب کو قبول کرنے پر آمادہ کر دیا تھا، آٹھویں صدی عیسوی سے لے کر بارھویں صدی عیسوی تک بنگال پر پال خاندان کی حکومت تھی، جو بودھ مذہب کا پیرو تھا، اس کے زمانہ میں نیچ ذاتوں کو بڑی آزادی حاصل تھی، جب حسین خاندان کے لوگ جنوب کی طرف بنگال میں داخل ہوئے تو وہ اپنے ساتھ ہندومت اور اس کی تمام معاشرتی پابندیاں بھی لے آئے، جن سے نیچ ذاتوں کے جذبات کو ہمیشہ ٹھیس لگتی تھی، اور جب بارھویں صدی میں اسلام آزادی اور مساوات کا ڈنکا بجاتا ہوا بنگال پہنچا تو عوام کی طبیعتیں خود بخود اس کی طرف مائل ہو گئیں، لوگ جوق در جوق مسلمان ہوتے چلے گئے، یہ ایک ایسا بڑا سبب ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے سبب کی تلاش کی حاجت نہیں۔" (مختصر تاریخ ہند مترجمہ محمد یوسف کوکنی ص ۲۱۸۔۲۱۹)

ہندوستانی تہذیب اور اسلام کے عنوان سے ایک مضمون میں این سی مہتا آئی سی ایس نے اپنے خیالات کا اس طرح اظہار کیا ہے:

"ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی بت شکنی کو تو سب جانتے ہیں، مگر میسور کے حیرت انگیز مندر ابھی تک ان بت شکنوں کے ہاتھوں سے محفوظ رہے، اجنتا اور ایلورا کے برہمن اور بودھی آثار کے تحفظ میں مسلمانوں کا بھی ہاتھ ہے۔

ہم کو اس پر تعجب نہ کرنا چاہئے، کیونکہ اسلام نے ہندوستان میں کوئی نئی قوم لا کر آباد نہیں کی، اسلام یہاں ایک نورانی مشعل لایا تھا جس نے زمانہ قدیم میں جب کہ پورا تمدن انحطاط پذیر ہو رہا تھا، اور پاکیزہ مقاصد محض ذہنی معتقدات بن کر رہ گئے تھے، انسانی زندگی کو چھائی ہوئی ظلمتوں سے پاک کر دیا، دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی سیاست سے زیادہ خیالات کی دنیا میں اسلام کی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا، آج کی وسیع اسلامی دنیا میں ایک روحانی برادری ہے جس کو توحید اور مساوات کے مشترک عقیدے کا ایمانی رشتہ باہم منسلک کئے ہوئے ہے، بدقسمتی سے اس ملک میں اسلام کی تاریخ صدیوں تک حکومت سے وابستہ رہی، جس کی وجہ سے اسلام کی اصلی نوعیت پر پردہ پڑ گیا۔"

اتول چندر چٹرجی اپنی کتاب "اے شارٹ ہسٹری" میں لکھتے ہیں:

گرد و پیش سے دلچسپی لینا اور انکو اپنی مخصوص نوعیت کے مطابق نئی صورت دے دینا اسلام کا کمال ہے، وہ روحانی قوت جس نے معمولی ہاتھ پاؤں کے انسانوں کو ہیبت آفریں اور جاں باز بنا دیا تھا، عصر حاضر میں بھی کارہائے عظیم ظہور میں لا سکتی ہے، اسلام کی تعلیم کسی مخصوص جماعت کی ملکیت نہیں، ساری دنیا اس کی مشترک وارث ہے، ہندوستان میں اسلام کی کامیابیوں سے صرف مسلمانوں ہی کو تعلق نہیں بلکہ ساری ہندوستانی قوم کو اس پر فخر ہو سکتا ہے۔[1]

خاندانِ سادات

خاندان تغلق کے آخری زمانے ہی میں حکومت دہلی کمزور ہو چکی تھی، اور اس خاندان کے بعد تو گویا سیلاب آ گیا، جس میں تیمور کے حملوں اور خاندان سادات کی کمزوری کی وجہ سے دہلی کا رہا سہا اقتدار جاتا رہا، اس کے بعد لودھیوں پھر مغل بادشاہ بابر نے دہلی کا اقتدار بڑھانے کی کوشش کی، لیکن ان کے زمانے میں موافق اور مخالف ہر طرح کے اثرات کارفرما تھے اور واقعہ یہ ہے کہ سلطان غیاث الدین تغلق

[1] ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی رواداری (از ۱۰۰٦ تا ۱۴۰٦)

کی وفات سے اکبر کی فتوحات تک حکومت دہلی کو وہ وسعت اور استحکام نصیب نہیں ہوا جو اسے سلطان علاؤ الدین خلجی اور سلطان غیاث الدین تغلق کے عہد حکومت میں حاصل تھا۔

ان دو صدیوں میں ملک کے کئی صوبے خود مختار ہو گئے، بعض میں مسلمان بادشاہوں نے اپنی حکومتیں قائم کر لیں، بعض میں ہندو راجاؤں نے نتیجتاً مرکزی حکومت کی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر منگول حملہ آور جن کا شاہانِ دہلی نے کامیاب مقابلہ کیا تھا تیمور کی زیر قیادت دہلی تک آ گئے، لیکن دہلی کی کمزوری سے ملک کے دوسرے حصوں کو فائدہ بھی پہنچا، غیر محفوظ ذرائع آمد و رفت کی بنا پر شاہانِ دہلی کے لئے ملک کے دور دراز حصوں میں امن قائم رکھنا مشکل تھا، لیکن جب گجرات، دکن، بنگال اور دوسرے صوبے خود مختار ہو گئے تو ان حکمرانوں کے لئے محدود علاقوں کا انتظام نسبتاً آسان تھا، چنانچہ اس زمانے میں ان صوبوں نے بہت ترقی کی، تہذیب و تمدن کو بھی ان حالات سے فائدہ پہنچا، پہلے اسلامی تہذیب و مذہب کا مرکز صرف دہلی تھا، اب احمد آباد، جونپور، گلبرگہ، احمد نگر اور دوسرے شہر بھی اسی طرح کے مرکز بن گئے اور اسلامی تہذیب اور مذہب کی اشاعت زیادہ باقاعدہ اور مؤثر طریقے سے ہونے لگی، نتیجہ یہ ہوا کہ جو بیج مختلف جگہوں پر بوئے گئے تھے انہوں نے جڑ پکڑ لی، اور ہندوستان میں اسلامی تہذیب و تمدن کا وہ درخت نشو و نما پانے لگا جس کے ثمرات آج ہمیں نظر آ رہے ہیں۔[1]

سلطان سید خضر خان بن ملک سلیمان[2]

"طبقات محمود شاہی" اور "تاریخ مبارک شاہی" دونوں کتابوں کے مصنف اس بات پر متفق ہیں کہ خضر خان خاندانِ غور کا فرزند تھا، قوم کا سید تھا، خضر خان ملک سلیمان کا بیٹا تھا، سید خضر خان تخت دہلی پر ۸۱۷ھ میں متمکن ہوا۔

مصنف تاریخ مبارک شاہی نے خضر خان کے خاندان اور حسب و نسب کے بارے میں دو ثبوت لکھے ہیں، وہ یہ ہیں، (۱) جس زمانہ میں خضر خان کا باپ سید ملک سلیمان مردان دولت کے یہاں تعلیم و تربیت حاصل کر رہا تھا تو اس دوران میں ایک بار سید جلال الدین بخاری رحمۃ اللہ علیہ ملک مردان کے یہاں بطور مہمان تشریف لائے، جب دسترخوان بچھا اور سب کھانے پر بیٹھے تو سید ملک سلیمان لوٹا اور طشت لے کر مہمانوں کے ہاتھ دھلانے کے لئے آیا، حضرت مخدوم بخاریؒ نے اس کو دیکھ کر فرمایا کہ سیدوں کو ایسے کاموں پر مقرر کرنا بہت گستاخی ہے اور بے ادبی ہے، چونکہ یہ الفاظ ایک ولی کامل اور

۱ آب کوثر ص ۳۹۱ ۲ سید خضر خان سے پہلے دولت خاں لودھی نے ایک سال تین مہینے حکومت کی تھی۔

بزرگ کے منہ سے نکلے تھے، لہٰذا سلیمان قطعی سید ہوگا اور خضر خان بھی اسی طرح سید کہلانے کا مستحق ہے۔ (۲) دوسری دلیل یہ ہے کہ خضر خان کا کردار، اخلاق، برتاؤ اور دیگر صفات ایسی تھیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ صفات سے مشابہت رکھتی تھیں، لہٰذا یہ بات بھی خضر خان کے سید ہونے کو تقویت بخشتی ہے۔

سید خضر خان ۱۷ رجمادی الاولی ۸۲۴ھ کو اس جہان فانی سے کوچ کر گیا، اس نے سات سال چار مہینے تک حکمرانی کی، یہ عدل و انصاف میں بہت پکا تھا، اس کی ایمانداری اور سچائی ایک ضرب المثل بن چکی تھی، بہت زیادہ سخی بھی تھا، اس کی رعیت بہت زیادہ خوشحال تھی، اس کے انتقال پر شہر کے بچے بچے نے اس کا غم منایا، اور اس کی موت کے تیسرے دن رعایا اور عوام نے ماتمی لباس بدلا، تین دن تک نہایت باقاعدگی سے اس کا غم مناتے رہے، خضر خان کے بعد اس کا فرزند اکبر مبارک شاہ تخت نشین ہوا۔[1]

سلطان سید مبارک شاہ بن خضر خان

دورانِ علالت ہی خضر خان کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اب اس کا وقت بہت قریب آ گیا ہے اور یہ مرض الموت ہے، اس سے نجات نہ ہوگی، اس نے عاقبت اندیشی سے کام لیتے ہوئے اپنے بڑے بیٹے مبارک شاہ کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا، مبارک شاہ نے اپنے باپ کے مرنے کے تین دن کے بعد تاج پوشی کی رسم ادا کی، اور ۸۲۴ھ میں حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔

مبارک شاہ اپنے باپ کے نقش قدم پر حسنِ اسلوبی کے ساتھ حکومت کے امور انجام دیتا رہا اور جا بجا اٹھنے والی بغاوتوں کو فرو کرتا رہا، ۸۳۷ھ میں مبارک شاہ نے ایک نئے شہر کی بنیاد ڈالی اور اس کا نام مبارک آباد رکھا، ایک مرتبہ بادشاہ حسب سابق چند خاص درباریوں کے ساتھ مبارک آباد گیا، اور عمارتوں کی سیر و تفریح کر کے جمعہ کی نماز کے لئے تیاری کرنے لگا، اس وقت اس کے نمک خوار غلاموں نے نمک حرامی کی، اور اس کو شہید کر دیا، تاریخ ۹ رجب ۸۳۷ھ تھی، سلطان مبارک شاہ اچھا اور کامیاب حکمران تھا، اس نے تیرہ سال تین مہینے اور سولہ دن تک حکومت کی، یہ نہایت عقل مند اور بااخلاق تھا، اس نے اپنے عہدِ حکومت کے پورے عرصہ میں اپنے منہ سے کوئی برا کلمہ نہیں نکالا، کبھی کسی کو گالی تک نہ دی، مکروہات سے بہت دور بھاگتا تھا، سلطنت کے سارے کاموں کو خود سر انجام دیتا اور خود ان کی تحقیق کرتا تھا، ذمہ داری کا کام امراء پر کبھی نہ چھوڑتا، اور کتاب "تاریخ مبارک شاہی" اسی نامی گرامی بادشاہ کے نام سے مشہور ہے۔[2]

۱ تاریخ فرشتہ اول ص ۴۹۵ ۲ تاریخ فرشتہ اول ص ۵۱۲

Scanned by CamScanner

مبارک شاہ کے بعد خضر خان کا پوتا۔ محمد شاہ ابن فرید خان بن خضر خان۔ تخت نشین ہوا اور بارہ سال حکومت کر کے ۸۴۹ھ میں انتقال کر گیا، اس کے بعد محمد شاہ کا بیٹا علاؤ الدین تخت نشین ہوا اور ۸۵۵ھ میں انتقال کر گیا، اس نے دہلی کے تخت پر تقریباً سات سال تک حکومت کی اور اس کے بعد خاندان لودھی برسر اقتدار آ گیا۔

(خاندان لودھی)

سلطان بہلول لودھی

۸۵۵ھ میں سلطان بہلول لودھی مستقل طور پر دہلی کا حکمران تسلیم کر لیا گیا، اس نے علاؤ الدین کا نام خطبہ سے ہٹا دیا اور صرف اپنا نام رکھا، اور ملک کا نظم ونسق اٹھنے والی بغاوتوں کو فرو کرنے کے ساتھ ساتھ سنبھالے رکھا، اس کی ظاہری خوبیاں نا قابل بیان ہیں، شرع کا بہت پابند تھا، زیادہ تر سفر و سیاحت اور فقراء، درویش صفت لوگوں کی خدمت میں رہتا، اور انہیں کی صحبت میں زندگی گزارتا، اپنے افغان بھائیوں سے بہت اچھا برتاؤ کرتا تھا، اور ان افغان امراء کے سامنے کبھی تخت پر جلوہ افروز نہ ہوتا، بلکہ مساوات کے قانون کو مد نظر رکھتے ہوئے انہیں کے ساتھ ہمیشہ فرش پر جلوہ نشین ہوتا، دہلی فتح کر کے پہلے بادشاہوں کی جو ملکیت اور خزانہ ہاتھ آیا وہ تمام افغانی امراء میں برابر تقسیم کیا، اور خود بھی ایک ہی حصہ اپنے لئے رکھا، اپنے گھر میں کبھی کھانا نہ کھاتا، طویلہ خاص کے شاہی گھوڑوں پر کبھی سواری نہیں کرتا تھا، وہ کہتا تھا کہ میرے لئے صرف سلطنت کا نام ہی کافی ہے، مغل سپاہ کی بہادری پر بڑا اعتماد تھا، یہی وجہ تھی کہ مغل شہزادوں اور سپاہیوں کی تعداد تقریباً بیس ہزار ہو گئی تھی، جہاں کہیں کسی مقام کے متعلق سن لیتا کہ وہاں پر کوئی بہادر نوجوان موجود ہے اس کو فوراً بلاتا اور حسن سلوک سے پیش آتا، یہ بادشاہ بہت زیادہ عقل مند، دلیر اور شجاع تھا، آئین جہانداری اور حکومت کے امور میں اس کو ملکہ حاصل تھا، کبھی جلد بازی سے کام نہیں لیتا تھا، ہمیشہ رعایا پروری اور عدل وانصاف میں اپنی زندگی گزار کر ۸۹۴ھ ۱۴۸۹ء میں لودھی نے دنیا کو خیر باد کہا، بہلول لودھی نے اڑتیس (۳۸) سال اور کچھ مہینے حکمرانی کی۔

تاریخ عہد مغلیہ میں لکھا ہے کہ "لودھی خاندان برسر اقتدار نہ آتا تو ہندو گردی کا خطرہ جسے تیموری یلغار نے سر سے ٹال دیا تھا دوبارہ نمایاں ہو جاتا۔"

اسلامی عظمت واقتدار کی اس گرتی ہوئی عمارت کو اپنے عصائے شاہی پر روک لیا، بلا شبہ یہ لودھی خاندان کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے مسلمانوں کی ڈھلتی ہوئی عظمت کو سلاطین مغلیہ کی آمد تک حفاظت سے سنبھال کر رکھا، اور یہ امانت کسی اندرونی ہندوانہ انقلاب کے خطرہ سے بچ گئی۔[1]

[1] [illegible]

سلطان سکندر لودھی

سلطان بہلول لودھی کے انتقال کے بعد تمام اراکین سلطنت نے مل کر اس کے بڑے بیٹے سکندر لودھی کو باپ کی جگہ پر ۸۹۴ھ میں تخت نشین کیا، سلطان سکندر لودھی کا کردار بھی بہت اچھا تھا باپ کی طرح یہ بھی حسن اخلاق کا مجسمہ تھا، ہر ایک افغان سے اچھا برتاؤ کرتا اور انہیں اپنا بھائی سمجھتا، بادشاہ تمام امراء دولت اور اراکین کے سامنے تخت نشین ہوا۔

شیخ بہار الدین سے عقیدت

مؤرخین لکھتے ہیں کہ جب سلطان بہلول لودھی کا انتقال ہوا، اور لوگوں نے سکندر لودھی کو جانشینی کے لئے طلب کیا تو پہلے سلطان سکندر لودھی دہلی میں شیخ بہار الدین کی خدمت میں گیا، یہ بڑے ولی کامل تھے، تا کہ یہ اپنے حق میں دعاء خیر کرا سکے، حضرت شیخ بہار الدین سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے سامنے کتاب میزان پڑھوں، یہ کہہ کر کتاب کھولی اور پڑھنا شروع کر دیا، جب استاذ نے جملہ "اسعدک اللہ تعالیٰ فی الدارین" (جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ تجھ کو دین و دنیا میں نیک بخت کرے) پڑھا، تو بادشاہ نے استاذ سے اس جملہ کی تکرار کے لئے کہا، اور استاذ نے اس کو تین بار پڑھا، اس کے بعد سلطان نے ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور وہاں سے روانہ ہو گیا، اور استاذ کی اس بات کو نیک فال قرار دیا۔ سلطان سکندر مذہب اور شرع کا بہت پابند تھا، مملکت کی تمام مسجدوں اور مزاروں پر جھاڑو دینے والے اور خطیب اور قاری خاص طور پر بادشاہ نے مقرر کئے تھے، اور ان کے نام باقاعدہ وظیفے اور تنخواہیں مقرر کی گئیں، سلطان سکندر نے علوم وفنون کو بھی ترقی دی اور سرپرستی بھی کی، اس کے عہد میں ہر طبقہ کے لوگ مثلاً امراء، اراکین سلطنت اور سپاہی ہر ایک مختلف طرح کے علوم حاصل کرنے کی طرف متوجہ تھے، بلکہ اس کے زمانے میں ہندو بھی علم کی طرف مائل ہوئے اور فارسی تعلیم کی طرف توجہ دی۔[1]

"آب کوثر" میں لکھا ہے کہ سکندر ایک قابل اور بیدار مغز بادشاہ تھا، اس نے آگرہ شہر کی بنیاد رکھی اور اسے اپنا دار الخلافہ بنایا، اس کا بہت وقت افغان امراء اور اٹاوہ چندیری اور گوالیار کے ہندو راجاؤں سے لڑائی میں گزرا، لیکن پھر بھی اس نے علم وفن کی طرف بہت توجہ کی، اس کے زمانے میں ملتان کے دو بڑے عالم شیخ عبد اللہ تلنبی[2] اور شیخ عزیز اللہ دہلی تشریف لائے، انہوں نے درس وتدریس کے معیار کو بہت بلند کیا، بادشاہ نے ان بزرگوں کی بڑی قدر کی، وہ شیخ عبد اللہ کی درس گاہ میں خود شریک ہوتا تھا اور

[1] تاریخ فرشتہ اول ص ۵۵۱ [2] تلنبہ ملتان کے قریب ایک قصبہ ہے

Scanned by CamScanner

اس خیال سے کہ اس کے جانے سے درس کا سلسلہ رُک نہ جائے، چھپ کر مدرسہ سے متصل گوشۂ مسجد میں بیٹھ جاتا وہاں سے وہ مولانا کی پوری تقریر سنتا اور فیض حاصل کرتا، سکندر لودھی ہی کے زمانے میں مولانا رفیع الدین شیرازی محدث شیراز سے دہلی تشریف لائے، بادشاہ نے ان کی بڑی قدر کی، اور انہوں نے آگرہ میں مدتوں درسِ حدیث کا سلسلہ جاری رکھا۔ سلطان سکندر جب کسی علاقہ کا گورنر تھا اس وقت کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک دن اس کو کسی نے خبر دی کہ رو کیشتر[3] میں بہت سے ہندو جمع ہیں اور تالاب میں نہانے اور مندر میں پرستش کرنے کے علاوہ انہوں نے وہاں ہنگامہ مچا رکھا ہے، سکندر نے ارادہ کیا کہ فوراً انہیں تہِ تیغ اور مندر کو مسمار کیا جائے، لیکن خوش قسمتی سے اس نے ملک العلماء عبد اللہ سے مشورہ کیا، ملک العلماء نے فتویٰ دیا کہ ذمیوں کی ایک قدیمی عبادت گاہ کو گرانا خلاف شرع ہے، اور ہندوؤں کے اشنان کی دیرینہ رسم بند کرنا ناجائز ہے۔ شہزادہ یہ سن کر آگ بگولہ ہو گیا، اس نے اپنے خنجر پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ تم بھی کفار کے ساتھی ہو، میں پہلے تمہارا خاتمہ کروں گا اور پھر کفار کا، ملک العلماء نے جواب دیا: ہر ایک کی زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے، اور اس کے حکم کے بغیر کسی کو موت نہیں آ سکتی، جب کوئی شخص کسی ظالم کے سامنے آئے تو پہلے اسے زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھنا چاہئے، تم نے جو کچھ مجھ سے پوچھا، میں نے احکام نبوی کے مطابق اس کا جواب دیا، اگر تمہیں اس کی قدر منظور نہ تھی تو تم نے مجھ سے پوچھا ہی کیوں، اس جرأت کی وجہ سے سکندر کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور وہ اپنے ارادہ سے باز آیا۔[1]

جس سرحد کے امیر کے نام حکم نامہ صادر کیا جاتا وہ اس کو چبوترے کے نیچے اتر کر لیتا اور سر پر رکھتا، اگر بادشاہ کا فرمان ہوتا تو فرمان وہیں پڑھ کر سنایا جاتا، ورنہ پھر اس کے حکم کے مطابق مسجد میں منبر پر چڑھ کر سنایا جاتا، اگر کوئی راز کی بات ہوتی تو فرمان پوشیدہ طور پر پڑھا جاتا، اس کے دربار میں جیسا کہ علاؤ الدین خلجی کے دربار کا دستور تھا روزانہ اناج کے بھاؤ اور وہ علاقے جن پر بادشاہ کا قبضہ تھا ان کے واقعات روزانہ سب دربار میں پڑھ کر سنائے جاتے، اگر بادشاہ کے حکم سے سرمو تجاوز کیا جاتا تو بادشاہ فوراً اس کی روک تھام کرتا اور قوانین پر چلنے کی ہدایت کرتا، بادشاہ زیادہ اوقات جھگڑے چکانے، فیصلے کرنے اور رعایا کی فلاح و بہبود میں صرف کرتا۔ اس کے علاوہ بھی اس کی دانشمندی اور عقل و فہم کے بارے میں بہت سی باتیں نقل کی گئی ہیں۔[2]

عہد سکندری کی ایک نہایت دلچسپ تصنیف "معدن الشفا" یا "طب سکندری" ہے، اس کا مصنف میاں بھوہ امرائے سکندری میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا، اس نے سلطان سکندر سے کہا کہ یونانی ادویہ اور ہندوستانی طبیعتوں میں کوئی خاص مناسبت نہیں ہے، اس لئے حکماء ہند کی کتابوں کا فارسی زبان میں

---

۱ آب کوثر ص ۴۵۵ ۲ تاریخ فرشتہ اول ص ۵۵۳ ۳ ایک جگہ کا نام ہے

ایک ایسا خلاصہ مرتب ہونا چاہیے، جس میں تمام مشہور ہندوستانی اطبا کے نسخوں [illegible] کے مفرد ادویہ کا ذکر آ جائے، بادشاہ نے اس رائے سے اتفاق کیا اور میاں بھوہ نے پانچ [illegible] ایک مفصل کتاب تالیف کی، جس میں ایک ہزار ایک سو سات امراض اور ان کے علاج [illegible] ذکر تھا، ہندوستان میں اسلامی طب کی تدوین و ترقی میں اس کتاب کو تاریخی اہمیت حاصل ہے، یہ کتاب آج کل بھی متداول ہے، اور نول کشور پریس نے اسے چھاپ کر شائع کیا ہے۔[1]

علمی ذوق

سکندر کو شعر و شاعری سے بھی بہت تعلق تھا، وہ ایک صاف ستھرا ذوق رکھتا تھا، بہت [illegible] طبیعت شاعری کی طرف مائل تھی، عمدہ عمدہ اشعار لکھا کرتا تھا، اس کا تخلص "گل رخی" تھا، اس کے دورِ حکومت میں "فرہنگ سکندری" اور دوسری علمی و ادبی کتابیں لکھی گئیں۔

سکندر لودھی کا انتقال

بادشاہ کو خطرناک مرض لاحق ہو گیا تھا، اس حالت میں بھی وہ امور سلطنت انجام دیتا رہا، لیکن [illegible] مرض اتنا بڑھ گیا کہ ذوالقعدہ کی سات تاریخ کو ۹۲۳ھ میں اس کا انتقال ہو گیا [illegible] فرہنگ سکندری کا مصنف لکھتا ہے کہ سکندر لودھی نے اٹھائیس سال پانچ مہینے حکومت کی۔[2]

سلطان ابراہیم لودھی

سلطان سکندر لودھی کا انتقال آگرہ میں ہوا، اور اس کا بڑا بیٹا ابراہیم لودھی اس کا جانشین ہوا۔ سلطان ابراہیم لودھی ایک کمزور حکمران تھا، بالآخر بابر نے ۹۳۲ھ میں ہندوستان پر حملہ کیا، اور پانی پت کے میدان میں خونریز معرکہ آرائی ہوئی بابر کو فتح حاصل ہوئی، اور ابراہیم لودھی میدان جنگ میں مارا گیا، دہلی کی حکومت صاحبقران امیر تیمور کی اولاد کے پاس منتقل ہو گئی، لودھی خاندان کی تاریخ مکمل ہو گئی، اس نے نو سال سے کچھ کم حکومت کی، اور مغل بابر کی حکومت ہندوستان میں قائم ہو گئی۔[3]

شیخ عبدالقدوس گنگوہی کو لودھی افغانوں سے خاص تعلق خاطر تھا، انہوں نے [illegible] بالخصوص سکندر لودھی نے پھر سے شعائر اسلام کو بلند کیا، اس لئے وہ ان کی بڑی قدر کرتے تھے، سکندر لودھی کے نام ایک خط ہے جس میں اسے غم خواری خلق بالخصوص علماء [illegible] کی [illegible] ہے۔

---

۱ آب کوثر ص ۵۹۵ ۲ تاریخ فرشتہ اول ص ۵۷۱ [illegible]

Scanned by CamScanner

نیز ۱۵۲۶ء میں بابر اور ابراہیم لودھی کا میدان پانی پت میں معرکہ ہوا، شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ اور ان کے اکثر مریدین ابراہیم لودھی کے لشکر میں موجود تھے، اور شیخ فرماتے تھے کہ ابراہیم کی فتح بڑی مشتبہ تھی، لیکن بادشاہ نے اصرار کیا کہ وہ شاہی لشکر کے ساتھ رہیں، چنانچہ جب بابر کو فتح ہوئی تو یہ بھی گرفتار ہوئے، ان کے ساتھ ان کے دو مرید بھی تھے ان کے گلے میں مرشد کی سیاہ پگڑی ڈال کر باندھ لیا گیا اور شیخ کو حکم ہوا کہ پا پیادہ چلیں، چنانچہ وہ پیادہ پانی پت سے دہلی تشریف لائے، لیکن بعد میں رہائی مل گئی، جب تخت دہلی پر بابر جانشین ہوا تو آپ نے بابر کو ایک خط میں تاکید کی کہ شرع محمدی کی ترویج کیلئے ضروری اقدامات عمل میں لائیے۔[1]

خاندان مغلیہ

مغلیہ حکومت کا بانی سلطان بابر

مغلیہ خاندان کی بنیاد سلطان بابر نے ڈالی جو تیمور کی نسل سے تھا۔ (امیر تیمور سلطان بابر کا جدِ امجد ہے)

گیارہ برس کی عمر میں وہ ترکستان[2] کے شہر فرغانہ[3] میں تخت نشین ہوا، لیکن مخالفوں سے ایک طویل کشمکش کے بعد اسے موروثی وطن چھوڑنا پڑا، اس کے بعد اس نے پہلے کابل میں اپنی حکومت قائم کی، پھر

[1] رود کوثر ص ۵٦

[3] وادی فرغانہ:۔ یہ ازبکستان کی بڑی زرخیز اور مردم خیز سرزمین ہے جو مغل بابر کا مسکن و مولد ہونے کا شرف رکھتی ہے (لاہور سے تاخاک بخارا و سمرقند ص ۳۳) صاحبِ ''ہدایہ'' قاضی برہان الدین المرغینانی نے بھی اسی سرزمین میں جنم لیا، اس وادی کا مشہور شہر نمنگان ہے، جو دریائے سیر کے کنارے آباد ہے، دریا کے دوسرے کنارے پر بابر کے والد عمر شیخ کا قلعہ ہے، جہاں اب بھی اس کے آثار قدیمہ کے نشانات ہیں، بابر اس تاریخی قلعہ میں پیدا ہوا، سات سال تک اسی قلعہ میں پرورش پائی۔ (حوالۂ بالا ص ۳۴)

سیر اور کارا دونوں دریا نمنگان کے قریب ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے ہیں تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ سیر اور کارا کی وادی میں پرورش پانے والا مغل بچہ گنگا اور جمنا کی وادیوں کا تاجدار بنا (ایضاً ص ۳٦)

نمنگان شہر میں روسی انقلاب سے پہلے ایک ہزار مساجد تھیں، مگر کمیونسٹوں نے دو بڑی مساجد کے علاوہ باقی سب کو بند کر دیا تھا، اب الحمدللہ سب کی تعمیر نو ہو رہی ہے، بائیس مساجد میں جمعہ شروع ہو چکا ہے، باقی مساجد کا تعمیری کام جاری ہے (ایضاً ص ۴۲) سمرقند کے عین وسط میں ایک تاریخی جگہ ''ریگستان چوک'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں مدارس کی تین عالیشان بلند و بالا اور حسین و جمیل عمارتیں ہیں، پندرھویں صدی میں امیر تیمور کے بیٹے مرزا الغ بیگ نے اس میں سب سے پہلا مدرسہ قائم کیا، وہ اس مدرسہ میں خود استاد کے طور پر کام کرتا تھا، اپنے زمانے کا مانا ہوا، ریاضی دان، فلسفی اور ماہر علم نجوم تھا۔

انہی مدارس میں کسی دور میں حضرت دارمیؒ اور صاحب ہدایہ جیسے جبال علم تشنگان علم کی پیاس بجھایا کرتے تھے۔ (ایضاً ص ۸۲)

[2] یہ ترکستان جس کو مغلوستان بھی کہتے ہیں۔ استنبول والا ترکی نہیں ہے۔

ہندوستان کے بعض امیروں کی دعوت پر جو حاکمِ وقت ابراہیم لودھی کے سلوک سے نالاں تھے۔ ہندوستان آیا اور ۱۵۲۶ء میں پانی پت کے میدان میں ابراہیم کو شکست دے کر دہلی پر قابض ہو گیا بابر نے دہلی فتح کرلی، لیکن دہلی کی فتح سے ہندوستان فتح نہ ہوا تھا، مرکزی حکومت کی کمزوری سے ہر طرف صوبے دار خود مختار ہو گئے تھے، شمالی ہندوستان میں رانا سانگا نے بڑا اقتدار حاصل کرلیا تھا، بابر کا سب سے بڑا معرکہ ۱۵۲۹ء میں اسی کے ساتھ ہوا حکومت دہلی کے کمزور ہونے پر بہت سے ہندو راجاؤں نے سر اٹھایا تھا، وہ بھی رانا سانگا کے حامی تھے، تقریباً پونے دو لاکھ فوج بابر کے مقابلہ میں آئی، بابر نے مخالفوں کی پرواہ نہیں کی، لیکن جب شاہی فوج کے ہراول دستہ کو راجپوتوں نے شکست دی اور بیانہ کی فوج جو اُن کی مدد کو گئی تھی اسے بھی شکست کھا کر محصور ہونا پڑا تو پھر شاہی لشکر پر فکر و ہراس طاری ہوا، بعض امرا نے مشورہ دیا کہ بڑے قلعے معتمد سرداروں کے سپرد کرکے پنجاب لوٹ جانا چاہئے اور کسی لطیفۂ غیبی کا انتظار کرنا چاہئے، لیکن بابر نے امرا کا یہ مشورہ سن کر ایک پرجوش اور ولولہ انگیز تقریر کی اور کہا کہ اطراف و اکناف کے مسلمان بادشاہ ہم پر اظہارِ نفرت کریں گے اور یوں گویا ہوں گے کہ ہم زندگی کو عزیز سمجھ کر ایک بڑی سلطنت کو ہاتھ سے کھو بیٹھے، لہٰذا پوری ہمت و جرأت کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہئے، اگر ہم قتل ہو گئے تو ہمارا نام شہیدوں میں لکھا جائے گا نہ کہ بھگوڑوں میں سے بابر کی اس تقریر سے بڑا جوش پیدا ہوا، سب نے ''الجهاد'' ''الجهاد'' کا نعرہ لگایا، اور قسمیں کھائیں کہ ہم میدان سے پیچھے نہیں ہٹیں گے مر گئے تو شہید اور کامیاب ہوئے تو غازی۔[1]

بابر نے شراب نوشی اور غیر مشروع احکام سے توبہ کی، اور خدائے عزوجل کی بارگاہ میں دعا کر کے میدانِ جنگ میں آگے بڑھا، معرکہ سارا دن جاری رہا، راجپوت بھی اس لڑائی کو شمالی[2] ہند کی قسمت کا فیصلہ کرنے والی سمجھ کر جان توڑ کر لڑے، لیکن فتح بالآخر بابر کے حق میں ہوئی، اس کے بعد بابر نے غازی کا لقب اختیار کیا مغلیہ خاندان میں بڑے بڑے نامور بادشاہ پیدا ہوئے ہیں، لیکن بابر کی شخصیت میں ایک خاص دل کشی ہے، اس کی ذات اسلامی تمدن کی امتیازی خصوصیت کو نمایاں کرتی ہے، اسلامی طرز معیشت میں ایک ہی شخص بیک وقت صاحب سیف و قلم ہو سکتا ہے، بابر فقط ایک بہادر سپاہی اور قابل سپہ سالار ہی نہ تھا بلکہ وہ فارسی اور ترکی کا اچھا شاعر بھی تھا، اس کی لکھی ''تزک بابری'' اپنی قسم کی ایک بے نظیر کتاب ہے، اور بابر کی جامع صفات شخصیت کا دلچسپ مرقع ہے، اس میں لفاظی نہیں خلوص ہے، اور سنی سنائی باتیں نہیں، آنکھوں دیکھی اور مشاہدہ کی ہوئی چیزوں کا بیان ہے، مناظرِ فطرت، درختوں اور

[1] رود کوثر ص ۲۱ [2] شمالی ہند سے مراد میوات کا علاقہ ہے

Scanned by CamScanner

پرندوں سے بابر کو جو دلچسپی تھی اس کا تفصیلی اظہار ہے، اور ترکستان، افغانستان اور ہندوستان کے متعلق بڑے پتے کی اور پر مغز باتیں درج ہیں۔

''تزک بابری'' کی تصنیف کے علاوہ بابر خط بابری کا موجد تھا، اور اس طرز تحریر میں کلام مجید کے نسخے لکھ کر مکہ معظمہ بھجوائے، اسے ہندوستان میں زیادہ عرصہ رہنے کا موقع نہیں ملا، لیکن اپنی ذہانت سے اس نے جلد ہی یہاں کی خصوصیات پالیں اور اس نے ہمایوں کے لئے جو وصیت لکھی اس سے اس کی سمجھ، انصاف پسندی اور مدبرانہ قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ وصیت نامہ یہ ہے:

''فرزند من ہندوستان میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی عنایت ہے کہ اس نے تمہیں اس ملک کا بادشاہ بنایا ہے، اپنی بادشاہی میں تمہیں ذیل کی باتوں کا خیال رکھنا چاہئے۔[1]

(۱) تم مذہبی تعصب کو اپنے دل میں ہرگز جگہ نہ دو، اور لوگوں کے مذہبی جذبات اور مذہبی رسوم کا خیال رکھتے ہوئے اور رعایت کئے بغیر سب لوگوں کے ساتھ پورا انصاف کرنا۔ (۲) گاؤ کشی سے بالخصوص پرہیز کرو، تاکہ اس سے تمہیں لوگوں کے دل میں جگہ مل جائے اور اس طرح وہ احسان اور شکریہ کی زنجیر سے تمہارے مطیع ہو جائیں۔ (۳) تمہیں کسی قوم کی عبادت گاہ مسمار نہیں کرنی چاہئے، اور ہمیشہ سب سے پورا انصاف کرنا چاہئے، تاکہ بادشاہ اور رعیت کے تعلقات دوستانہ ہوں، اور ملک میں امن و امان رہے۔ (۴) اسلام کی اشاعت ظلم و ستم کی تلوار کے مقابلے میں لطف و احسان کی تلوار سے بہتر ہو سکے گی۔ (۵) شیعہ سنی اختلافات کو ہمیشہ نظر انداز کرتے رہو، کیونکہ ان سے اسلام کمزور ہو جائے گا۔ (۶) اپنی رعیت کی مختلف خصوصیات کو سال کے مختلف موسم سمجھو، تاکہ حکومت بیماری اور ضعف سے محفوظ رہ سکے۔[2]

میرے لئے ہندوستان میں داخلہ خدا کا فضلِ عظیم ہے

سلطان بابر نے اپنی کتاب ''واقعات بابری'' میں لکھا ہے کہ رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سے اس وقت تک تین فرماں روانِ اسلام ہندوستان آئے، اور اس ملک پر قبضہ کیا، اول سلطان محمود غزنوی کیونکہ عرصے تک اس بادشاہ کی اولاد ہندوستان کی حکومت کرتی رہی، دوسرے سلطان شہاب الدین غوری جس کے لے پالک بیٹوں نے بڑے جاہ و جلال کے ساتھ حکومت کی، اور تیسرا میں، لیکن میرا حال میرے دونوں پیش رو حکمرانوں سے بالکل مختلف ہے۔

[1] رود کوثر ص ۲۱

[2] ترجمہ از ''انڈین اسلام'' ٹائی ٹس بحوالہ رود کوثر ص ۲۳

سلطان محمود غزنوی نے جب ہندوستان پر حملہ کیا تو اس وقت وہ ماوراء النہر، خوارزم اور خراسان کا بھی حاکم تھا اور غزنوی فوج کی تعداد بھی ایک لاکھ سے کم نہ تھی، دوسرے ہندوستان کی حالت بھی ٹھیک نہ تھی، یہاں کوئی عظیم الشان بادشاہ نہ تھا، جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے راجہ حکومت کرتے تھے، اگرچہ سلطان شہاب الدین غوری خراسان کا بادشاہ نہ تھا، تاہم اس کا بھائی بادشاہ تھا، اور سلطان غوری ایک لاکھ بیس ہزار سوار لے کر ہندوستان آیا تھا، غزنوی سلطان کی طرح غوری کے وقت میں بھی ہندوستان میں طوائف الملوکی تھی، لیکن میرا حال یہ ہے کہ جب میں پہلی مرتبہ ہندوستان آیا تو ڈیڑھ دو ہزار سوار میرے ہم رکاب تھے۔ بدخشاں، کابل، قندھار کی حکومت میری تھی، لیکن ان شہروں سے نصف خراج بھی مجھ تک نہیں پہنچ سکتا تھا مملکت کے بعض حصے ایسے تھے کہ دشمن کے قریب ہونے کی وجہ سے مدد کے محتاج تھے، ہندوستان میں بھیرہ سے بہار تک افغانوں کا تسلط تھا، ہند کی طاقت کو دیکھتے ہوئے میرے ساتھ پانچ لاکھ فوج ہونی چاہیے تھی، ابراہیم لودھی کا لشکر ایک لاکھ سپاہیوں پر مشتمل تھا، اس کے علاوہ ایک ہزار جنگی ہاتھی بھی اس کی فوج میں تھے، اس سے زیادہ یہ بات تھی کہ ازبک جیسے زبردست حریف کو اپنے پیچھے چھوڑ کر لودھی جیسے خون خوار دشمن سے میں نے ٹکر لی، لیکن خدا کا فضل اور بھروسہ کام آیا کہ ان تمام مشکلات کے ہوتے ہوئے بھی مجھے کامیابی ہوئی، اور ہندوستان میرے قبضے میں آ گیا، میں اس کو صرف اپنی کوشش اور جدو جہد کا نتیجہ نہیں سمجھتا، بلکہ یہ فتح محض خدا کی عنایت اور کرم کی وجہ سے مجھے نصیب ہوئی یہ میرا ایمان ہے۔[1]

بیماری

واقعاتِ بابری میں خود بابر نے یہ تحریر کیا ہے کہ ۲۳ رصفر ۹۳ھ کو مجھے اپنے بدن میں ایسی حرارت محسوس ہوئی کہ میں نے نماز جمعہ مسجد میں بڑی مشکلوں سے ادا کی، اس کے تیسرے روز بخار آ گیا، اس زمانہ میں حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ کے رسالہ ''ولدیہ'' کو نظم کا لباس پہنا رہا تھا، میرے دل میں خیال گزرا کہ اگر یہ میری خدمت حضرت شیخ کی بارگاہ میں مقبول ہوئی تو مجھے اپنے موجودہ مرض سے نجات مل جائے گی، بالکل اسی طرح جس طرح ''قصیدۂ بردہ'' کے مصنفؒ نے اپنی طویل نظم کی مقبولیت سے اپنے مرض سے شفا پائی، میں نے اس رسالہ کو اسی وزن میں نظم کیا ہے کہ جس میں حضرت مولانا جامیؒ کا سبحہ ہے۔[2]

[1] تاریخ فرشتہ اول ص ۵۹۵

[2] یہ بحر رمل مسدس مخبون میں ہے، اس کا وزن ''فاعلات، فاعلات، فاعلات'' ہے

گوالیار اور بہار کا سفر

بابر نے ۹۳۵ھ میں گوالیار کے قلعہ اور اس کے باغ کی سیر کی، نیز گوالیار میں سلطان شمس الدین کی تعمیر کردہ مسجد کی زیارت بھی کی اور بار بار سلطان کی مغفرت کی دعا کی، اس کے بعد آگرہ لوٹ آیا، اس کے بعد جب بابر بہار گیا تو منیر نامی قصبے میں پہنچا تو اس نے حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے والد حضرت شیخ کے مزار کی زیارت کی اور خوب جی کھول کر خیرات کی اور ایصال ثواب کیا اور کامیاب واپس آ گیا۔

عادات وخصائل

تمام مورخ متفق ہیں کہ بابر ایک بہادر، بامروت اور حوصلہ مند بادشاہ تھا، جس کی مثال شاہان سلف میں کم یاب ہے، اس کی خاص صفت خطا بخشی اور جرم پوشی کی تھی، بابر حنفی المذہب تھا، صوم وصلوٰۃ کا پابند تھا علم فقہ، شاعری، املاء اور انشاء وغیرہ علوم میں وہ مہارت تامہ رکھتا تھا، اس کے اپنے عہد حکومت کے واقعات ترکی زبان میں ایسی عمدگی سے لکھے ہیں کہ اس زبان کے بڑے بڑے علماء نے اس کی استادی کو تسلیم کیا ہے، سلطان اکبر کے عہد میں بیرم خان کے بیٹے خان خاناں نے اس کتاب کا ترکی سے فارسی میں ترجمہ کیا جو آج تک مروج ہے۔

بابر شکل وصورت اور ظاہری ہیئت کے لحاظ سے ایک دلکش شخصیت کا مالک تھا، خوش بیانی اور خندہ روئی نے اس کے حسن میں اضافہ کر دیا تھا، ذہانت وفطانت میں بھی اپنی مثال آپ تھا۔

بابر کا انتقال

جب بیمار ہوا تو اپنے بیٹے ہمایوں کو اپنا جانشین مقرر کر دیا، ۵ رجمادی الاولی ۹۳۷ھ مطابق ۱۵۳۰ء کو بابر نے داعی اجل کو لبیک کہا، اس کی وصیت کے مطابق لاش کابل روانہ کر دی گئی اور وہیں دفن کیا گیا۔ بابر نے اڑتیس سال حکومت کی، جس میں ہندوستان کے چار سال داخل ہیں۔

سلطان ہمایوں

بابر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں تیس (۳۰) سال کی عمر میں ۹۳۷ھ مطابق ۱۵۳۰ء میں تخت نشین ہوا، اعلیٰ طبیعت اور عمدہ اخلاق کا فرماں رواں تھا، علم ریاضی اور نجوم سے خاص دلچسپی تھی، بنگالہ کا حاکم شیر شاہ سوری نے ہمایوں کو شکست دے کر ملک سے بے دخل کر دیا، اور ہمایوں نے فرار ہو کر ایران میں شاہ طہماسپ کے پاس پناہ لی، تقریباً دس سال ہمایوں پہلی بار ہندوستان کا فرماں رواں بنا رہا، اس کے بعد ۹۴۷ھ مطابق ۱۵۴۰ء میں ہندوستان سے بے دخل ہو گیا، اس کے بعد شیر شاہ سوری اور اس کا خاندان برسر اقتدار آیا۔

خاندان سور (افغانوں کی حکومت)

سلطان شیر شاہ سوری

شیر شاہ سوری ایک معمولی جاگیردار کے عہدے سے ترقی کرتا ہوا، ہندوستان کا بادشاہ بن گیا، جس نے پانچ سال تک تخت دہلی پر حکومت کی، اس نے جونپور کے مدرسہ میں تعلیم پائی تھی، سکندر نامہ، گلستاں، بوستاں وغیرہ اسے زبانی یاد تھیں، فلسفہ سے بھی واقف تھا، اور عربی میں کافیہ اور شرح کافیہ (مصنفہ قاضی شہاب الدین) پڑھ چکا تھا، وہ قدیم سلاطین کی تاریخ کا شائق تھا، اور علما فضلاء کی بڑی قدر کرتا تھا، علم وفضل سے دلچسپی کے علاوہ بڑا منتظم اور قابل حاکم تھا۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ شیر شاہ بڑا بیدار مغز بادشاہ تھا، اور اگر موت اسے کچھ مہلت دیتی تو شاید آج ہندوستان کا نقشہ کچھ اور ہوتا، شیر شاہ کا دس سالہ امارت کا دور اور پانچ سالہ بادشاہت کا دور رہا ہے، اپنے عہد میں بنگالہ اور سنار گاؤں سے دریائے سندھ تک پندرہ سو میل پختہ سڑک بنوائی، اور وقفہ وقفہ سے سرائیں تعمیر کرائیں، جس میں تیار پکا ہوا کھانا مسافروں کو ملتا تھا، مسلمانوں کے لئے سرائیں میں ایک جانب تیار کھانے کا بندوبست تھا اور ہندوؤں کے لئے دوسری جانب بندوبست تھا، کھانے کی کچی جنس بھی مہیا رہتی تھی، تمام راستوں میں پھل دار درخت لگائے گئے تھے، تاکہ مسافروں کے لئے سفر کرنا آسان ہو سکے، یہ ضرورتیں اس زمانہ کے اعتبار سے مسافروں کے لئے نہایت کارآمد اور مفید تھیں، ان سرایوں میں کھانا پکانے والے نانبائی مامور ہوتے تھے، جن کو آج کل بھٹیارہ کہا جاتا ہے مشہور یہ ہے کہ یہ انھی کی نسل میں سے ہیں۔

افغانوں کی حکومت

نیز جو راستے طویل تھے مسافروں کے لئے مسجدیں اور پختہ کنویں تعمیر کرائے، موٴذنوں اور جاروب کشوں کو متعین کر کے وظائف دیئے، شیر شاہ سوری کا اصل نام فرید تھا، اور افغان پٹھانوں کے ایک قبیلہ کا نام سور ہے، بادشاہ ہونے سے پہلے بہار میں ایک صوبے کا حاکم بہادر خان کے پاس رہتا تھا، ایک مرتبہ بہادر خاں اور فرید خاں دونوں شکار کے لئے جنگل میں گئے، جس میں ایک شیر کا مقابلہ ہوگیا، قریب تھا کہ شیر بہادر خان کو لقمہ بنالیتا، مگر شیر خان نے بڑی بہادری سے شیر پر تلوار چلائی، جس سے شیر ڈھیر ہوگیا، بہادر خان نے فرید کی یہ بہادری دیکھ کر انعام وخلعت سے نوازا، اور اس کا لقب شیر خان رکھ دیا، جب شیر خان بادشاہ ہوا تو وہ شیر شاہ سے مشہور ہوا۔

شیر شاہ دس سال تک بنگالہ کا حاکم رہا، اور پانچ سال تک پورے ملک کی فرماں روائی کی، اپنے پنج سالہ دور میں کسی مغل کی ہمت ملک میں داخل ہونے کی نہ ہوسکی، ہمایوں کو ملک سے باہر کردیا، اب ہمایوں دوبارہ ہندوستان کو سر کرنے کے انتظار میں تھا، مگر شیر شاہ کے دور میں ہمت نہ کرسکا تھا۔

منتخب اللباب کے مصنف نے لکھا ہے کہ شیر شاہ کی انتظامی صلاحیتوں کا پانچ سالہ حکمرانی میں جو اندازہ ہوتا ہے اس کی بنا پر بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے وقت کا اکبر تھا اس فرق کے ساتھ کہ اکبر نے اپنی اصلاحات کے لئے بے دینی کا سہارا لیا، اور شیر شاہ نے اپنے دین دارانہ جذبہ کے ساتھ ہی یہ سب کچھ کر دکھایا، بلاشبہ اس کے کارنامے اس کی نیک نامی کا باعث ہیں[1]

شیر شاہ نے ۱۲ ربیع الاول ۹۵۲ھ مطابق ۱۵۴۵ء میں داعی اجل کو لبیک کہا، اور اس کے بعد اس کا بیٹا سلیم شاہ سوری تخت نشین ہوا۔

سلطان سلیم شاہ سوری

۹۵۲ھ مطابق ۱۵۴۵ء میں سلیم شاہ تخت نشین ہوا، مگر اس کا پورا زمانہ آپسی شورشوں اور ہنگامہ آرائیوں کی نذر ہوگیا، اس کے باوجود تقریباً ۹ رسال تک حکومت پر قائم رہا، اور ۹۶۱ھ مطابق ۱۵۵۲ء میں انتقال کرگیا۔

اس کے بعد سلطان فیروز شاہ سوری تخت نشین ہوا، چند دنوں ہی حکومت کر پایا تھا کہ ۹۶۱ھ میں مقتول ہوا، اس کے بعد سلطان محمد عادل عدلی شاہ کی حکومت قائم ہوئی، یہ بھی ایک سال حکومت کرسکا، پھر ۹۶۲ھ میں سلطان ابراہیم شاہ تخت نشین ہوا، یہ چند ماہ حکومت پر قائم رہ سکا، اس کے بعد سوری خاندان کا آخری فرماں رواں سکندر شاہ سوری ۹۶۲ھ میں تخت نشین ہوا۔

[1] منتخب اللباب ج ۲/ ۱۲۸

سور خاندان کا آخری فرماں رواں سکندر شاہ سوری

سلیم شاہ کے بعد شیر شاہی سلطنت سوری خاندان سے نکل کر سلیم شاہ کے سالے عدلی شاہ کے ہاتھوں میں چلی گئی تھی، لیکن جب سکندر شاہ سوری نے ابراہیم خان کو شکست دے کر آگرہ پر قبضہ کرلیا تو دوبارہ بادشاہت پر سوری خاندان کا قبضہ ہوگیا، اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ سکندر شاہ، سوری خاندان کا آخری تخت نشین بادشاہ ہے۔

سکندر شاہ کی تقریر

سلطان سکندر شاہ سوری نے فتح وغلبہ کے بعد اپنے ہم قوم تمام سوری سرداروں کو جمع کر کے حسب ذیل تقریر کی: ''میرے ہم قوم سردارو! بزرگوں نے کہا ہے'' دولت از اتفاق و بے دولتی از نفاق'' اتحاد و اتفاق ہی سب سے بڑی دولت اور خوش نصیبی ہے، سلطان بہلول لودھی اور شیر شاہ نے اپنے بھائیوں اور ہم قوموں کی مدد سے ہی سلطنتِ دہلی پر بادشاہت اور فرماں روائی کی تھی، اس کے برخلاف سلطان ابراہیم لودھی اور عدلی نے اپنے بزرگوں کے مسلک کے خلاف اپنے بھائیوں سے بدسلوکی کا رویہ اختیار کیا اور منافقت برتی اور یہی بات ان کی بادشاہتوں کے خاتمہ کا باعث بنی۔

اب میں صاف صاف یہ کہتا ہوں کہ میں سلطنت کے قابل نہیں ہوں، تم سے میری درخواست ہے کہ جس کو تم اس کا اہل جانتے ہوں اسے تخت پر بٹھادو، میں اس کا اطاعت گزار رہوں گا، لیکن اچھی طرح یاد رکھو کہ اس نازک وقت میں جبکہ ہمایوں نے ایک لشکرِ جرار لے کر ملک کے ایک حصے میں دوبارہ قبضہ کر لیا ہے، یہاں تک کہ کابل کو فتح کرچکا ہے، اور اپنے بھائیوں کی سرکوبی کر کے بہت جلد ہندوستان میں داخل ہونے والا ہے، ہم پٹھانوں میں یہ لودھیوں اور سوریوں کی نزاع برپا ہے، یہ خاندانی جھگڑے اس ملک سے ہماری سلطنت کا قلع قمع کردیں گے، اور پٹھانوں کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکیں گے، بہرحال یہ وقت لڑنے کا نہیں، بلکہ مل کر غنیم سے مقابلہ کرنے کا ہے۔[1]

اس تقریر پر تمام پٹھان سرداروں اور امیروں نے اتحاد واتفاق قائم رکھنے کی قسمیں کھائیں اور

[1] منتخب اللباب ج ۲ ص ۱۴۴

Scanned by CamScanner

اطاعت وفاداری کے عہد و پیمان کر کے سکندر شاہ کو جو شیر شاہ کا چچازاد بھائی تھا، تخت پر بٹھا دیا، اور اسے نذرانے اور مبارکبادیاں پیش کیں، لیکن ان کی بدبختی ان کے سروں پر مسلط تھی، صرف ایک ہفتہ اتحاد و اتفاق کا مظاہرہ کیا گیا، اس کے بعد جاگیروں، منصبوں اور عہدوں کی تقسیم پر تیز و تند باتیں ہونے لگیں، اور آپس میں دوبارہ پھوٹ پڑ گئی۔

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمایوں مدت سے ان کے انتشار و خلفشار کا منتظر تھا، اب ہندوستان کا میدان اپنے لائق سمجھ کر فتح و ظفر کے پھریرے اڑاتے ہوئے پنجاب میں داخل ہو گیا اور اس پر ۹۶۱ھ میں فاتحانہ قبضہ کر لیا تھا۔

سکندر شاہ کی شکست

سکندر شاہ خود اسی (۸۰) ہزار فوج لے کر ہمایوں کا مقابلہ کرنے کیلئے نکل کھڑا ہوا، اور لاہور کے باہر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا، گھمسان کا رن پڑا، بالآخر سکندر شاہ شکست کھا کر پہاڑوں کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

سلطان ہمایوں کا دوبارہ دہلی میں فاتحانہ داخلہ

دہلی میں ہمایوں کا یہ فاتحانہ داخلہ ماہِ رمضان المبارک ۹۶۲ھ مطابق ۱۵۵۵ء میں ہوا تھا، اس عرصہ میں ملک کا سارا نظم ونسق بگڑ چکا تھا، ہمایوں نے از سر نو سارے انتظامات کرائے۔

ہمایوں کا انتقال

دہلی کے انتظام کے بعد ہمایوں دہلی سے آگرہ جانا چاہتا تھا، لیکن موت دروازے پر دستک دے رہی تھی، ۹۶۳ھ میں ربیع الاول کی ۵ تاریخ تھی کہ مغرب کے وقت ہمایوں[۱] اذان سننے کے لئے کتب

۱ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ ہمایوں کتب خانہ پر چڑھا ہوا تھا، جب سیڑھی سے اترنے لگا اور اذان شروع ہوئی تو ادب میں زینہ پر ہی بیٹھ گیا اور اس کے بعد اترتے وقت پاؤں پھسل گیا اور نیچے گرا۔ ص ۶۷۸ ج ۱

خانہ کی چھت پر چڑھا، سیڑھیوں سے پاؤں پھسل گیا اور لڑھکتا ہوا اوپر سے نیچے آ گیا، اور چند دنوں کے بعد اسی تکلیف میں مغرب کے وقت خانوادۂ بابری کا یہ آفتاب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا، تاریخ وفات "ہمایوں بادشاہ از بام افتاد" نکالی گئی ہے، اور اسے دہلی میں دفن کیا گیا۔

ہمایوں کے اوصاف

کہتے ہیں ہمایوں احکام شرعی، اوامر و نواہی کا بڑا پابند تھا، بے وضو اللہ تعالیٰ کا نام زبان سے نہیں لیتا تھا، یعنی ہمیشہ باوضو رہنے کی کوشش کرتا تھا، صوم وصلوٰۃ، فرائض وسنن اور تلاوتِ کلام پاک کا ہمیشہ اہتمام رکھتا تھا۔

ہمایوں ایک علم دوست بادشاہ تھا، اس کی محفل میں علماء کا اور شاعروں کا مجمع رہتا تھا، علمی مباحثہ میں حصہ لیتا تھا، بڑا مرتبہ شناس تھا، ہر ایک کے ساتھ اس کے مناسب حال سلوک کرتا تھا، خود موزوں طبیعت کا مالک تھا۔[۱]

تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ ہمایوں امام اعظم ابو حنیفہؒ کے مذہب برحق پر قائم تھا، لیکن ہمایوں کو اپنے آباء واجداد خاص طور پر امیر تیمور کی بنسبت اہل بیت سے محبت زیادہ تھی، ہمایوں فطری طور پر بہادر تھا، اور مروت اس کی سرشت میں داخل تھی، علم ریاضی میں بہت دسترس تھی، اس کی مجلس میں علمی تذکرے ہوتے رہتے تھے، بادشاہ کا مذہب حنفی تھا، لیکن کامران اور دوسرے چغتائی امراء ہمایوں کو ہمیشہ شیعہ سمجھتے رہے، ان کی بدگمانی کی وجہ یہ تھی کہ شہزادگی کے عالم سے عراقی اور خراسانی شیعہ بادشاہ کے گرد جمع تھے، بادشاہ ان کی پوری خاطرداری کرتا تھا اور انہیں ارکین سلطنت میں داخل کیا، درحقیقت ہمایوں سُنی المذہب تھا۔[۲]

کوئی تقدیر کی منطق سمجھتا نہیں ورنہ
نہ تھے ترکانِ عثمانی سے کم ترکانِ تیموری

خاندانِ سادات سے لے کر ہمایوں تک کے دور کا تجزیہ[۳]

ہندوستان پر تیمور کا حملہ

تیمور مسلمان تھا اس کے باوجود ہندوستان کی اسلامی حکومت کو اپنی یلغار سے سرنگوں اور تاراج

۱ منتخب اللباب یعنی تاریخ عہد مغلیہ ص ۱۵۸ ۲ ایضاً ۳ خاندان سادات، خاندان لودھی، مغل بابر، ہمایوں، خاندان ...ور، ان کا دور تقریباً ...سو سال ہوتا ہے

کرنے کا فعل بظاہر وحشیانہ حرکت معلوم ہوتی ہے، لیکن بعض مؤرخین نے اس کی مصلحت اور اہمیت کو اجاگر کیا ہے، اور اس کو وقت کی ضرورت بتایا ہے، وہ اس طرح کہ سلاطین تغلق کے بعد ہندوستانی مملکت اندر سے مسلسل کھوکھلی ہوتی جارہی تھی، اور اس میں اتنا دم خم نہیں رہا تھا کہ کسی بیرونی یا اندرونی انقلاب کو سہار سکے، اس کمزوری کو ملک کی ہندو طاقتیں محسوس کر رہی تھیں، اور مختلف علاقوں میں انقلاب برپا کرنے کی اسکیمیں شروع ہو چکی تھیں کہ ایک غیبی صورت یہ پیدا ہوئی کہ تیمور جیسے فاتح نے ہندوستان پر یلغار کر کے اس ملک کو ہندوگردی سے روک دیا، گویا اس رسواکن انجام سے تیمور کے حملہ نے بچا لیا، گھات میں بیٹھی ہندو طاقتیں تیموری یلغار سے ایک مرتبہ اور ترکوں کی ترکتازیوں سے مرعوب ہو گئیں، اب مقابل میں صرف دہلی کے کمزور بادشاہ نہ رہے، بلکہ احمر کے کناروں سے جمنا کے کناروں تک کے وسیع علاقوں کو فتح کرنے والی ایک عظیم الشان شخصیت ابھر کر سامنے آگئی، جس نے ان کی اٹھتی ہوئی گردن کو اٹھنے سے پہلے ہی نیچے جھکا دیا، اس لئے یہ کہنا بجا ہوگا کہ تیمور کا حملہ دراصل مسلمانوں کے خلاف نہیں، بلکہ ہندو اقتدار کے دوسرے جنم کے خلاف تھا، لہٰذا اس کے بعد دہلی کے تخت پر خاندانِ ساداتِ سید خضر خان امیر تیمور کی پشت پناہی سے جانشین ہوا۔

ملک کی سیاسی حالت میں تغیر وتبدل

خاندان تغلق کے بعد سے ہی حکومتِ دہلی کی روز افزوں کمزوری بڑھ رہی تھی کہ تیمور کے حملوں اور خاندانِ سادات کی کمزوری کی وجہ سے دہلی کا رہا سہا اقتدار جاتا رہا، اس کے بعد لودھیوں اور پھر مغل بادشاہ بابر نے دہلی کا اقتدار بڑھانے کی کوشش کی، لیکن ان کے زمانے میں موافق اور مخالف ہر طرح کے اثرات کارفرما تھے، اور واقعہ یہ ہے کہ سلطان غیاث الدین تغلق کی وفات سے لے کر اکبر کی فتوحات تک حکومتِ دہلی کو وہ وسعت اور استحکام نصیب نہیں ہوا جو اسے سلطان علاؤ الدین خلجی اور غیاث الدین تغلق کے عہدِ حکومت میں حاصل تھا، ان دو صدیوں میں ملک کے کئی صوبے خود مختار ہو گئے، بعض میں مسلمان بادشاہوں نے اپنی حکومتیں قائم کر لیں، بعض میں ہندو راجاؤں نے، ایک لحاظ سے تو یہ ملک کے لئے مضر ثابت ہوا، کیونکہ مرکزی حکومت کی کمزوری سے ملک میں بدنظمی پھیل گئی اور منگول حملہ آور جن کا شاہانِ دہلی نے کامیاب مقابلہ کیا تھا تیمور کی زیر قیادت دہلی تک آ گئے، لیکن دہلی کی کمزوری سے ملک کے دوسرے حصوں کو فائدہ بھی پہنچا، غیر محفوظ ذرائع آمد و رفت کی بنا پر شاہانِ دہلی کے لئے ملک کے دور دراز حصوں میں امن قائم رکھنا مشکل تھا، لیکن جب گجرات، دکن، بنگال اور دوسرے صوبے خود مختار ہو گئے تو ان کے حکمرانوں کے لئے محدود علاقوں کا انتظام نسبتاً آسان تھا، چنانچہ اس زمانے میں ان صوبوں نے

بہت ترقی کی، تہذیب وتمدن کو بھی ان حالات سے فائدہ پہنچا، پہلے اسلامی تہذیب ومذہب کا مرکز صرف دہلی تھا، اب احمد آباد، جونپور، گلبرگہ، احمد نگر اور دوسرے شہر بھی اس طرح کے مرکز بن گئے، اور اسلامی تہذیب اور مذہب کی اشاعت زیادہ باقاعدہ اور مؤثر طریقے سے ہونے لگی، نتیجہ یہ ہوا کہ جو بیج مختلف جگہوں پر بوئے گئے تھے انہوں نے جڑ پکڑ لی، اور پورے ہندوستان میں اسلامی تہذیب وتمدن کا وہ درخت نشوونما پانے لگا، جس کے ثمرات آج ہمیں نظر آرہے ہیں۔

اطرافِ ملک میں قائم ہونے والی حکومتوں کے مختصر احوال

گجرات:۔

شاہانِ گجرات میں سب سے پہلے مظفر شاہ[1] نے ۱۴۰۱ء میں خود مختاری کا اعلان کیا اور ۱۵۷۲ء تک جب اکبر نے گجرات دوبارہ فتح کیا اس وقت تک یہ علاقۂ گجرات خود مختار رہا۔

شاہانِ گجرات میں سب سے با اقتدار حاکم سلطان محمود[2] بیگڑہ تھا، جس نے ۱۴۵۹ء سے ۱۵۱۱ء تک بڑی شان وشوکت سے حکومت کی، اس نے احمد آباد کو جسے اس کے دادا احمد شاہ نے آباد کیا تھا بڑی رونق

---

[1] مظفر شاہ سلطان احمد شاہ بانیٔ احمد آبادی کا دادا ہے، اور اسی خانوادہ نے گجرات میں تقریباً ایک سو ستر سال ۸۱۰ھ سے لے کر ۹۸۰ھ تک کامیاب حکومت کی ہے، اس عرصہ میں کل چودہ بادشاہ ہوئے۔

[2] سلطان محمود بیگڑہ: بیگڑہ کی وجہ تسمیہ:۔ گجراتی میں بے کے معنی دو اور گڑھ کے معنی قلعہ کے ہیں، لہٰذا معنی ہوئے دو قلعوں والا، چونکہ جوناگڑھ اور گرنار کے دو قلعے ناقابل تسخیر سمجھے جاتے تھے جو سلطان محمود نے فتح کر لئے تھے، اس لئے اس کا لقب بیگڑہ مشہور ہوا۔ واللہ اعلم۔

سلطان محمود بیگڑہ نہایت عادل، کریم اور خادم اسلام تھا، اس نے مسافروں کے لئے سرائیں اور طلباء کے لئے مدارس اور عام مسلمانوں کے لئے مساجد تعمیر کرائیں، اسلام اور مسلمانوں سے بے پناہ محبت تھی، خصوصاً علماءِ کرام کے ساتھ بے انتہا تعظیم وتکریم سے پیش آتا، پایۂ تخت احمد آباد تھا اس کے باوجود آخری عمر میں (نہروالہ) پٹن تشریف لے گیا، تاکہ علماء، فضلاء کی آخری زیارت وملاقات کا شرف حاصل ہو، پٹن میں جاکر سب علماء فضلاء کو جمع کیا اور گویا ہوا کہ میری زندگی کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے، اس لئے آپ حضرات کی آخری زیارت وملاقات اور دعاؤں کو حاصل کرنے آیا ہوں، حاضرین اس خادم اسلام سلطان کی بات سن کر بے اختیار آب دیدہ ہو گئے۔

جس بادشاہ کو تاحین حیات اسلام اور مسلمانوں کی بے پناہ خیر خواہی کرتے دیکھا ہو، اور بذات خود عہدۂ سلطانی کی پرواہ کئے بغیر علماء کا احترام وتقدس مدنظر رکھتے ہوئے آخری ملاقات کی غرض سے حاضر ہوا ہو یہ حال وقال نرم دل ہونے کے لئے کافی ہے، بہر حال بادشاہ تین روز تک پٹن میں قیام کر کے احمد آباد واپس ہو گیا، اور کچھ عرصہ بیمار رہ کر ۳ر رمضان المبارک ۹۱۷ھ کو اس نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا، گوہر گنجینۂ سلطنت خاک کے سپرد ہوا، ۶۷ سال کی عمر پائی، اور ۵۴ سال حکومت کی۔ (مفہوم از مرآۃ احمدی یعنی آئینۂ گجرات)

دی، اور مصطفیٰ آباد اور محمود آباد وغیرہ کئی نئے شہر آباد کیے، گجرات اور کاٹھیاواڑ میں ابھی تک کئی مضبوط قلعے ایسے تھے جو عرصۂ دراز سے ہندو راجاؤں کے ہاتھ میں چلے آتے تھے، اور مسلم حکمران انہیں نظرانداز کر چکے تھے، سلطان نے انہیں فتح کر کے ملک کا نظم ونسق آسان کیا، ان قلعوں میں سے چاپانیر اور گرنار خاص طور پر مشہور ہیں۔

سلطان محمود بیگڑہ نے دو تین مرتبہ سندھ پر بھی حملہ کیا، ۱۴۷۲ء میں سندھیوں نے مقابلے کی کوشش کی، لیکن گجراتی فوج کی آمد پر صلح کی درخواست کی، سلطان نے یہ دیکھ کر کہ سندھی مسلمان ہونے کے مدعی تھے، ان کی درخواست قبول کی اور ان سندھیوں میں ہندوانہ رسمیں باقی تھیں، اس لئے وہ بہت سے سندھیوں کو جوناگڈھ لایا، تاکہ انہیں اسلام کی صحیح تعلیم دے کر واپس بھیجے، اور وہ اپنے ملک میں جاکر اپنے ہم مذہبوں میں صحیح اسلام پھیلائیں۔

گجرات کے مسلمان بادشاہوں کی یادگاریں اولاً تو وہ شاندار تاریخی عمارتیں ہیں جو احمد آباد اور دوسرے شہروں میں قائم ہوئیں، اور دوسرے انہوں نے صنعت وحرفت کو بے انتہا ترقی دی، مثلاً سنگ تراشی، زردوزی، کارچوبی، صندل اور ہاتھی دانت کی نادر اشیاء، زربفت، کمخواب اور مخمل وغیرہ کی صنعتیں جن کے لئے گجرات شاہاں مغلیہ کے زمانے میں مشہور رہا ہے شاہانِ گجرات کی قدردانی سے شروع ہوئیں، اورنگ زیب عالم گیر گجرات کو "زیب وزینتِ ہندوستاں" کہا کرتا تھا، اور یہاں کے اہلِ صنعت کی بڑی قدر کرتا تھا، اس کے علاوہ گجرات میں اسلامی علوم نے بڑی ترقی کی، کھمبائت، سورت، دیو اور دمن اس زمانے کی بڑی بندرگاہیں تھیں، اس کے راستے لوگ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کو جاتے اور علم وفضل حاصل کرنے کے بعد وطن آکر اس کے چشمے جاری کرتے، فن حدیث کی خدمت دہلی میں شروع ہونے سے پہلے گجرات کی درس گاہوں میں حدیث کی خدمت جاری ہو چکی تھی، اسی زمانے میں شیخ محمد طاہر پٹنی نے فن حدیث میں کتاب "مجمع بحار الانوار" تصنیف فرمائی تھی، جس سے آج تک علماء مستفید ہو رہے ہیں۔

مولانا عبدالحی نے یادِ ایام کے عنوان سے یہاں کے علماء ومشائخ کے حالات لکھے ہیں اور لکھا ہے کہ شاہانِ گجرات کے زمانے میں یہ علاقہ علم وفضل میں دہلی اور آگرہ سے بڑھا ہوا تھا۔[1]

بنگال:۔

بنگال محمد تغلق ہی کے زمانے میں خودمختار ہو گیا تھا اور جب تک شیر شاہ سوری نے ۱۵۳۹ء میں اسے

[1] آب کوثر ص ۴۴۹

دوبارہ فتح نہیں کیا یہ صوبہ خودمختار رہا، بنگال کے خودمختار مسلمان بادشاہوں میں سب سے باقتدار بادشاہ علاؤالدین حسین شاہ تھا، جس نے آسام کا بہت سا حصہ فتح کرلیا، اور شان وشوکت سے حکومت کی، بنگال کے مسلمان بادشاہوں کی ایک قابل ذکر خصوصیت ان کی رواداری تھی، انہوں نے علم وفن کی سرپرستی کی، اور بنگالی ادب کو فروغ دیا۔ جس کی مخالفت سنسکرت کے طرف دار ہندو راجا کرتے تھے، سنسکرت کی کئی کتابیں بنگالی میں ترجمہ کرائیں علاؤالدین حسین شاہ نے بھاگوت گیتا کا اور اس کے بیٹے نصرت شاہ نے مہابھارت کا ترجمہ کرایا۔[1]

بنگالی کی سرپرستی کے ساتھ ساتھ فارسی کو بھی بڑا فروغ تھا اور وہی دفتری اور ادبی زبان تھی۔ بلبن کے بیٹے بغرا خان جس نے سرزمین بنگالہ کی محبت میں تخت دہلی کو ٹھکرا دیا تھا، اس نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح امیر خسرو بنگالہ میں مقیم ہو جائیں، اور اس شہر کو شعر وسخن میں دہلی پر بھی فضیلت حاصل ہو۔

جونپور:۔

بنگال سے مغرب کی طرف جونپور کے شرقی بادشاہوں نے ۱۳۹۴ء میں خودمختار حکومت قائم کی، اور ۱۴۷۶ء تک خودمختار رہے، اس اسی سال کے عرصہ میں جونپور نے بڑی ترقی کی اور علم وفضل کا مرکز بن گیا جس طرح اٹھارویں صدی میں دہلی کے شعراء کی جائے پناہ لکھنؤ تھی اسی طرح چودھویں صدی عیسوی میں جونپور تھا، چنانچہ سلطان ابراہیم شرقی کے زمانے میں جونپور کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ بنگال میں جب راجہ گنیش نے مسلمانوں پر ظلم وتعدی شروع کی تو حضرت نور قطب عالمؒ کے ایماء پر سلطان ابراہیم نے ہی ایک لشکر وہاں بھیجا جس کے ڈر سے راجہ نے اپنی روش بدل دی اور حضرت نور قطب عالمؒ سے مصالحت کرلی۔

سلطان ابراہیم کے دربار کے سب سے زبردست عالم قاضی شہاب الدین دولت آبادی تھے، انہیں قاضی القضاۃ کا عہدہ اور ملک العلماء کا خطاب دیا تھا، قاضی صاحب نے کئی کتابیں بھی لکھی ہیں، مثلاً بدائع البیان، حاشیۂ کافیہ، شرح بزدوی وغیرہ، ان کے علاوہ فتاویٰ ابراہیم شاہی کے نام سے ان کے کئی فتاویٰ جمع ہوئے، قاضی صاحب کی وفات ۱۴۴۵ء میں ہوئی۔[2]

قاضی صاحب کے علاوہ بھی کئی صاحبِ فضل وکمال بزرگ گزرے ہیں، جن کی وجہ سے جونپور اسلامی علوم کا ایک بڑا مرکز بنا رہا۔ شیر شاہ سوری نے (جو کئی لحاظ سے اسلامی ہندوستان کا سب سے بیدار مغز بادشاہ تھا) یہیں تعلیم پائی ہے اور سلطان شاہ جہاں اس شہر کو "شیراز ہند" کہا کرتا تھا۔

[1]، [2] آب کوثر ص ۴۴۹

Scanned by CamScanner

گلبرگہ شریف:-

بیجاپور میں بڑے بڑے صاحب علم اور صاحب ذوق بزرگ پیدا ہوئے ہیں، لیکن اسلامی حکومت کے زمانے میں یہاں فن تعمیر کو جو فروغ ہوا اس نے اس شہر کی دوسری خوبیوں پر پردہ ڈال دیا ہے، اب لوگ یہاں عالی شان عمارتیں دیکھنے جاتے ہیں، مذہبی آثار باقیہ کی طرف بہت کم توجہ ہوتی ہے، مذہبی تقدس میں جس شہر نے عوام میں خاص شہرت حاصل کی ہے وہ گلبرگہ شریف ہے، بزرگان دین کی اس شہر کی طرف شروع ہی سے توجہ تھی، حضرت سید بندہ نواز گیسودرازؒ ہی سے گلبرگہ کی زیادہ شہرت ہوئی، حضرت نصیرالدین چراغ دہلویؒ نے ۷۵۷ھ میں وفات پائی، اس سے تین روز پہلے حضرت گیسودرازؒ کو خلافت عطا کی، آپ اس کے بعد کافی مدت دہلی میں رہے اور ۸۰۱ھ میں حادثۂ امیر تیمور کی بنا پر دہلی سے دکن کی طرف روانہ ہوئے، گوالیار، بڑودہ، کھمبایت ہوتے ہوئے گجرات میں کچھ عرصہ قیام کے بعد دولت آباد تشریف لائے، اس کے بعد گلبرگہ کا رخ کیا، جو اس وقت شاہان بہمنی کا دارالخلافہ تھا، بادشاہ وقت نے بڑی عقیدت سے آپ کا خیر مقدم کیا اور آپ گلبرگہ ہی میں بس گئے، چند سالوں کے بعد ۱۴۲۲ء میں عالمِ فانی سے عالم جاودانی کی طرف انتقال فرمایا، حضرت گیسودراز کو اشاعتِ اسلام سے خوب دلچسپی تھی، آپ کے دست حق پرست پر ہنود کی بڑی تعداد نے اسلام قبول کیا ہے۔

حضرت گیسودرازؒ کا جس طرح تصوف اور عرفان کی منزل میں اونچا درجہ ہے، اسی طرح علم وفضل اور تصنیف وتالیف کی تاریخ میں ان کا نام روشن ہے، شمالی ہندوستان کے مقبول سلسلوں (چشتیہ اور سہروردیہ) کے مشہور بزرگوں میں سب سے پہلے جس ہستی نے تصنیف وتالیف کی طرف پوری توجہ کی وہ حضرت گیسودرازؒ تھے، آپ کی تصانیف کی تعداد آپ کی عمر کے سال کے مطابق ایک سو پانچ بتائی جاتی ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سیر محمدی میں اکتیس کتابوں کے نام گنائے گئے ہیں، جو زیادہ تر تصوف میں ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ علوم اسلامی کا کوئی شعبہ نظر انداز نہیں ہوا ہے، حضرت بندہ نواز کا مرتبہ ان کی علمی تصانیف سے ظاہر ہے، لیکن دکنی عوام میں آپ کی شہرت علمی کارناموں سے نہیں، بلکہ خوارقِ عادات اور روحانی تصرفات کی بنا پر ہے، اور اس میں اتنا غلو کیا جاتا ہے کہ عقل اور شریعت افسوس کرتی ہے، تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ "ایک دکنی شخص جو حضرت گیسودرازؒ کا معتقد تھا اس سے کسی نے پوچھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بزرگ ہیں یا سید محمد گیسودرازؒ؟ اس شخص نے جواب دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ اللہ کے پیغمبر ہیں، لیکن ہمارے سید محمد گیسودراز تو کوئی دوسری چیز ہی ہیں" (جلد اول ص ۳۲۰)

سرکاری گزیٹر میں لکھا ہے کہ حضرت سید محمد گیسودراز نے پونا اور بلگام کے کئی لوگوں کو مسلمان کیا،

ان کے علاوہ اور بھی کئی داعیان اسلام گزرے ہیں، جن کے نام اولیاء کے تذکرہ میں نہیں آئے، لیکن انہوں نے اشاعتِ اسلام کے لئے ٹھوس کام کیا ہے۔

کشمیر:-

کشمیر میں اسلام بڑی دیر سے یعنی چودھویں صدی عیسوی کے آغاز میں داخل ہوا، سوات کے ایک بزرگ شاہ مرزا ۱۳۱۵ء میں کشمیر کے راجہ سنگھ دیو کے ملازم ہوئے، اور اپنی خداداد قابلیت سے بڑا اقتدار حاصل کرلیا، ان کے بیٹوں کو بھی راجا نے بڑے اختیارات دیئے اور خود اُن کو راجہ سنگھ دیو کے ایک جانشین نے اپنا وکیل مطلق مقرر کیا، آخر میں جب ملک کا نظام درہم برہم ہونے لگا تو ۱۳۴۳ء میں شاہ مرزا صاحب شمس الدین شاہ کے نام سے تخت نشین ہوئے اور اپنا سکہ اور خطبہ جاری کیا، کیمبرج ہسٹری میں ان کی نسبت لکھا ہے

"نئے بادشاہ نے اپنے اختیارات سمجھ اور نیک نیتی سے استعمال کئے، کشمیر کے ہندو راجا بڑے ظالم تھے، ان کی علانیہ پالیسی یہ تھی کہ رعیت کے پاس معمولی دال روٹی سے زیادہ کچھ رہنے نہ دیا جائے، نئے بادشاہ کی حکومت لبرل اصولوں پر قائم تھی، اس نے بے جا سرکاری لگان اور غیر منصفانہ ٹیکس ہٹا دیئے، ٹیکس وصول کرنے کے ظالمانہ طریقے موقوف کردیئے، اور سرکاری لگان پیداوار کے چھٹے حصہ پر مقرر کردیا، شاہ مرزا نے کشمیر سے اسلام کے سیاسی تعلقات کی بنیاد ڈالی، بعد میں اسی صدی کے آخر میں امیر کبیر سید ہمدانیؒ" ایران سے کشمیر تشریف لائے، آپ بڑے صاحبِ علم بزرگ گزرے ہیں، اور اسلامی دنیا کی روحانی تاریخ میں آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے، آپ کی ذات میں جلالی اور جمالی شانیں دونوں موجود تھیں اور مذہب سے واقفیت اور روحانی عزومرتبت کے علاوہ منتظمانہ قابلیت بھی آپ میں بدرجۂ اتم تھی، آپ ۷۱۴ھ مطابق ۱۳۱۴ء کو بمقام ہمدان پیدا ہوئے، مدتوں ممالک اسلامی کی سیاحت کی، مشہور ہے کہ آپ نے ایک ہزار چار سو اولیاء اللہ سے ملاقات کی، آپ ایران چھوڑ کر سات سو سیدوں کے ساتھ کشمیر تشریف لائے، بادشاہ وقت بڑی عقیدت سے پیش آیا اور آپ نے اور آپ کے رفقاء نے بڑی سرگرمی سے اشاعتِ اسلام کا کام شروع کیا، کہا جاتا ہے کہ آپ کی کوششوں سے سینتیس ہزار کشمیری دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے اور آپ نے کئی کتابیں بھی لکھی ہیں، آپ کی کوششوں سے اسلام کشمیر میں مستحکم بنیادوں پر قائم ہوگیا، آپ کی وفات ۱۳۸۴ء میں ہوئی، لیکن آپ کی نعش مبارک ترکستان کے شہر ختلان میں لے جاکر دفن کی گئی[1]

[1] آب کوثر ص ۳۷۸

مالوہ:-

گجرات، بنگال، جونپور کے علاوہ چوتھی خودمختار حکومت مالوہ کی تھی، جس کی یادگار مانڈو وشادی آباد کی عظیم الشان عمارتیں ہیں، یہ حکومت بہت وسیع نہ تھی، لیکن یہاں کے بعض حکمرانوں نے علم وادب کی سرپرستی کی اور بعض نئے طریقوں کے بانیوں (مثلاً مہدی جونپوری کی تحریک) اور غیر رائج صوفیانہ سلسلوں کے داعیوں (مثلاً شیخ عبداللہ عطاری) کی ملک کے اس گوشہ میں بڑی آؤ بھگت ہوئی، مالوہ کی حکومت بالآخر بہادر شاہ والئی گجرات کے قبضے میں آگئی۔[1]

ظاہری سلطنت اور باطنی سلطنت کا جوڑ

ہندوستان میں ابتداء ہی سے ظاہری اور باطنی سلطنت ساتھ ساتھ فروغ پاتی رہی، باطنی سلطنت کے بانی خواجہ معین الدین چشتی تھے، اسی زمانہ میں سلطان شہاب الدین غوری نے ظاہری سلطنت کا سلسلہ جاری کیا اور دونوں سلسلے لازم ملزوم کی حیثیت سے کارفرما رہے اور ساتھ ساتھ چلتے رہے، اس کے بعد سلطان غیاث الدین تغلق کی وفات اور محمد تغلق کی تخت نشینی سے جو تغیر وتبدل ملک کی سیاسی حالت میں ہوا اس سے زیادہ انقلاب ملک کی روحانی حالت میں حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاءؒ کی وفات سے ہوا، گویا صوفیہ کا عہد زریں ختم ہو گیا، ان کے جانشین حضرت چراغ دہلویؒ زہد وتقویٰ، انصاف ونیکی اور ٹھوس روحانی خدمات میں اپنے مرشد سے پیچھے نہ تھے، لیکن انہیں یا دہلی کے کسی اور بزرگ کو وہ شاہانہ سطوت اور وقار نصیب نہیں ہوا جو حضرت سلطان المشائخ کے حصے میں ودیعت ہوا تھا، حضرت کا اتنا اثر تھا کہ سلطان علاؤالدین خلجی جیسے جابر بادشاہ ان سے خم کھاتے تھے، اور ان کی خواہشات کا پاس کرتے تھے، بعض بادشاہ اور شہزادے تو ان کے عقیدت مند مرید تھے، یہ سلسلہ ان کی ذات کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔

جس طرح مرکزی حکومت کی کمزوری کا یہ نتیجہ ہوا کہ دہلی اجڑ گئی اور احمد آباد، جونپور اور گلبرگہ آباد ہو گئے، ان سیاسی اثرات کا یہ نتیجہ نکلا کہ مذہب وروحانیت کی شمعیں دہلی میں گل ہو کر ملک کے دوسرے حصوں میں روشن ہوئیں، چنانچہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کے وصال سے حضرت خواجہ باقی باللہ کی آمد تک دہلی غیر معمولی شخصیتوں سے خالی رہی اور ان دو صدیوں میں وہاں ایک بھی بزرگ ایسا نہ ہوا جس سے بنگالہ کے حضرت نور الحق قطب العالم قدس سرہ اور کشمیر کے امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ اور سلہٹ

[1] آب کوثر ص ۳۳۸

(آسام) کے حضرت شاہ جلال مجردؒ اور گلبرگہ کے حضرت گیسو درازؒ اور اوچ کے مخدوم جہانیان جہاں گشتؒ اور جونپور کے سید محمد مہدی کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکے۔

اطراف ملک میں ان ہستیوں کے کارفرما ہونے سے ایسے گراں بہا کام سرانجام پا گئے، جو دہلی کی مجلسوں میں بیٹھ کر نہ ہو سکتے تھے، ہندوستان کے بعض صوبوں مثلاً کشمیر اور آسام میں تو اسلام پہلی مرتبہ اسی زمانہ میں داخل ہوا اور دوسرے صوبوں مثلاً بنگال اور مغربی پنجاب اور سندھ میں اس سے استحکام نصیب ہوا۔

بادشاہ اکبر

اسلامی حکومت کا استحکام

خاندانِ مغلیہ کی بنیاد بابر نے رکھی اور دہلی کی فتح کو چار سال گزرے تھے کہ ۱۵۳۰ء میں بابر کو موت کا پیغام آپہنچا اور دس سال بعد اس کے بیٹے اور جانشین ہمایوں کو شیر شاہ نے ہندوستان سے مار بھگایا، ہمایوں نے پندرہ سال جلاوطنی میں گزارے، لیکن عمر کے بالکل آخری سال میں شاہ ایران کی مدد سے اُسے موقع ملا کہ شیر شاہ کے پوتے سکندر سوری کو شکست دے کر دہلی اور آگرہ پر پھر سے مغل پرچم لہرایا۔

ہمایوں کو ہندوستان میں دوبارہ آئے ہوئے چند مہینے گزرے تھے اور خاندانِ سور اور مغلوں میں کشمکش ابھی جاری تھی کہ بادشاہ ایک اتفاقی حادثے کا شکار ہو گیا، مغلیہ حکومت کا استحکام بلکہ اس کے اصل آغاز کا بارِ گراں اس کے چودہ سالہ بیٹے اکبر کے کندھوں پر آپڑا۔

اکبر ۱۵۵۶ء میں تخت نشین ہوا اور اس کی تخت نشینی سے اسلامی ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ایک بالکل نئے دور کا آغاز ہوتا ہے، اکبر سے پہلے ایک اسلامی حکمران خاندان کو نصف صدی سے زیادہ حکومت نصیب نہ ہوئی۔

اکبر کے زمانے میں اسلام کی کمزوری کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس سے پہلی دو صدیوں میں دہلی کی حکومت بجائے ترقی کے تنزل کر رہی تھی اور ہندو مذہب کا سیاسی اور روحانی احیاء ہو رہا تھا، روحانی احیاء نے بھگتی تحریک کی صورت اختیار کی، جس کے بعض رہنما مثلاً گورونانک صلح کے حامی تھے اور بعض (مثلاً تلسی داس) دوسرے مذاہب سے بے تعلق تھے، اور بعض (مثلاً چیتیہ کے جانشین) مسلمانوں کے مخالف تھے۔ (رود کوثر، صفحہ ۷۸)

فتوحات اکبری

انتظام حکومت کے ضمن میں سب سے پہلے اکبر نے یہ کیا کہ ملک میں جو صوبے خود مختار ہو گئے تھے اور مدت مدید سے آزاد تھے۔ انہیں پھر حکومت دہلی کے تابع کیا، ۱۵۵۶ء میں اکبر تخت نشین ہوا، اور ۱۵۶۱ء میں مالوہ فتح ہوا، ۱۵۶۴ء میں گونڈوانہ مغلیہ سلطنت میں شامل ہوا، اس سے دو سال پہلے اکبر نے امبر (جے پور) کے راجا بہاری مل سے مصالحت کر لی تھی، راجا نے اکبر کی اطاعت قبول کی اور اپنے خاندان کی ایک کنواری بادشاہ سے بیاہ دی، راجا بہاری مل کے بیٹے راجا بھگوان داس اور پوتے مان سنگھ کو اعلیٰ منصب ملے۔

میواڑ کے راجا نے اس کی مخالفت کی، چنانچہ ۱۵۶۸ء میں چتوڑ اکبر کے ہاتھوں فتح ہوا، اگلے سال کالنجر اور رنتھمبور کے مشہور قلعے مغلوں کے قبضے میں آئے، ۱۵۷۰ء میں جیسلمیر اور بیکانیر کے راجاؤں نے اطاعت قبول کی، ۱۵۷۲ء میں گجرات فتح ہوا اور ۱۵۷۵ء میں ٹکرائی کی جنگ کے بعد بنگال پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا، اگرچہ جولائی ۱۵۷۶ء تک داؤد خان حاکم بنگالہ لڑتا رہا، اور اس کے بعد بھی بنگالہ میں امن و امان دیر تک قائم نہ ہوا۔

یہ فتوحات اکبری کا پہلا دور تھا، دوسرا دور اس زمانے سے متعلق ہے، جب ۱۵۸۵ء سے ۱۵۹۸ء تک اکبر لاہور میں مقیم رہا، اس دوران میں کشمیر جو کبھی بھی حکومت دہلی کے تابع نہ تھا۔ (۱۵۸۶ء میں) فتح ہوا، ۱۵۹۱ء میں سندھ اور ۱۵۹۲ء میں اڑیسہ مقبوضات اکبری میں شامل ہوئے، ۱۵۹۵ء میں بلوچستان فتح ہوا اور قندھار اکبر کے قبضے میں آیا، اب اکبر کو دکن کی طرف توجہ کرنے کی فرصت ملی، ۶ نومبر ۱۵۹۸ء کو اس نے لاہور کو خیر باد کہا اور چند مہینے آگرہ میں قیام کے بعد اگلے سال دکن جا پہنچا، چنانچہ اسی سال احمد نگر کا قلعہ فتح ہوا، اور ایک وسیع مملکت اکبر کے قبضے میں آئی ۱۶۰۱ء میں خاندیش کا مضبوط قلعہ اسیر گڑھ سر ہوا اور احمد نگر اور خاندیش کے علاقے ایک وسیع مغل صوبہ میں منتقل ہو گئے۔ اکبر مئی ۱۶۰۱ء میں آگرہ واپس آیا، اور چار سال بعد اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔[1]

۱؎ رود کوثر ص ۸۰

مغلیہ نظام حکومت

اکبری مسلسل فتوحات اسے تاریخ میں ایک خاص درجہ دیتی ہیں، لیکن ملک گیری آسان، ملک رانی مشکل، اکبر کا اس سے بھی اہم کام اس وسیع سلطنت کا کامیاب نظم و نسق اور ملکی حکومت کے لئے نظام مرتب کرنا تھا جو معمولی تبدیلیوں کے ساتھ تمام مغلیہ دور میں برقرار رہا اور ملکی امور میں برطانوی نظام حکومت کی بنیاد بنا جس پر بھارت اور پاکستان اب بھی عمل پیرا ہیں، مغلیہ نظام حکومت کا معمار اکبر تھا، عالمگیر نے اس کے نظام سلطنت میں بعض تبدیلیاں کیں، اکبر کی مسلسل فتوحات اور اس کے کامیاب نظم و نسق کا راز سب سے زیادہ ان امراء و اراکین سلطنت کی قابلیت، فرض شناسی اور وفاداری میں پنہاں ہے جو اکبر نے اپنے گرد جمع کر لیے تھے، ان کی "ترتیب" اور اس کی قدر شناسی اور دل جوئی کی جو مسلسل کوششیں عہد اکبری میں ہوتی رہیں اس پر ابوالفضل کی تحریریں گواہ ہیں۔[1]

مغلیہ حکومت کی کامیابی، دور دراز صوبوں پر مرکزی حکومت کی مسلسل گرفت اور بغاوتوں کے فقدان کی وجہ یہ تھی کہ اکبر نے تمام اعلیٰ اسامیوں کے لئے ایک منصب داری نظام قائم کر دیا، جس کے اراکین ملک کے تمام اہم منصبوں پر فائز ہوتے تھے، اچھی کارکردگی پر ان کی ترقی کے امکانات تھے اور وہ ایک علاقہ سے دوسرے علاقے میں تبدیل ہوتے رہتے تھے، وہ مرکزی حکومت کے ملازم تھے اور ان کے انتخاب اور ان کی تربیت پر بڑی توجہ ہوتی۔[2]

اکبر کا تیسرا اہم کارنامہ معاملۂ زمین کا بندوبست تھا جو اب بھی معمولی ترمیمات کے ساتھ ملک میں رائج ہے، ایک زراعتی ملک میں اس مسئلہ کی اہمیت ظاہر ہے، اور اس کے بہترین حل کے لئے اکبر نے جس طرح سب سے تجربہ کار (مثلاً ٹوڈرمل) اور سمجھ دار (مثلاً امیر فتح اللہ شیرازی) عہدہ داروں سے کام لیا اور جو مختلف تجربے کئے ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اہم امور میں کتنی عرق ریزی سے کام لیا جاتا تھا۔

اکبر نے بہت سی غلطیاں بھی کیں، بالخصوص مذہبی معاملات میں ایک زمانے میں اس نے ایسی خود سری اور ناعاقبت اندیشی کی پالیسی اختیار کی کہ اب اس کی خوبیاں بھی نظر سے اوجھل ہیں، لیکن اگر صرف انتظامی امور کا بغور مطالعہ کریں تو خیال ہوتا ہے کہ عام طور پر انصاف، رضا جوئی حق اور خبر گیری خلق کی خواہش غالب تھی، یہی مطمح نظر عام طور پر مغلیہ حکمرانوں کا تھا، بلاشبہ بسا اوقات نیک ارادوں اور کاموں

۱؎ ۲؎ رود کوثر ص ۷۸

Scanned by CamScanner

میں تفاوت رہتا ہے، اور مطلق العنان طرزِ حکومت میں ظلم اور بے انصافی کی بڑی گنجائش ہوتی ہے، لیکن کم از کم عدل اور رضا جوئی حق کا مقصد حکمرانوں کے سامنے تھا اور اس سے نظامِ حکومت میں ایک اعتدال اور توازن آگیا۔ جس کی وجہ سے مغلیہ حکومت پائیدار ہوئی، اور اختتام کے بعد بھی لوگوں کے دلوں میں اس کی یاد محفوظ رہی۔

علوم وفنون کی سرپرستی

توسیع مملکت اور مدبرانہ نظم ونسق کے علاوہ اکبر نے اپنے جانشینوں کے لئے علوم وفنون کی وسیع پیمانے پر سرپرستی کی، وہ روایات قائم کیں، جنہوں نے مغلیہ تہذیب وتمدن کو آب وتاب بخشی، مغلوں سے پہلے بھی تختِ دہلی پر بڑے عظیم الشان بادشاہ ہوئے، لیکن شعروادب وفن کی باقاعدہ سرپرستی کی روایات قائم نہ ہوئیں، امیر خسرو جیسے شاعر سے سلطان علاؤالدین خلجی نے جو کم توجہی برتی، وہ خود ایک عبرت ناک حقیقت ہے۔ ملک الشعراء کا عہدہ پہلی مرتبہ اکبر کے زمانے میں قائم ہوا، درباری مؤرخ کا آغاز بھی اسی زمانے میں ہوا، مصوری اور موسیقی کی وسیع پیمانے پر سرپرستی کی گئی، اکبر خود ان پڑھ تھا، لیکن اہل علم کی قدر کرتا اور مشہور کتابیں باقاعدگی سے پڑھوا کر سنتا، حتیٰ کہ اس نے اپنی ناخواندگی کی بڑی حد تک تلافی کرلی اور اس کے دربار میں تصنیف وترجمہ کا ایسا سلسلہ شروع ہوا گیا کہ دارالخلافہ میں ایک طرح کی ایک اکاڈیمی قائم ہوگئی، جس میں ملک کے برگزیدہ اہلِ قلم تصنیف وتالیف میں مشغول تھے، جنہوں نے ادبی معیار کو بہت بلند کیا، ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں ان کتابوں کی طویل فہرست دی ہے جو اکبر پڑھوا کر سنتا تھا، اس میں اخلاق، تاریخ، تصوف اور ادب کی اکثر مشہور کتابیں ہیں مثلاً اخلاق ناصری، کیمیائے سعادت، گلستاں، بوستاں، قابوس نامہ، شاہ نامہ، مثنوی مولانا روم، شیخ شرف الدین منیری کے مکتوبات، ملا جامی اور امیر خسرو کی تصنیفات وغیرہ، بلکہ ابوالفضل تو کہتا ہے کہ مشہور کتابوں میں شاید ہی کوئی ہوگی جو اکبر کے سامنے نہ پڑھی گئی ہو۔[1]

اکبر نے صرف علوم وفنون کی سرپرستی نہیں کی، بلکہ صنعت وحرفت کو ترقی دینے کی بھی پوری کوشش کی، ایران، کشمیر اور دوسرے ممالک کے کاریگروں کو لاہور، آگرہ اور احمد آباد میں جمع کیا تاکہ وہ شال بافی، قالین کاری اور ملبوسات کے کارخانے قائم کریں، اور عہدہ داروں کو مجبور کیا کہ وہ یہاں کی بنی ہوئی چیزیں پہنیں، نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی صنعتیں رائج ہوگئیں جو اکبر کے بعد بھی جاری رہیں۔

[1] رود کوثر ص ۸۴

طریقِ صلح کل

اکبر اپنے خاص دائرۂ عمل یعنی ملک گیری اور ملک رانی میں بے نظیر تھا، اور اسلامی حکومت کو جس طرح اس نے مستحکم کیا، کسی اور ہندوستانی بادشاہ سے نہیں ہوا، لیکن افسوس کہ اس نے اپنے صحیح دائرۂ عمل کو چھوڑ کر مذہبی معاملات میں بھی دخل دیا، اور خوشامدی درباریوں کی واہ واہ میں بعض ایسی بوالعجبیوں کا مرتکب بھی ہوا کہ آج اس کے سیاسی احسانات بھی فراموش ہوگئے ہیں، اکبر کی مذہبی بوالعجبیوں کو کوئی واقف کار پسند نہیں کرے گا، لیکن چونکہ جن منزلوں سے گزر کر اور جن وجوہات کی بنا پر اکبر نے مذہبی معاملات میں دخل اندازی کی ان کا مطالعہ بڑا عبرت ناک اور سبق آموز ہے۔

اکبر کے جن اقدامات نے مسلمانوں کو زیادہ دکھ پہنچایا اور جن کی بجا طور پر سخت مخالفت ہوئی، وہ اس کے کوئی پندرہ بیس سال بعد عمل میں آنے والے قواعد واحکام تھے جن کو ''دینِ الٰہی'' کا نام دیا جاتا ہے، ان کی بنیاد عبادت خانہ کی تلخ اور شرانگیز بحثوں میں رکھی گئی ان کا نتیجہ ۱۵۷۹ء کا محضر تھا، جس کے مطابق بعض حالات میں بادشاہ کو اختلافی مسائل کے فیصلے کا اختیار دیا گیا، خوشامدیوں نے کہنا شروع کیا کہ پرانی پیشین گوئیوں کے مطابق اختلافوں کے مٹانے کا وقت آگیا ہے، دکن میں ایک بادشاہ نے ''جگت گرو'' کا لقب اختیار کیا، اکبر نے بھی زیادہ سے زیادہ اختیارات رکھے اور مریدوں کا سلسلہ شروع کیا، جن کے آئین وطریقے مختلف مذہبوں سے جمع کئے گئے تھے، اور جنہیں بعد کے بعض مؤرخین نے ''دینِ الٰہی'' کا نام دیا، ایک مسلمان سے جن کی جہاں گیر اتنی تعریف کرتا ہے، کوئی تعلق نہ تھا، اور فی الحقیقت ایک حاکم کا ایک خاص سلسلہ کے ساتھ اپنے آپ کو منسلک کرنا اور اُسے ایک خاص درجہ دینا طریقِ صلحِ کل کی خلاف ورزی ہے۔[1]

اکبر کی ابتدائی مذہبی حالت

اکبر ۱۵۴۲ء میں پیدا ہوا اور تیرہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، اس کے بعد اٹھارہ بیس برس تک اس کا یہ حال تھا کہ جس طرح سیدھے سادے، خوش اعتقاد اور پابند مذہب ترک عمل کرتے ہیں اسی طرح ارکانِ مذہب کی وہ بھی دل وجان سے بجا آوری کرتا، اس نے باپ کے صحرا نوردی کے زمانے میں دنیا کا سرد گرم چکھا تھا اور طبیعت میں سوز وگداز اور روحانی رنگ پیدا ہوگیا تھا، جب بارہ برس کی

[1] رود کوثر ص ۸۴

Scanned by CamScanner

مایوسی اور سرگردانی کے بعد پھر تاج و تخت نصیب ہوا تو گردن غرور خود بخود رب کارساز کے سامنے سجدہ شکر میں جھک جاتی، شاہان سور نے علماء کو بڑا زور و اقتدار دے رکھا تھا، اس میں ملکی مصلحتیں بھی تھیں اور طبیعت کا لگاؤ بھی، اکبر نے یہ سلسلہ اور وسیع کر دیا، جا بجا قاضی و مفتی مقرر کرکے، مخدوم الملک شیخ الاسلام کی قدر و منزلت بڑھا دی اور صدر الصدور کو وہ اختیارات دیئے کہ اُسے کبھی نہ ملے تھے، مخدوم الملک تو امور ملکی میں اس کے مشیر اور رکن سلطنت تھے، صدر الصدور شیخ عبدالنبی کے بھی وہ دل و جان سے معتقد تھے، کبھی کبھی حدیث سننے ان کے گھر جاتا، ایک دفعہ جوتے اٹھا کر ان کے سامنے رکھے، شہزادہ سلیم کو ان کی شاگردی میں داخل کیا تاکہ جامی کی چہل حدیث ان سے پڑھے، صدر الصدور شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے پوتے تھے اور تقویٰ و پرہیزگاری میں فرد تھے، ان کی تلقین و تعلیم اور فیض صحبت سے یہ حال ہوا کہ نماز باجماعت کی پابندی تو ایک طرف، خود اذان دیتا، امامت کرتا اور مسجد میں جھاڑو دیتا۔

اکبر کا جو اپنا رنگ طبیعت تھا وہ خانگی اثرات سے اور گہرا ہو گیا، ایک دفعہ اس کا عالم شباب تھا جشن سالگرہ کی تقریب پر لباس زعفرانی پہن کر محل سرائے سے باہر آیا، صدر الصدور شیخ عبدالنبی نے (جنہیں بعد میں شہادت نصیب ہوئی) سر دربار ٹوکا اور اس شدت کے ساتھ کہ عصا کا سرا بادشاہ کو جا لگا، اکبر چپ ہو رہا، لیکن اندر جا کر ماں سے شکایت کی، ماں نے کہا بیٹا یہ رنج کا مقام نہیں باعث نجات ہے، کتابوں میں لکھا جائے گا کہ ایک بوڑھے عالم نے اتنے بڑے بادشاہ کو عصا مارا اور وہ فقط شرع کے ادب سے صبر کرکے برداشت کر گیا۔[۱]

عبادت خانہ

اکبر شیخ سلیم چشتی" کا بڑا معتقد تھا اور جب جہانگیر پیدا ہونے والا تھا تو حصول برکت کے لئے اس کی والدہ کو شیخ کے مستورات والے حجرے میں بھیج دیا اور انہی کی نسبت سے بیٹے کا نام سلیم رکھا، اس کے دو برس بعد اکبر نے فیصلہ کیا کہ جو جگہ اتنی روحانی برکتوں کا سرچشمہ ہے، وہاں ایک عظیم الشان شہر تعمیر ہونا چاہیے، چنانچہ ۱۵۷۱ء میں فتح پور سیکری کی شاندار عمارتیں بننی شروع ہوئیں اور یہ معمولی گاؤں شہنشاہ ہند کا پایہ تخت ہو گیا۔

یہاں اکبر ایک پرانے حجرے میں اکثر اپنا وقت مراقبوں، دعاؤں اور عبادتوں میں گزارتا، مذہبی امور میں بادشاہ کی دلچسپی اتنی بڑھی کہ ۱۵۷۸ء میں اس نے شیخ چشتی کی نئی خانقاہ کے پاس عظیم

۱۔ [illegible] ص ۸۲

الشان عمارت تعمیر کرائی جس کا نام "عبادت خانہ" رکھا گیا، ہر جمعہ کی نماز کے بعد شیخ کی خانقاہ سے آ کر یہاں دربار خاص منعقد ہوتا تھا، جس میں مشائخ وقت، علماء، فضلاء اور چند مقرب مصاحب شریک ہوتے تھے اور خداشناسی اور حق پرستی کی حکایتیں اور روایتیں بیان ہوتی تھیں۔ ([illegible] ص ۸۲)

اکبر کا مذہبی ذوق کیوں بدلا؟

اکبر نے عبادت خانے کی مجالس کا اہتمام خاص مذہبی ذوق سے کیا تھا، لیکن بادشاہ کی نیت نے اسے بد مذہبی کا راستہ دکھایا اور اس کا باعث ان علماء و فضلاء کی کمزوریاں تھیں جو ان مجلسوں میں شریک ہوتے تھے، پہلی ہی نشست میں جھگڑے شروع ہو گئے کہ فلاں آدمی صف میں مجھ سے اوپر کیوں بیٹھے اور میں اس سے پیچھے کیوں رہوں، جب یہ قضیہ طے ہوا تو ہر شخص چاہتا تھا کہ اپنی فضیلت اور دوسرے کی جہالت دکھاؤں، بات بات پر جھگڑا ہوتا تھا، جس سے بادشاہ کا دل کھٹا ہو گیا اور اس نے کہا جو کوئی نامعقول بات کرے اسے محفل سے اٹھا دیا جائے، ملا بدایونی کو اس کام پر مامور کیا گیا، اس وقت آصف خان پاس کھڑا تھا ملا صاحب نے چپکے سے اس کے کان میں کہا کہ اگر یہی بات ہے تو بہت سوں کو اٹھانا پڑے گا، بادشاہ نے سنا تو بہت خوش ہوئے اور دوسروں کو بدایونی کے الفاظ سنائے۔

اگر معاملہ ذاتی فضیلت جتانے اور ایک دوسرے کی تکفیر و تضلیل تک رہتا تب بھی شاید اکبر اسلام سے بدظن نہ ہوتا، لیکن علماء نے اہم مسائل پر اس طرح اختلاف کیا کہ بادشاہ حیران رہ گیا، ایک عالم ایک چیز کو حرام کہتا تھا، دوسرا اس کے حلال ہونے کا فتویٰ دیتا تھا۔ بادشاہ نہ صرف دونوں سے بدظن ہو گیا، بلکہ حرام اور حلال کی تعیین ہی اس کے دماغ میں نہ رہی، اس منزل میں پہلا قدم ملا عبدالقادر بدایونی نے دکھایا اور وہ بھی ایک نازک ذاتی مسئلہ پر، تفصیل اس کی یہ ہے کہ بادشاہ کی چار سے زیادہ بیویاں تھیں، عبادت خانہ کے مباحثوں میں تعدد ازدواج پر گفتگو ہوئی تو بادشاہ کو بھی خیال ہوا کہ کسی حرم کو رخصت کئے بغیر کسی طرح شرع کی پابندی ہو جائے، ہر ایک نے حد کا راستہ دکھایا، دوسروں نے اس کی حنفی فقہ کی رو سے مخالفت کی، اس پر بدایونی نے کہا کہ اگر مالکی قاضی اس کے حق میں اپنے اصول کی رو سے فتویٰ دے دے تو ایک حنفی کے لئے بھی حد جائز ہے۔ بادشاہ کو اور کیا چاہئے تھا، دربار سے حنفی قاضی

Scanned by CamScanner

کو رخصت کیا اور اس کی جگہ مالکی قاضی حسین عرب مکی کی تعیناتی ہوئی، جس نے فوراً حسب طلب فتویٰ دے دیا[1]

علماء کا اقتدار کم کرنے کی وجہ

بدایونی نے عہد اکبری کے جو حالات لکھے ہیں ان سے خیال ہوتا ہے کہ اکبر نے علماء کا اقتدار ان کی کج بحثوں اور حماقتوں کی وجہ سے کم کیا، مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی تذکرہ میں خرابیوں کا باعث مخدوم الملک اور صدر الصدور کی شخصی کوتاہیوں کو قرار دیا ہے، حضرت مجدد الف ثانی ؒ نے "علماء سوء" کی وضاحت نہیں کی، لیکن اس معاملہ میں مولانا محمد ناظم ندوی کی رائے ہمیں زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے جنہوں نے "تعلیمات مجددیہ" کے پیش لفظ میں علماء سوء سے مبارک ناگوری کے دونوں ذہین و طباع بیٹے ابوالفضل فیضی اور تاج الدین دہلوی مراد لئے ہیں، شاید اُن کے علاوہ قاضی خان بدخشی کی طرف بھی اشارہ ہو جنہوں نے بادشاہ کے لئے سجدۂ تحیہ جائز قرار دیا۔

علماء اور اکبر کے درمیان جو اصل وجہ مخاصمت تھی اسے خود اکبر نے عبداللہ خان ازبک کے نام ایک خط میں واضح کر دیا ہے، اور عقل و براہین کی اہمیت بتاتے ہوئے علماء دربار کی شکایت کی ہے" کہ فرمانروائی اور کارگزاری میں بادشاہ کے ساتھ شرکت چاہتے ہیں۔"

اکبر اور علما کی کش مکش فی الواقع۔ کلیسا یا ارباب شرع اور حکومت کی کش مکش تھی جس میں حکومت کا پلہ بھاری رہا، بدقسمتی سے اکبر کی اپنی مذہبی طبیعت کی وجہ سے یہ کش مکش دنیوی امور تک محدود نہ رہی، بلکہ مذہبی امور و عقائد پر بھی اس کا اثر ہوا، لیکن اس کی تہہ میں دنیوی اقتدار کا سوال تھا اور اکبر اور علماء دربار کے درمیان اصلی وجہ مخاصمت یہ تھی کہ بادشاہ مختار کل ہے یا علماء کے فتووں کے تابع، مخدوم الملک اور صدر الصدور کے نقائص ضمنی اور ثانوی چیزیں تھیں۔

اکبر کے آخری ایام

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی لکھتے ہیں کہ "اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ۱۵۹۵ء کے بعد اکبر کی مذہبی بوالعجبیاں ٹھنڈی پڑ گئیں "مریدی کا سلسلہ غالباً" آخر تک جاری رہا لیکن اب اس میں بادشاہ سے

[1] رود کوثر ص ۸۴

وفاداری اور عقیدت کا اظہار زیادہ تھا، مذہبی عقائد اور طریقوں کا کم، پروفیسر چودھری کا جنہوں نے "دین الٰہی" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے خیال یہ ہے کہ ۱۵۹۷ء میں جب قلعۂ لاہور میں نوروز کا جشن منایا جا رہا تھا، آسمان سے آگ برسی (بجلی پڑی) جس سے شاہی سائبان اور بہت سا ساز و سامان بھی جل گیا اور بڑا نقصان ہوا، اس صاعقۂ آسمانی کو بادشاہ کی خود پسندی، اور غلط روی کی سزا سمجھا گیا، بادشاہ پر بھی اس کا بڑا اثر ہوا، اور اس کی انانیت اور مطلق العنانی میں کمی آ گئی۔

اکبر کی وفات اور جہاں گیر کی تخت نشینی

جہاں گیر کی چھوٹی تزک میں لکھا ہے کہ اکبر نے مرتے وقت کلمۂ شہادت دہرایا، سورۂ یٰسین پڑھوا کر سنی اور بطور ایک راسخ العقیدہ مسلمان کے مرا۔ سفیر انگلستان سر طامس راؤ بھی جو اس واقعہ کے پندرہ بیس سال بعد ہندوستان آیا اور جس نے مقامی حالات کے مطابق ایک تفصیلی خط انگلستان کے لاٹ پادری کو لشکرِ شاہی سے لکھا، اس کا خیال ہے کہ اکبر کی وفات بطور ایک مسلمان کے ہوئی، اسی طرح جب پرتگیزی پادری بوٹیلو سے بیجاپور کے عادل شاہی بادشاہ نے پوچھا کہ اکبر کس مذہب پر فوت ہوا تو پادری صاحب نے بڑے افسوس سے کہا کہ میری تو خدا سے التجا تھی کہ ایسا نہ ہوتا، لیکن اکبر ہمیں غلط امیدیں دلاتا رہا اور بالآخر آپ کے دین محمدی پر ہی مرا، اس وقت اسلام کے لئے اکبر کے عقائد سے بھی زیادہ اہم مسئلہ اس کے جانشین کے مذہب کا تھا، اکبر کا جانشین جہاں گیر ہوا، اور اس نے عہد اکبری کے بیشتر قوانین جو شرع اسلام کے خلاف تھے موقوف کر دیئے، اکبر کی زندگی کے آخری ایام میں کوشش ہو رہی تھی کہ جہاں گیر کے بجائے اس کا بیٹا خسرو اکبر کا جانشین ہو، خسرو کی بیوی خان اعظم کی بیٹی تھی اور راجا مان سنگھ کا بھی قرابت دار تھا، ان دونوں نے اس کے حق میں کوشش کی، لیکن شیخ فرید بخاری نے جنہیں بعد میں نواب مرتضیٰ خان کا خطاب ملا اور دوسرے مسلمان امراء نے اس موقع پر بڑی قابلیت دکھائی، انہوں نے نہ صرف جہاں گیر کی تخت نشینی کا انتظام کیا، بلکہ نئے بادشاہ سے اس بات کا وعدہ بھی لیا کہ وہ قوانین اسلام کا احترام کرے گا[1]

جہانگیر نے بالعموم شرع اسلامی کی پاسداری کے وعدہ کا ایفاء کیا اور اگر اکبر کی بوالعجبیوں کا کوئی اثر باقی تھا تو وہ عہد جہانگیری میں ناپید ہو گیا۔

[1] رود کوثر ص ۸۴

Scanned by CamScanner

عہد اکبری میں علم و فن

اکبر کے دربار کے مذہبی قضیوں کا ذکر ہم نے کسی قدر تفصیل سے کر دیا ہے، لیکن دربار میں جو مطلق العنانی اور بے قاعدگی شروع ہوئی تھی ملک پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا، عام ملک میں اسلامی اعتقادات برقرار رہے، بلکہ علوم اسلامی کی وسیع اشاعت کا آغاز اسی زمانے سے ہوتا ہے، اس وقت جونپور، دہلی، لاہور، سیالکوٹ، احمد آباد اور دوسرے مرکزوں میں علوم اسلامی کی اشاعت بڑی باقاعدگی سے ہو رہی تھی، اور قابل علماء کی کمی نہ تھی، ظاہر ہے کہ دوسری ممتاز ہستیوں سے قطع نظر جس زمانے میں باقی باللہ، حضرت مجدد الف ثانی" اور شیخ عبدالحق محدث ہندوستان کی سرزمین کو اپنے چشمۂ فیض سے سیراب کریں اُسے روحانی قحط کا زمانہ نہیں کہا جا سکتا ہے۔

دہلی اور گجرات کے سیاسی تعلقات عہد اکبری میں پھر استوار ہوئے، گجرات اس زمانے میں اسلامی علوم کا بڑا مرکز تھا، ایک تو ساحلی علاقہ ہونے کی وجہ سے جو لوگ عرب سے آتے وہ پہلے یہیں قیام کرتے، اور یہاں کے لوگوں کو عرب جانے میں آسانی تھی، دوسرے شاہان گجرات نے علوم و فنون کی سرپرستی کر کے انہیں بہت فروغ دیا، چنانچہ یہ کہنا صحیح ہے کہ عہد اکبری سے پہلے سو سال تک گجرات کو علم و فضل میں دہلی پر فوقیت تھی، لیکن جب اکبر نے گجرات فتح کر لیا اور دہلی کے گورنر وہاں جانے لگے اور وہاں کے لوگوں کو دہلی آنا پڑا، گجرات کے علماء دہلی پہنچنے شروع ہوئے، اور گجرات کی بندرگاہوں کے راستے عام ہندوستانی طلبہ کو بھی مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ جا کر حصول علم کا موقع ملا۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کی مذہبی خدمات

عبادت خانہ کی تلخ اور ناعاقبت اندیشانہ بحثوں نے جو ناگوار صورت اختیار کی اور درباری خوشامدیوں اور علماءِ سو کی جدت طرازیوں نے جو انتشار پیدا کر دیا اُسے روکنے کے لئے متعدد مسلمان امراء و علماء نے کوشش کی، اور بعضوں نے بڑی قربانیاں دیں، اس کے کامیاب سد باب میں جن محبان اسلام نے اواخر عہد اکبری میں حصہ لیا ان میں مرکزی حیثیت حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کی تھی جن کے دست راست دو شخص تھے، امراء میں سے شیخ فرید اور اہل باطن میں سے شیخ احمد سرہندیؒ، مؤخر الذکر کا مرتبہ بہرکیف بلند ہے، لیکن معاملہ صرف اُن خرابیوں کا نہ تھا جو عبادت خانہ اور دربار شاہی کی بحثوں سے پیدا ہوئیں تھیں، اطراف ملک میں جن حقیقی مشکلوں سے مسلمان دوچار تھے وہ ہندو مت کی جارحانہ احیائیت کی پیدا کردہ تھیں، ان کا تو دارالخلافہ میں پورا احساس ہی نہ تھا، ان کی طرف حضرت مجددؒ نے

توجہ دلائی، امراء و ارکین سلطنت کو ان کے فرائض یاد دلائے اور شعائر اسلام کی [illegible] سربلندی پر زور دیا، لیکن حضرت مجدد کی کوششیں صرف مسلمانوں کے [illegible] امراء کے خیالات کی اصلاح تک محدود نہ تھیں، انہوں نے عامۃ المسلمین [illegible] خیالات کی بھی اصلاح کی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ عہد اکبری کی مذہبی [illegible] رد عمل ہوا اور شرع و دین نے بتدریج دوبارہ فروغ حاصل کیا، اس سے حضرت مجدد کی [illegible] سے بڑی تقویت ملی۔[1]

حضرت مجدد کی ایک اہم اسلامی خدمت یہ ہے کہ آپ نے اس سلسلۂ تصوف کی اشاعت کی جو ہندوستانی طریقوں میں شریعت سے قریب ترین ہے، ہندوستان میں شروع ہی سے اسلام پر تصوف کا رنگ اس قدر چڑھا ہوا ہے کہ بیسوی صدی کے شروع تک کسی کو یہ خیال بھی نہ ہوتا تھا کہ کسی صوفیانہ سلسلہ میں داخل ہوئے بغیر انسان اسلام کی برکات سے مستفید ہو سکتا ہے، ایسی حالت میں اسلام کی بڑی خدمت اسی میں تھی کہ ایسے صوفیانہ سلسلہ کو ترقی دی جائے جو بعض دوسرے سلسلوں کی طرح شرع سے آزاد نہ ہو۔

حضرت مجددؒ نے یہی کیا اور ہندوستان کے مشہور اور پرانے سلسلوں کو چھوڑ کر ایک ایسے طریقے کی اشاعت کی جس میں شرع اسلام کی پیروی پر بڑا زور ہے، "جواہر مجددیہ" کے مصنف لکھتے ہیں کہ اس طریقے کے تمام اصول اور فروع میں اتباع سنت سنیہ اور اجتناب بدعت نامرضیہ ہے، ... صحابہ کبار کا سا لباس مشروط ہے، انہی کی سی معاشرت، ایسے ہی کم ریاضتیں اور فیضان کثیر اور کمالات ولایت کے علاوہ کمالات نبوت کی بھی تعلیم ہے، نہ اس میں چلہ کشی کی ضرورت ہے نہ ذکر بالجہر کی اجازت ہے، نہ سماع بالمزامیر ہے، نہ قبور پر روشنی، نہ غلاف و چادر اندازی، نہ ہجوم عورات، نہ سجدہ تعظیمی، نہ سر جھکانا، نہ بوسہ دینا، نہ توحید وجودی و دعوائے انا الحق و ہمہ اوست"، نہ مریدوں کو پیروں کی قدم بوسی کا حکم، نہ مرید عورتوں کی ان کے پیروں سے بے پردگی، اس کے علاوہ نہ صرف آپ نے طریقت کا وہ سلسلہ اختیار کیا جس میں احکام شرعی کا سب سے زیادہ پاس تھا، اور اس سلسلے کو ترقی دی بلکہ طریقت کے مقابلہ میں شرع کی اہمیت واضح کر دی، آپ کے کئی ارشادات ایسے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ تعلیم دینی کو تعلیم سلوک پر مقدم رکھتے تھے، اور صحابہ کرام کو تمام اولیاء سے بزرگ تر مانتے تھے، آپ فرمایا کرتے تھے کہ حال تابع شریعت ہے نہ کہ شریعت تابع حال، جب آپ نے دیکھا کہ صوفیاءِ متقدمین کے کلام کی خلاف شرع ترجمانی ہوتی ہے، تو اپنے مکتوبات میں تشریح اور تاویل کرتے

[1] رود کوثر ص ۲۸۲

انہیں شرع کے مطابق ثابت کیا، مشائخ متاخرین بعض خلاف شرع امور کو روا رکھتے تھے، آپ فرماتے تھے کہ وہ لازم الاتباع نہیں ہے۔[1]

شعائرِ اسلام کا احیاء

شرع کی ترویج، طریق نقشبندیہ کی اشاعت، شریعت و طریقت کی تطبیق اور بدعت کی مخالفت کے علاوہ شیخ مجددؒ نے جو اہم کام کیا وہ اسلام کا عام احیاء تھا، اس زمانے میں جب ایک طرف اکبر کے "صلح کل" طریقے نے اسلام کو اس حمایت و دین پناہی سے محروم کر دیا تھا جو اسلامی حکومت کی ابتدا سے اسے حاصل تھی، اور دوسری طرف ہندو احیائیت نے مسلمانوں کے لئے (جیسا کہ ہم تفصیل سے آگے چل کر بتائیں گے) طرح طرح کی مشکلات پیدا کر دی تھیں، آپ نے شعائرِ اسلام کے احترام پر زور دیا، امراء اور ارکین سلطنت کو اس کی تلقین کی، خود اپنی زندگی میں اسلامی نقطۂ نظر کے احترام کی بڑی جرأت مندانہ مثال قائم کی، آپ نے جہانگیر کے سامنے سجدہ نہ کر کے قید و بند کی سختیاں جھیلیں اور اپنی جرأت اور احترام دین سے خلاف شرع احکام کی عملی مخالفت کی، آپ کی اس نیک مثال نے لوگوں کو جرأت دلائی، جو دبے بیٹھے تھے وہ دلیر ہو گئے، حکمران طبقہ میں جو اسلام پسند گروہ تھا اسے تقویت ملی، اور جو غیر اسلامی آداب و رسوم دربارشاہی میں عجمی ملوکیت کی تقلید میں یا ہندو اثرات کی وجہ سے رائج ہو گئی تھیں ان کے ازالہ کا سامان ہوا، اور شعائرِ اسلام کے احترام کا پھر سے خیال کیا جانے لگا۔[2]

حضرت مجددؒ نے خود احیاء اسلام کی کوشش کی، اور اس کے علاوہ ایک ایسا وسیع نظام قائم کر دیا جس سے آپ کے مقاصد کی تکمیل ہوئی، آپ کے صدہا خلفاء تھے جو ہندوستان کے کونے کونے میں بلکہ ہندوستان کے باہر بھی آپ کے خیالات کی اشاعت کر رہے تھے، آپ کے بعد آپ کے فرزندان ارجمند نے آپ کا کام جاری رکھا، آج بھی آپ کے سلسلے کا فیض جاری ہے، اور نقشبندیہ، مجددیہ سلسلہ میں اتباع شریعت اور ترویج سنت کا جوش دوسرے سلسلوں سے زیادہ ہے۔[3]

اختلافات کا حل

حضرت مجددؒ نے ہندوؤں کی جارحانہ احیائیت کا ترکی بہ ترکی جواب دیا، وہ ان کوششوں کے بھی خلاف تھے جو اسلام اور ہندومت کے امتزاج کے متعلق بعض ہندو اور مسلمان پسند کرتے تھے، دفتر اول میں ایک خط ایک ہندو ہردے رام کے نام ہے، جس نے حضرت مجددؒ کے نام دو خطوں میں فقراء و صوفیاء

[1] رود کوثر ص ۲۸۲ [2] [3] رود کوثر ص ۲۸۳

سے محبت کا اظہار کیا تھا اور لکھا تھا کہ رام اور رحمٰن حقیقت میں ایک ہیں، حضرت مجدد کو اس طرز استدلال میں خطرہ نظر آتا تھا، انہوں نے ایک پُر زور خط میں مکتوب نگار کے نقطۂ نظر کی تردید کی اور لکھا "رام اور رحمٰن کو ایک جاننا بڑی بیوقوفی ہے، خالق مخلوق کے ساتھ ایک نہیں ہوتا اور چوں بے چوں کے ساتھ متحد نہیں ہوتا" غیر مسلموں کی نسبت حضرت مجدد کا انداز بیان عام صوفیاء سے مختلف تھا، لیکن ان کا نقطۂ نظر محض معطیانہ نہ تھا، انہوں نے حالات کے تحت بعض جگہ بڑے سخت الفاظ استعمال کیے، لیکن ہندو مسلم مسئلہ کا انہوں نے ایک حل بھی پیش کیا، شاید کشیدگی دور کرنے اور ملک میں ایک خوش گوار فضا پیدا کرنے کے لئے سب سے کارآمد طریق کار وہی تھا، ان کی نگاہ تیز بین نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلافات اتنے بنیادی ہیں کہ دین الٰہی کا ملغوبہ بنا کر یا رام اور رحمٰن کو ایک کہہ کر انہیں جوڑا نہیں جا سکتا، یہ ایک سعی لاحاصل ہے، یا خرابیوں کا پیش خیمہ اور بہر کیف اسلام اور مسلمانوں کے لئے ایک خطرۂ عظیم ہے، امن و امان کی خاطر اور ہندوستان کے خاص حالات کے لئے زیادہ سے زیادہ وہ جس بات کو گوارا کر سکتے تھے وہ یہ تھی "مسلمانان بر دین خود باشند و کفار بر کیش خود، (آیتِ کریمہ) "لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ" بیان این معنی است (مکتوبات) یعنی امتزاج یا اتحاد نہیں، رواداری ہے اور کیا یہ طریق کار حالات کا واحد قابلِ عمل ہونے کے علاوہ منصفانہ نہ تھا؟[1]

ہندوؤں کے متعلق حضرت مجددؒ نے بسا اوقات اظہار خیال بڑی تلخی اور غیظ و غضب سے کیا، اور بہر کیف ان کا انداز فکر اور اسلوب اظہار ان صوفیاء سے بالکل مختلف تھا جنہیں ہندو احیائیت کا سامنا کرنا پڑا، لیکن ہندو مسلم اختلافات کے متعلق تاریخ نے ان کے نقطۂ نظر کی تائید کی، ہندو مسلم اتحاد کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا، انگریزی عہد میں اختلافات بڑھ گئے اور برصغیر کو بھارت اور پاکستان میں تقسیم کرنا پڑا، شاید ان ملکوں کے راہ نما اور بیرونی خیر خواہ بھی کبھی سرہند کے اس "مردِ آخر بیں" کی رائے تسلیم کر لیں کہ ان دونوں کے درمیان امن و سلامتی کا راستہ اتحاد نہیں، بلکہ ہمسایانہ رواداری ہے۔[2]

اکبر کے اوصاف

اکبر ایک عادل، مدبر اور بہادر بادشاہ تھا، فتح و کامرانی اس کے قدم چومتی تھی، چنانچہ اس نے طویل فاصلے طے کر کے صرف سو دو سو سواروں کے ساتھ بیس ہزار سے لے کر تیس ہزار تک کے لشکروں پر بے جھجک حملہ کیا اور ان کو شکست دے کر بھگا دیا، اس کی دانائی، بلند حوصلگی اور بردباری کا ثبوت سلیم کی

[1] رود کوثر ص ۳۴۴ [2] رود کوثر ۳۴۴

بغاوت میں ملتا ہے کہ اس نے اپنے تند مزاج بیٹے کو کھلی بغاوت سے اور اپنی ہوشیاری سے بغیر کسی لشکر کشی کے دوبارہ اپنے دام اطاعت میں گرفتار کرلیا۔

عہد اکبری کی تعمیرات میں ایک قلعۂ اکبرآباد ہے جس کی عمارتیں اور باغ ازسرنو بنائے گئے، دوسرا الہ آباد کا قلعہ ہے، تیسری فتح پور کی بلند اور عالی مسجد ہے، اس کے علاوہ اور بھی عمارتیں ہیں جو اس بادشاہ کے حکم سے تعمیر ہوئیں۔ ان کے ساتھ ساتھ اس نے نظم ونسق کے قاعدے اور سلطنت وحکمرانی کے ضابطے وضع کئے اور انھیں رواج دیا۔

عہد اکبری میں ترک، تاجیک، عرب وعجم ہر ملک وقوم کے شاعر، فاضل، حکماء وعقلاء ہندوستان میں جمع ہوگئے تھے اور یہ صرف اس بادشاہ کی قدر دانی اور علم وہنر کی سرپرستی کا نتیجہ تھا۔[1]

شب چہار شنبہ ۱۲ جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ ۱۶۰۵ء کو اکبر کی روح پرواز کرگئی، اکبر نے کل اکیاون سال دو ماہ تک بادشاہت کی ہے

دنیا کا عروج و زوال آنی و فانی
ٹھہرا نہیں کرتی کبھی دریا کی روانی

بادشاہ جہانگیر

اکبر کے بعد اس کا لڑکا سلیم جہانگیر کے نام سے تخت نشین ہوا، بھائیوں کا انتقال باپ کے سامنے ہی ہوچکا تھا، جہانگیر میں اکبر کی سی چستی تھی، ناز ونعم میں پرورش پائی تھی، مگر سلیقہ مند تھا کہ بائیس برس تک سلطنت کو کامیابی سے سنبھالا اور اس کو بڑھایا اور پھیلایا، راجپوتانہ اکبر کے سامنے ہی قابو میں آگیا تھا اور اودے پور باقی تھا وہ جہانگیر کے زمانے میں سر ہوا، اسی طرح احمد نگر جس کا کچھ حصہ اکبر کے زمانہ میں فتح ہوا تھا، اب پورے طور پر قبضہ میں آیا۔

جہانگیر کے بارے میں بزم تیموریہ نے یوں نقشہ کھینچا ہے جو درج ذیل ہے:

جہانگیر دعاؤں سے پیدا ہوا، حوصلوں اور تمناؤں میں پلا اور ناز ونیاز کے ساتھ بڑھا، ہوش سنبھالا تو اپنے کو علم وکمال کے گہوارے میں پایا، جب چار سال چار مہینے اور چار روز کا ہوا تو علم پرور باپ نے اس کی رسم کتب کی تقریب انجام دی، فیضی اور مولانا میر کلاں ہروی محدث کو اس کی تعلیم کے لئے مامور

[1] تاریخ عہد مغلیہ یعنی منتخب اللباب جلد سوم ص ۲۲۸

کیا، قطب الدین خان اور عبد الرحیم خانخاناں اس کے اتالیق مقرر ہوئے، مولانا احمد علی کے والد بھی اس کے استاذوں میں تھے، یہ ہیئت، طبعیات اور اطار وانشار اور خطاطی میں اپنی نظیر آپ تھے، جہاں گیر نے چہل حدیث سید صدر جہاں سے پڑھی، ایسے استاذوں اور اتالیقوں کے فیض تعلیم کا جو خوشگوار نتیجہ ہوا چاہئے تھا وہ علم وفن کے آسمان پر ماہتاب بن کر چمکا۔

عبد الرحیم خانخانان سے اس نے ترکی زبان سیکھی، وہ خود لکھتا ہے کہ "باوجودیکہ میں نے ہندوستان میں پرورش پائی، لیکن ترکی زبان کے بولنے اور لکھنے سے عاری نہیں ہوں" تزک بابری کے آخر میں کچھ اجزاء ترکی زبان میں لکھ کر اضافہ کیا ہے۔

فارسی زبان کا وہ ایک بے مثل انشاء پرداز تسلیم کیا جاتا ہے، اس کا علم شاہ کار خود اس کی تزک ہے، جو سادگی، صفائی، بے تکلفی، بے ساختگی اور قادر الکلامی کے لحاظ سے بے عدیل ہے، مولانا شبلیؒ کی رائے میں اس کتاب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ واقعات کو ایسے بے تکلف، برجستہ اور دل آویز طریقہ سے ادا کرتا ہے کہ بڑے بڑے انشاء پرداز نہیں کرسکتے، وہ جب کسی جنگ کی ہنگامہ آرائیوں کی تصویر کھینچتا ہے تو ہم میدان کارزار میں کھڑے نظر آتے ہیں، جب کسی جشن کی چہل پہل یا شبستان عیش کا نقشہ کھینچتا ہے تو آنکھوں کے سامنے اس کی ساری رنگینیاں اور سرمستیاں آجاتی ہیں، جب وہ کسی علمی مسئلہ پر بحث کرتا ہے تو اس کے ہر پہلو کو نمایاں کردیتا ہے، جب وہ کسی مقام کا ذکر کرتا ہے تو ایک محقق جغرافیہ داں کی طرح اس کی ساری معلومات فراہم کردیتا ہے، جس کسی شہر کی تاریخ اور وہاں کے لوگوں کے رسوم وعادات تحریر کرتا ہے تو ایک مؤرخ کی شان میں نظر آتا ہے، جب وہ پھولوں، پھلوں، پرندوں اور جانوروں کی جزوی تفصیلات بیان کرتا ہے تو نہ صرف زبان کا لطف قائم رکھتا ہے، بلکہ نباتات اور حیوانات کے ماہر ہونے کا ثبوت بھی دیتا ہے۔[1]

عہد جہانگیر اور مجدد الف ثانیؒ

حضرت احمد سرہندیؒ کی تجدیدی دعوت وعزیمت کی شہرت کے آگے دوسرے علماء کے کارنامے ماند پڑگئے، وہ مجدد الف ثانی کے نام سے مشہور ہوئے، ان کے مکتوبات اور دوسری تصنیفات اب تک رشد وہدایت کے سرچشمے بنے ہوئے ہیں، ان کے کارناموں کا خاص زمانہ عہد جہاں گیر تھا، اس لئے جہانگیر کی تخت نشینی پر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "بادشاہ اسلام کی تخت نشینی کی خوش خبری

[1] بزم تیموریہ

س و عام تک پہنچی، اہل اسلام کے لئے لازم ہے کہ بادشاہ کے مددگار اور معاون ہو ویں، شریعت کے رواج دینے اور مذہب کو تقویت پہنچانے میں اس کی رہنمائی کریں، خواہ یہ امداد تقویت زبان یا عمل سے ہو، سب سے ضروری کام یہ ہے کہ کتاب و سنت اور اجماع امت کے طریقے پر شرعی مسائل بیان کئے جائیں، تاکہ کوئی بدعتی اور گمراہ درمیان میں آکر راستہ سے نہ بہکا دے اور کام خراب نہ کرے، اس قسم کی امداد علماء حق سے لی جائے جو آخرت کی طرف توجہ رکھتے ہیں، علماء دنیائے دنی کی صحبت زہر قاتل ہے، ان کا فساد متعدی ہوتا ہے، گذشتہ زمانے میں اسلام پر بلا اسی جماعت کی بدولت آئی، انہوں نے بادشاہوں کو بہکایا" (مکتوبات امام ربانی جلد اول صفحہ نمبر ۴۷) [1]

شیخ فرید بخاری اور دوسرے امراء کے ذریعہ سے حضرت احمد سرہندیؒ جہاں گیر کو شریعت کی پاسداری کرانے میں کامیاب ہوئے، وہ اپنے مکتوبات میں شیخ فرید بخاری کو تحریر فرماتے ہیں:۔

"سنا گیا ہے کہ بادشاہ اسلام نے مسلمانی کی نیک نیت سے جو اپنی ذات میں رکھتا ہے آپ سے فرمایا ہے کہ چار دین دار علماء کو فراہم کریں، تاکہ وہ دربار میں ملازم رہ کر مسائل شرعیہ بیان کرتے رہیں اور کوئی بات خلاف شرع نہ ہونے پائے، الحمد لله سبحانه على ذلك، مسلمانوں کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا بشارت ہو سکتی ہے؟ اور ماتم زدگان کے لئے اس سے بڑھ کر اور اس سے زیادہ کیا خوش خبری مل سکتی ہے، یہ حقیر اس کام کے لئے آپ کو توجہ دلاتا رہا ہے، اور کئی بار اس کا خواہاں ہوا ہے، اس لئے اس سلسلہ میں کہنے اور لکھنے سے اپنے آپ کو باز نہ رکھ سکے گا، آپ بھی اس کے لئے معذور سمجھیں، غرض کا بندہ باؤلا ہوتا ہے، اس لئے عرض ہے کہ ایسے دین دار علماء بہت تھوڑے ہیں جو حب جاہ و ریاست نہ رکھتے ہوں اور شریعت کی ترویج اور ملت کی تائید کے سوا اور کوئی غرض ان کے سامنے نہ ہو، حب جاہ کی خاطر ہر عالم بادشاہ کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرے گا اور اپنی فضیلت ظاہر کرنا چاہے گا، اختلافات پیدا کر کے بادشاہ کی قربت حاصل کرنے کی کوشش ہوگی جس سے فہم دین کا سوال بگڑتا جائے گا، گذشتہ عہد میں علماء کے اختلافات ہی نے دنیا کو بلا میں ڈال دیا اور اب بھی وہی بات پیدا ہوئی تو شریعت کی ترویج کیا ہو سکے گی؟ دین کی تخریب پھر ہوگی، علماء سوء کے فتنے سے اللہ پناہ دے، اس لئے اگر اس غرض سے ایک عالم کا انتخاب کیا جائے گا تو بہتر ہوگا، اگر علماء آخرت میں سے مل جائے تو اس سے بڑھ کر کیا سعادت ہو سکتی ہے کہ اس کی صحبت کبریت احمر ہوگی، اور اگر کوئی ایسا عالم نہ ملے تو غور و فکر کے بعد اس قسم کے علماء میں سے کسی بہتر کو منتخب کر لیا جائے "ما لا يدرك كله لا يترك كله" میں نہیں جانتا کہ کیا لکھوں، جس طرح مخلوقات کی خلاصی علماء کے وجود سے وابستہ ہے، اسی طرح دنیا کا خسارہ بھی ان ہی سے مربوط ہے،

[1] بزم تیموریہ جلد دوم ص ۱۲۵

بہترین علماء دنیا کی بہترین مخلوق ہیں، بدترین علماء دنیا کی بدترین مخلوق ہیں، تمام دنیا کی ہدایت اور گمراہی انہی پر موقوف ہے، کسی بزرگ نے ابلیس لعین کو دیکھا کہ وہ فارغ اور بے کار بیٹھا ہے، اس کا سبب پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ میرا کام علماء کر رہے ہیں، بہکانے اور گمراہ کرنے کے لئے وہی کافی ہیں۔ ؎

عالم کہ کامرانی و تن پروری کند
او خویشتن گم است کرا رہبری کند

(مکتوب نمبر ۵۳ جلد اول)

بادشاہ اکبر چونکہ علماء سوء کی صحبت سے بدراہ ہو گیا تھا، اس لئے حضرت مجدد الف ثانیؒ نے عہد جہاں گیر کے علماء اور امراء اور صوفیاء کی اپنے مکاتب کے ذریعہ خوب اصلاح فرمائی ہے، چونکہ یہی جماعت بادشاہ وقت پر اپنے قول و فعل سے اثر انداز ہو سکتی ہے، اپنے ایک مکتوب میں امیر صدر جہاں کو لکھتے ہیں "بادشاہوں کا جتنا زیادہ احسان عام لوگوں پر ہوتا ہے اس ارتباط اور تعلق کے باعث اتنا ہی بادشاہوں کے نیک اور برے اخلاق اور برے بھلے عادات لوگوں میں اثر کر جاتے ہیں، اسی سبب سے کہا گیا ہے "الناس على دين ملوكهم (لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں) گذشتہ زمانہ کا کاروبار اسی بات کا مصداق رہا، اب جبکہ حکومت میں انقلاب آگیا ہے، اسلام کے پیشواؤں یعنی صدور عظام اور علماء کرام پر لازم ہے کہ اپنی تمام ہمت کو شریعت کی ترقی میں لگا دیں اور سب سے پہلے اسلام کے گرے ہوئے ارکان کو قائم کریں، کیونکہ تاخیر میں خیریت نہیں، غریبوں کے دل اس تاخیر سے بے قرار ہیں، گذشتہ زمانے کی سختیاں ابھی تک مسلمانوں کے دلوں میں برقرار ہیں، ایسا نہ ہو کہ ان کا تدارک نہ ہو اور اسلام کی غربت اس سے بھی زیادہ ہو جائے [1]

اسی طرح جہاں گیر کے ایک دوسرے ممتاز امیر خان اعظم کو لکھتے ہیں کہ "اسلام کی غربت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ مسلمان اسلام کے احکام جاری کرنے سے رکے ہوئے ہیں اور شریعت کے بجا لانے میں مذموم و مطعون ہیں، ایسے نازک وقت میں آپ کا وجود مبارک غنیمت ہے، حق تعالیٰ سبحانہ آپ کا مؤید و ناصر ہو، گذشتہ حکومت میں دین مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دشمنی برتی جاتی تھی، اس حکومت میں بظاہر وہ عناد نہیں ہے، اگر ہے تو بے علمی کے باعث ہے، ایسا نہ ہو کہ اس بے علمی سے مسلمانوں پر معاملہ اور زیادہ تنگ نہ ہو جائے"۔ امراء کی اصلاح کے ساتھ علماء کی توجہ بھی اس طرف دلائی کہ ان کو دین کے سنوارنے میں کیا کیا کرنا ہے، دنیادار علماء کو علماء سوء کہہ کر ان پر ضرب کاری لگائی اور ان کے متعلق یہ تحریر فرمایا [2]

[1] بزم تیموریہ جلد دوم ص ۱۲۸ [2] بزم تیموریہ جلد دوم ص ۱۲۸

Scanned by CamScanner

"علماء بد دین کے چور ہیں ان کا مقصود ہمہ تن یہ ہے کہ خلق کے نزدیک مرتبہ ریاست اور بزرگی حاصل ہو جائے: "العیاذ باللہ من فتنتھم" (اللہ تعالیٰ ان کے فتنے سے بچائے) ہاں! ان میں جو بہتر ہیں وہ تمام مخلوق میں سب سے اچھے ہیں، کل قیامت کے دن ان کی سیاہی کو فی سبیل اللہ شہیدوں کے خون سے تولیں گے اور ان کی سیاہی کا پلہ بھاری ہو جائے گا" شر الناس شرار العلماء و خیر الناس من خیار العلماء "سب لوگوں میں سے بُرے بُرے علماء ہیں، اور سب خلقت سے اچھے اچھے علماء ہیں"[1]

وہ کسی حال میں یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ علماء دنیا سے محبت کرنے لگیں، کیونکہ ان کے خیال میں علماء کے لئے دنیا کی محبت اور رغبت ان کے جمال کے چہرے کا بدنما داغ ہے، وہ علماء کو پارس پتھر کی طرح دیکھنا چاہتے تھے کہ تانبا اور لوہا بھی اس سے مس ہو جائے تو سونا ہو جاتا ہے، اور جو عالم دنیا کی محبت میں گرفتار رہتا ہے وہ دین کا چور ہے، اگرچہ وہ اپنے کو دین کا پیشوا جانتا ہے، اور وہ دین کے فتور کا ذمہ دار علماء ہی کو قرار دیتے رہے، اسی لئے فرمایا کہ جو سستی اور غفلت امور شرعی میں واقع ہوتی ہے وہ ان برے عالموں کی کم بختی اور ان کی نیتوں کے بگڑ جانے کے باعث ہوتی ہے۔ (مکتوب ۳۳)[2]

انہوں نے صوفیائے خام پر بھی ضرب کاری لگائی، وہ ایسے تصوف کو پسند نہیں کرتے جو شریعت سے دور ہو، وہ صوفیاء کے احوال، مواجید، علوم و معارف کو اسی وقت تک قابل قبول سمجھتے رہے جب تک کہ یہ عین شریعت کے مطابق ہو، وہ طریقت کے بجائے شریعت ہی کو دنیا اور آخرت کی تمام سعادتوں کا ضامن قرار دیتے رہے۔ (مکتوب ص ۳۶)[3]

ان کی تلقین رہی کہ جو کشف و الہام یا علوم و معارف کتاب و سنت کے موافق ہیں تو وہ مقبول ہیں، ورنہ مردود، وجد و حال اگر شرع کی میزان پر درست اتریں تو یہ صحیح، ورنہ وہ نیم جو کے برابر بھی نہیں، اسی طرح کشف و الہام اگر کتاب و سنت کی کسوٹی پر صحیح نہ اتریں تو وہ بھی نیم چیتل کے برابر نہیں۔ (مکتوب ص ۲۷)[4]

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بعد اس دور میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے علم و فضل کا چرچا رہا، انہوں نے احیاء دین کے لیے مساعی جمیلہ کیں، ان کے فیوض و برکات کا سرچشمہ اب تک جاری ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں:۔ مولانا عبدالحق دہلوی کی ذات وہ ذات ہے جس نے ہندوستان میں رہ کر حدیث کے سربمہر خزانے کو وقفِ عام کیا اور دل پسند محققانہ تصنیفات کے ذریعہ علماء ظاہر و باطن دونوں کی محفلوں سے تحسین و آفرین کی داد وصول کی، ان کا یہ کارنامہ بھی بہت بڑا ہے کہ انہوں نے حدیث و فقہ میں پوری تطبیق دے کر لوگوں کے ذہن کو صاف کیا اور اگر اس دور میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے دین کی تجدید کی، تو شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے علوم دین کا احیاء کیا۔[5]

---

[1] [2] [3] [4] [5] بزم تیموریہ جلد دوم ص ۱۳۹

ہمراہ نے ابتداء میں جہاں گیر بادشاہ کو مجدد الف ثانیؒ سے سوءِ ظن میں مبتلا کر دیا تھا، جس کے نتیجہ میں جہانگیر نے امن عامہ کی خاطر مجدد الف ثانیؒ کو گوالیار کی قید میں محبوس کر دیا تھا، مگر آپ جلد رہا ہوئے۔ اس کے بعد خود اپنی مرضی سے جہانگیر کے لشکر کے ہمراہ تین چار سال رہے، ان ایام میں بادشاہ بذات خود خصوصی محفلوں میں شرکت کرتا اور مجدد الف ثانیؒ کی روحانی باتوں سے فیض یاب ہوتا، جیسا کہ بزم تیموریہ میں لکھا ہے کہ "امر واقعہ ہے کہ آخر میں جہانگیر اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے تعلقات خوشگوار ہو گئے تھے، اسیری سے رہائی کے بعد جب تک وہ جہاں گیر کے ساتھ رہے وہ روزانہ مغرب کے بعد ان سے ملاقات کرتا، حضرت مجددؒ کے سرچشمہ علم و فضل سے اس کے قلب کی جس طرح تطہیر ہوئی وہ خود اپنے صاحبزادوں خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم کو تحریر فرماتے رہے ہیں جو ان کے مکاتب میں محفوظ ہے۔[1]

کتب خانہ اور مدارس

جہانگیری دور کا سب سے اہم اور مستند مؤرخ خود جہاں گیر ہے، جس کی تزک کی تاریخی اور ادبی اہمیت غیر معمولی ہے، اس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جہانگیر کے پاس ایک شاندار کتب خانہ تھا، جب وہ سفر میں جاتا تو یہ کتب خانہ بھی اس کے ساتھ رہتا تھا اور جن علماء اور مشائخ کی قدر دانی کرتا ان کو اپنے کتب خانہ سے کتابیں بھی نذرانے میں پیش کرتا۔

وہ اپنے بارہویں سال جلوس میں احمد آباد گیا تو وہاں کے مشہور بزرگ شیخ اسماعیل بن شیخ محمد غوث سے ملا، ان کو خلعت اور جاگیریں عطا کیں اور اپنے کتب خانہ خاص سے تفسیر کشاف، تفسیر حسینی اور روضۃ الاحباب وغیرہ جیسی کتابیں نذر کیں، اور مشائخ کی اولادوں کے ساتھ ہر قسم کی رعایتیں کیں۔[2]

وفات

جہانگیر ۱۰۳۷ھ مطابق ۱۶۲۷ء میں لاہور میں انتقال کر گیا، کل بائیس سال حکومت کی۔

تاریخ جہاں بانی صدیوں سے بتاتی ہے
بے جہد نہیں کھلتے اسرار جہاں گیری

بادشاہ شاہ جہاں

جہاں گیر کی وفات کے بعد شاہزادہ خرم شاہ جہاں کے نام سے تخت نشیں ہوا۔

---

[1] [2] بزم تیموریہ جلد دوم ص ۱۳۹

شاہ جہاں کے زمانے میں وہ ردعمل جو اکبری طریق کار کے خلاف جہانگیر کے عہد حکومت میں شروع ہوا تھا اور بھی قوی ہوگیا، اور اسلام اور شعائر اسلامی پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ جہانگیر کے زمانے میں عام لوگوں کے لئے درباری سجدہ برقرار تھا، شاہ جہاں نے اسے موقوف کر دیا، وہ شرع کے مطابق مقدمات فیصل کرتا اور علماء، فضلاء کا بھی بڑا قدر رداں تھا، نماز روزہ کا پابند تھا، اور جہانگیر کے مقابلہ میں شاہ جہاں کو امور اسلامی کا زیادہ خیال تھا۔

شاہ جہاں کو بابر، ہمایوں اور جہانگیر کی طرح علمی انہماک نہ تھا، اس لئے ان کی طرح کوئی علمی تصنیف نہیں چھوڑی، لیکن پھر بھی اس کی کتاب زندگی کا کوئی صفحہ علمی دلچسپیوں سے خالی نہیں، اس کے درباری علمی فضا اور اہل علم و فن کے ساتھ اس کی عدیم المثال فیاضیاں اور زر پاشیاں پھر دارا شکوہ، شجاع، مراد اور اورنگ زیب کی اعلیٰ تعلیم و تربیت اس کے ذوق سلیم کی شہادت ہے۔

شاہ جہاں جب چار برس چار مہینے اور چار روز کا ہوا تو خاندانی روایات کے مطابق پڑھنے کے لئے بٹھایا گیا، باکمال استادوں کے زیر نگرانی شہزادہ خرم (شاہ جہاں) نے علوم و فنون کی تکمیل کی، خطاطی میں اس کو بڑی مہارت تھی۔[1]

تعمیری یادگاریں

شاہ جہاں کی نادرہ کار تعمیری یادگاریں اس کے ذوق کی نفاست اور لطافت کی بین دلیل ہیں، اس کی تمام تر توجہ فنون لطیفہ کی اسی شاخ پر صرف ہوئیں، اگر ہم بابر کی ذہنی نقش آرائیاں اس کی تزک بابری میں، ہمایوں کی تخیل آرائیاں اس کی شاعری میں، اکبر کی علمی فیاضیاں اس کے دربار کی ہنر پروری میں اور جہانگیر کی رنگینیاں اس کی تزک میں پاتے ہیں تو شاہ جہاں کے ذہن کی بوقلمونیاں اس کے تخت طاؤس، قلعۂ معلی (لال قلعہ) اور تاج محل کے نقش و نگار سے عیاں ہیں، اس لئے یہ امر موجب تعجب نہیں، اگر اس نے اپنے باپ یا اپنے لڑکوں دارا اور اورنگ زیب کی طرح کوئی علمی یادگار نہیں چھوڑی تو اس کے دماغ کی گل افشانی کاغذ کے صفحات کے بجائے دیوان خاص اور دیوان عام کی دیواروں پر ہوئی، اس کا حسن ذوق علم و ادب کے بجائے جامع مسجد دہلی کی تعمیری ندرت و نفاست میں ظاہر ہوا، اس نے محبت کا ترانہ شعر و شاعری میں نہیں بلکہ تاج میں منظوم کیا۔[2]

علمی لیاقت

شاہ جہاں کی علمی لیاقت کا حال ان حکیمانہ اور عالمانہ باتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے جو اپنے

ا۔ [illegible] جلد دوم ص ۱۷۰ ۔ یہ چاروں شاہ جہاں کے صاحبزادے ہیں

درباریوں سے کہا کرتا تھا، جس کی ایک مثال درج ہے "[illegible] کی تاریخ کو جب کہ تمام شہزادے دربار میں حاضر تھے، ہر قسم کی گفتگو شروع ہوئی اور اسی سلسلے میں ایک تقریب سے [illegible] کی ایک دیوانی کے عہدے دار کا ذکر آیا کہ وہ کاروبار اور تمام معاملات میں نہایت سخت گیری سے کام لیتا ہے، شاہ جہاں نے فرمایا کہ کارگزاری کا یہ مناسب طریقہ نہیں کیونکہ کام میں سخت گیری اور اس کے بارے میں تنگی کرنے کا یہ انجام ہوگا کہ کاموں کے کرنے میں سستی اور کاہلی ظاہر ہوگی اور ملک میں فتنہ و فساد پھیل جائے گا جیسا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہد خلافت میں ہوا کہ وہ اگرچہ خلیفہ برحق اور امام مطلق تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے قول کے موافق حق و صداقت کے ساتھ کام کرتے تھے، تاہم کوئی کام ان کی مرضی کے مطابق نہیں ہوا، کیونکہ وہ دنیاداروں سے کسی کام میں کسی طرح کی رعایت سے کام نہیں لیتے تھے اس لئے دنیا کے لوگ جو دین اور آخرت کے بالکل خلاف تھے بالکل ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور فتنہ و فساد برپا کرنا شروع کیا۔

اسی اثناء میں سید جلال بخاری نے شاہ جہاں کے [illegible] کا جواب دیا [illegible] قائم ہے ایک حق اور دوسرا باطل، لیکن سید جلال بخاری نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ حق پر قائم ہو، شاہ جہاں نے کہا کہ حق و باطل ہر زمانہ میں رہا اور اس سلسلے میں یہ تقریر کی "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تمام کاموں کی بنیاد حق پر تھی اور تمام ترقیاں اس لئے ہوتی تھیں کہ آپ کے وجود کی برکت سے اس زمانے کے لوگ حق و صداقت پر تھے اور سب کے دل فطری پاکیزگی اور صفائی کے علاوہ آپ کے [illegible] سے پاک و صاف ہوگئے تھے اس لئے حق و صداقت کے سوا کسی چیز کا نقش ان پر قائم نہیں ہوسکتا تھا اور باطل کے لئے ان میں کوئی جگہ نہ تھی، اس لئے تمام امور حق کے مطابق حق و صداقت کے ساتھ انجام پاتے تھے، یہی حال خلفاء راشدین کے زمانے کا تھا کہ جس طرح سورج کے ڈوبنے کے بعد بھی کچھ دیر تک روشنی قائم رہتی ہے اسی طرح آفتاب نبوت کے ڈوبنے کے بعد بھی خلفاء راشدین کے زمانے کے لوگوں کے دلوں پر غفلت کا زنگ لگنے نہ پایا، لیکن جب رفتہ رفتہ لوگوں کے حالات بدل گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے بالکل بعد ہوگیا تو لوگوں کے دل زنگ خوردہ ہوگئے، نوبت یہاں تک پہنچی کہ سیاہ کار ظالموں نے حضرت عثمان ذوالنورین کی [illegible] حالت میں [illegible] حق و صداقت پر قائم نہ رہ سکی، اسی بنا پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی امامت حق میں جو ان کا مقصود تھا کامیابی نہ ہو سکی۔"

[illegible]

شاہ جہاں اپنے گوناگوں مشاغل کے باوجود روزانہ کتابوں کا مطالعہ جاری رکھتا تھا، جب تمام کاموں سے فارغ ہوکر رات کو سونے جاتا تو اس کے مقربان خاص پردہ کے پیچھے سے کتابیں پڑھتے تھے جو زیادہ تر انبیاء، اولیاء، اور سلاطین کی سوانح عمریاں اور تاریخیں ہوتیں، وہ ظفر نامہ اور واقعات بابری کو بہت پسند کرتا تھا، اس کے چاروں بیٹے دارا شکوہ، شجاع، مراد، اورنگ زیب صاحب علم وفضل تھے، دارا شکوہ کی تصنیف کردہ دو کتابیں سکینۃ الاولیاء، اور سفینۃ الاولیاء، ابتدائی زمانے کی ہیں، جواب تک شائع ہورہی ہیں، اور اورنگ زیب عالم گیر کے علم وفضل کے حالات آئندہ صفحات میں درج کئے ہیں، گویا رزم وبزم دونوں میدانوں کے شہ سوار تھے۔

شعراء

اکبر اور جہاں گیر نے شعراء کی سرپرستی میں جو شاہانہ فیاضیاں کیں، ان کے غلغلہ سے ہندوستان اور ایران گونج رہے تھے، ایران سے شعراء ہندوستان اُڑے چلے آرہے تھے اور بقول مولانا شبلیؒ ایران اور ہندوستان ایک مکان کے دو صحن بن گئے تھے، چنانچہ شاہ جہاں کے دربار میں بھی شعراء کی تعداد بکثرت رہی، وہ اپنی فیاضی اور قدر دانی میں اکبر اور جہاں گیر دونوں سے بازی لے گیا، اس نے شعراء اور فضلاء کے ساتھ جودوسخاوت اور انعام واکرام کا ثبوت دیا ہے اس کی زریں مثال شاید ہی کسی حکمران خاندان میں پائی جائے گی۔[1]

ملکی فتوحات

شاہ جہاں کے زمانے میں ہندوستان کو کافی ترقی ہوئی، ملک کی آمدنی میں سے صرف مال گزاری ساڑھے سینتیس (۳۷) کروڑ تک پہنچ گئی، قسم قسم کی عمارتیں تیار ہوئیں، دکن میں مغلوں کا قدم پہلے ہی جم چکا تھا، اب ۱۶۳۱ء میں دولت آباد اور احمد نگر کے علاقے پورے طور پر قبضے میں آگئے، چار برس بعد خود شاہ جہاں دکن گیا اور بیجاپور کی ریاست نے بھی ماتحتی قبول کرلی۔

جہاں گیر کے زمانے میں قندھار پر ایرانیوں نے قبضہ کرلیا تھا، ۱۶۳۷ء میں شاہ جہاں کے قبضے میں آگیا، اس کے بعد شاہی فوجوں نے بلخ وبدخشاں پر بھی قبضہ کرنا چاہا، لیکن کامیابی نہ ہوسکی۔[2]

وفات

شاہ جہاں ۱۰۶۷ھ مطابق ۱۶۵۶ء میں بیمار ہوا، تخت وتاج کا وارث اپنے بڑے بیٹے دارا شکوہ کو بنانا چاہتا تھا، مگر زیادہ لائق اورنگ زیب ہی تھا، نیز دارا شکوہ کی مذہبی حالت مشتبہ ہوگئی تھی، اس

[1] بزم تیموریہ جلد دوم ص ۱۶۳ [2] ہندوستان کی کہانی

لئے اورنگ زیب بھی یہ نہ چاہتا تھا کہ وہ حکومت پر قابض ہو اور ملک کی حالت مذہب کے اعتبار سے ابتر ہو، لہٰذا اورنگ زیب نے حکومت اپنے قبضہ میں کرلی، جس کی وجہ سے شاہ جہاں کی ناراضگی بڑھ گئی، اورنگ زیب نے مصلحتاً آگرہ کے قلعہ میں شاہ جہاں کو نظر بند کردیا اور وہیں وفات پائی، تقریباً انتیس (۲۹) سال حکومت کی۔

کھنڈر سہی اے دوست عظمت کے نشان ہیں
پوشیدہ اسی خاک میں شاہانِ جہاں ہیں
ماضی کی یہ تعبیر ہے اور حال کی عبرت
تمہید قیامت کے یہ رخشندہ نشان ہیں

بادشاہ اورنگ زیب (عالم گیر)

اورنگ زیب شاہ جہاں کا تیسرا بیٹا تھا، دارا شکوہ اور شجاع دونوں عمر میں اس سے بڑے تھے، لیکن قابلیت اور کیرکٹر کی پختگی میں وہ ان سے کہیں بڑھا ہوا تھا، وہ محنتی، دور اندیش اور منتظمانہ نقطۂ نظر سے بڑا قابل تھا، اس نے ملک کے دور دراز حصوں میں صوبے داری کر کے انتظامی تجربہ حاصل کیا تھا اور اس دوران میں بطور ایک باتدبیر جرنیل اور بہادر سپاہی کے نام پیدا کیا تھا، اس کے لئے شہزادگی پھولوں کی سیج نہ تھی اور اپنا اثر واقتدار قائم رکھنے کے لئے اسے شروع ہی سے بوڑھے سیاست دانوں کی سب چالیں سیکھنی پڑیں، وہ طبیعت کا بڑا ٹھنڈا اور محتاط تھا، ضرورت کے وقت اپنے جذبات کو خوب قابو میں رکھتا اور ایسی سب تدبیریں تیزی سے سوچ لیتا جو اُسے حصولِ مقصد میں کام آسکتی تھیں۔

شاہ جہاں جب اپنے بیٹوں پر نظر ڈالتا تو اسے بھی عالم گیر کے عزم وحزم اور اس کی دماغی قابلیت کا قائل ہونا پڑتا تھا، شاہ جہاں اورنگ زیب کے "عزم وشعور" سے خوب واقف تھا، لیکن اپنی حکومت کے آخری پندرہ بیس سالوں میں اس نے اورنگ زیب سے کوئی قدر دانی کا برتاؤ نہیں کیا، شاہ جہاں کے اس زمانے کے خطوط واحکام پڑھیں تو نظر آتا ہے کہ نہ صرف اورنگ زیب کی نسبت اسکا رویہ پدرانہ شفقت ومحبت سے عاری تھا، بلکہ بعض اوقات تو اس کا طرز عمل یکسر معاندانہ ہو جاتا، اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں پر اورنگ زیب سے باز پرس کی ہے، اس کے لائقِ فخر کارناموں کی کوئی تعریف نہیں ہوتی، بلکہ بسا اوقات تو ان کوششوں میں جو اورنگ زیب مغلیہ حکومت کی توسیع کے لئے (مثلاً گولکنڈہ اور بیجاپور میں) باپ کے زیر فرمان شروع کرتا ہے روڑے اٹکائے جاتے ہیں اور اسے دوسروں کی نظروں میں ذلیل کیا جاتا ہے۔[1]

[1] رود کوثر ص ۴۵۵

شاہ جہاں کا بیٹا تھا اس کے بعد داراشکوہ [illegible]

[illegible]

[illegible] اورنگ زیب [illegible]

[illegible]

عالمگیر [illegible] (۲) [illegible] تھا اور جس طرح کابل اور [illegible]

[illegible] جس طرح مغلوں کے عہد میں [illegible]

[illegible] شریعت اور طریقت کا [illegible]

[illegible] اورنگ زیب کی کامیابی کی وجہ خواجہ محمد معصوم کی دعا بھی ہے [illegible]

[illegible] اورنگ زیب نے [illegible]

[illegible] جون ۱۶۲۶ء [illegible]

۱۔ [illegible] ص ۳۵۶

[illegible] دارا شکوہ [illegible] جنگ [illegible] کے لیے [illegible] اورنگ زیب کی اس [illegible] اورنگ زیب سے صلح کی خواہش کی۔

[illegible] اورنگ زیب کے [illegible] ظاہر ہے کہ [illegible] چنانچہ [illegible] اورنگ زیب [illegible] دہلی [illegible]

اصلاحاتِ عالمگیری

اورنگ زیب عالمگیر نے تخت نشین ہونے کے بعد ہی بھنگ وغیرہ کی کاشت کرنے کی ممانعت کر دی، شراب نوشی ممنوع قرار دی، جوا بند کر دیا، بدکاری کے خلاف پوری کوشش کی، بازاری عورتوں کو حکم دیا کہ یا تو وہ شادی کر لیں یا ملک چھوڑ دیں۔ ان احکام کی تعمیل کرانے کے لیے محتسب مقرر کیے۔ ۱۶۶۳ء میں اس نے "ستی" کی ممانعت کر دی اور بچوں کو بطور غلام یا خواجہ سرا بیچنے کے خلاف احکام جاری کیے۔[۲]

اس کے علاوہ اس نے خود اپنی پرہیزگاری اور سادگی سے اپنی رعایا کے لیے نیک مثال قائم کی۔ بادشاہ کے درشن کو موقوف کیا۔ اگرچہ وہ خود موسیقی کا ماہر تھا لیکن اس نے گانے والوں اور گانے والیوں کو دربار سے نکال دیا۔ اس کی سالگرہ پر جو اسراف ہوتا تھا اسے ترک کر دیا، اور شاہ جہاں کی ضیافتوں اور فضول خرچیوں کی وجہ سے رعیت پر جو ٹیکسوں کا بوجھ چڑھا ہوا تھا اسے ہلکا کر دیا۔ اس نے تقریباً اسی (۸۰) ٹیکس معاف کیے۔ وہ عالموں اور بزرگوں کی قدر کرتا۔ اس نے ملک کا انتظام شرع کے اصولوں پر قائم کیا تھا۔ اور عدل و انصاف کا محکمہ علماء کے ہاتھ میں تھا۔ اس وقت اسلامی قوانین کے متعلق کوئی مستند اور جامع کتاب نہ تھی۔ اس نے تمام ملک کے قابل علماء کو جمع کر کے فتاویٰ عالمگیری کے نام سے حنفی فقہ کی ضخیم کتاب مرتب کروائی جو اب تک بڑی اہم اور مستند سمجھی جاتی ہے۔ وہ خود بڑی سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ بیت المال کے پیسے کو ہاتھ نہ لگاتا۔ اپنی روزی ٹوپیاں بنا کر اور قرآن شریف لکھ کر کماتا۔ اس نے ۲۱ فروری ۱۷۰۷ء کو بروز جمعہ نوے (۹۰) سال کی عمر میں بمقام احمد نگر وفات پائی، اورنگ آباد سے بارہ کوس کے فاصلے پر "روضہ خلد آباد" میں دفن ہوا۔ مرتے وقت اس نے وصیت کی تھی کہ چار روپے دو آنے جو میں نے ٹوپیاں بنا کر کمائے ہیں میرے کفن پر خرچ ہوں اور تین سو پانچ روپے جو میں نے قرآن شریف لکھ کر کمائے ہیں مساکین میں تقسیم کیے جائیں۔ حسب وصیت اس کی تدفین نہایت سادہ ہوئی اور اس کی قبر پر کوئی عالی شان عمارت نہیں۔[۳]

۲۔ رود کوثر ص ۳۵۷ ۳۔ رود کوثر ص ۳۵۹

اسلامی مدارس اور ان کا نصاب تعلیم

اورنگ زیب ایک متدین بادشاہ تھا اس نے شرع کے احکام پر اپنا نظام حکومت ترتیب دیا اور ان کی پوری پوری پیروی کی۔ لیکن وہ کوئی تنگ نظر اور سادہ دل بادشاہ نہ تھا، اس کو اپنے زمانے کے علماء اور مدرسین کے نقائص سے پوری آگاہی تھی، چنانچہ اس نے اپنے ایک استاذ کے سامنے اس زمانے کے طرز تعلیم پر جو تنقید کی اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس زمانے کے طریقۂ تعلیم کی کوتاہیوں سے پوری طرح واقف تھا۔ (رود کوثر ص ۳۴۳)

عالم گیر اور غیر مسلم

اورنگ زیب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے غیر مسلموں سے منصفانہ سلوک نہ کیا اور مغلیہ رواداری کی دیرینہ روایات کو درہم برہم کر دیا، مولانا شبلی نے ایک اردو رسالہ میں اور مسٹر فاروقی نے ایک مبسوط انگریزی کتاب میں اس اعتراض کی پُر زور تردید کی ہے، اس کے علاوہ بعض حلقوں میں یہ غلط فہمی پھیلائی جاتی ہے کہ اورنگ زیب کے طرز عمل سے ہندو برگشتہ ہو گئے تھے اور اس سے مغلیہ حکومت کو زوال ہوا، اس کے متعلق ڈاکٹر تاراچند کی رائے پڑھنے کے قابل ہے، وہ فرماتے ہیں:

"بعض لوگوں کے نزدیک اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی اس کی ناکامی کا سبب ہوئی، بالعموم یہ خیال غلط ہے، ہندوؤں کی بغاوتیں ناکام رہیں اور ان کا کوئی مذہبی یا سیاسی مقصد نہ تھا، اورنگ زیب نے ان کو ہندوؤں ہی کی مدد سے فرو کیا، اس میں کوئی شک نہیں کہ مرہٹوں کے خلاف جنگ مغلیہ سلطنت کے لئے ایک بار عظیم ثابت ہوئی، لیکن ان کی بغاوت نہ ملکی تھی، نہ مذہبی، فقط ایک قبیلے کی بغاوت تھی اور دوسرے قبائل کی بغاوت سے بہت مختلف نہ تھی، راجپوت، بندیلے اور شیواجی کے اپنے رشتہ دار اورنگ زیب کی خاطر شیواجی اور اس کے جانشینوں کے خلاف لڑے، اور پھر مرہٹوں نے ہندوؤں کے خلاف بھی حملے کیے اور ان کے لشکروں میں مسلمان بھی موجود تھے۔"

سر پی۔ سی رائے نے بھی اپنی تقریر میں ایک اہم حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ "جو لوگ شیواجی کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کا مقصد ہندو دھرم کا احیاء تھا اور وہ مغلوں کے خلاف قومی جدوجہد کا رہنما تھا، وہ غلطی پر ہیں۔"

مرہٹہ تاریخ کے ضمن میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ شیواجی کا دادا مسلمان پیروں کا بڑا معتقد تھا اور حضرت شاہ شریف کا مرید تھا جو احمد نگر میں مدفون ہیں، اپنے مرشد کے نام پر اس نے اپنے بیٹوں کے نام شاہ جی اور شریف جی رکھے، جو فی الحقیقت مسلمانوں کے نام ہیں، مرہٹوں کے علاوہ اورنگ زیب کے صوبے داروں کو گورو گوبند سنگھ کا مقابلہ کرنا پڑا، اس کش مکش میں بعض افسوسناک واقعات ظہور پذیر ہوئے، لیکن غیر مسلم مؤرخین یہ امر بھول جاتے ہیں کہ اپنی وفات سے پہلے گورو گوبند سنگھ جی مغل فوج میں ایک عہدے پر مقرر ہو گئے تھے اور جب انہیں کسی پٹھان نے ذاتی عداوت کی بنا پر زخمی کیا تو اورنگ زیب کے جانشین بہادر شاہ نے اپنا خاص طبیب ان کے علاج کے لئے بھیجا۔[1]

علوم وفنون

اورنگ زیب کے عہد حکومت میں علوم اسلامی کی بڑی قدر رہی، لیکن قدرت کی نیرنگیاں دیکھئے کہ پچاس سال کے طویل عرصہ میں نہ تو شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ یا امام الہند شاہ ولی اللہؒ جیسا کوئی جید عالم اور نہ ہی حضرت سلطان المشائخ" یا حضرت مجدد الف ثانی" جیسا کوئی زبردست شیخ نظر آتا ہے، البتہ مدرس اور فقیہ بکثرت تھے اور بعض خاصے تھے، ان میں سے ایک قابل ذکر ہستی میر محمد زاہد ہروی کی تھی، جو کلام وحکمت میں اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عالم سمجھے جاتے تھے، ان کے والد قاضی محمد اسلم ہرات کے رہنے والے تھے، لیکن بود وباش کابل میں اختیار کر لی تھی، قاضی محمد اسلم نے لاہور میں شیخ بہلول سے تعلیم پائی اور عہد جہاں گیری وشاہ جہانی میں معزز عہدوں پر مامور رہے، پہلے کابل میں قاضی تھے، پھر قاضی عسکر ہو گئے، شاہ جہاں نے ایک مرتبہ ان کا وزن کرا کے وزن کے برابر روپے انعام دئے، قاضی محمد اسلم کی وفات ۱۶۵۱ء میں ہوئی اور لاہور میں دفن ہوئے (سبحۃ المرجان) ان کے صاحبزادے میر محمد زاہد ہندوستان میں پیدا ہوئے اور شاہ جہاں نے انہیں کابل میں واقعہ نویسی پر مامور کر رکھا تھا، عہد عالم گیری میں وہ پہلے محتسب لشکر اور بعد میں صدارت کابل پر مامور ہوئے، اس تقریب سے انہیں دل جمعی سے اپنے وطن میں بیٹھ کر تالیف وتصنیف کا موقع ملا، انہوں نے کئی درسی کتب مثلاً شرح مواقف، شرح تہذیب دوانی اور رسالہ تصور وتصدیق مصنفہ ملا قطب رازی پر حاشیے لکھے، جواب بھی رائج ہیں، ان کی وفات ۱۶۹۰ء میں ہوئی، جن لوگوں نے ان سے دارالخلافہ میں براہِ راست استفادہ کیا اُن میں شاہ ولی

---

[1] رود کوثر ص ۴۶۷

Scanned by CamScanner

اللہ کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم کا نام بھی ہے۔ ہندوستان میں اس وقت سب سے زیادہ فروغ علم حدیث کو حاصل تھا۔ شیخ عبدالحق محدث کی جاری ہوئی مسند دہلی میں مرجع بنی ہوئی تھیں۔ پنجاب میں ملا عبدالحکیم کا فیض ان کے صاحبزادے ملا عبداللہ نے جاری رکھا لیکن وہ گوشہ نشینی کی طرف زیادہ مائل تھے۔ گجرات میں اب بھی درس و تدریس کا معیار بلند تھا اور اواخر عہد عالم گیری میں وہاں مولانا نور الدین احمد آبادی جیسے علماء ہوئے۔ لیکن جو امتیازی شان اس بلاد مشرق کے علماء کو حاصل تھی وہ کسی دوسرے صوبہ کو میسر نہ ہوئی، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ کی مخصوص خوبیوں کے باوجود عہد عالم گیری سے لے کر مغلیہ سلطنت کے خاتمہ تک عام دینوی درس و تدریس میں دہلی اور باقی حصص ملک کی نسبت لکھنؤ اور دوسرے اضلاع شرقی کی درسگاہیں زیادہ پر رونق تھیں۔ لیکن اب بادشاہ کی علم نوازی اور قدر دانی علماء سے علم و فضل کو بے حد فروغ ہوا اور درس علوم اسلامی نے بڑی وسعت اختیار کی۔ درس نظامیہ عالم گیر کی وفات کے کئی سال بعد مدون ہوا۔ لیکن ملا نظام الدین کو جن کے نام پر یہ طریق تدریس "نظامیہ" کہلاتا ہے، عالم گیر ہی نے فرنگی محل لکھنؤ کی عالیشان عمارت مدرسہ کے لئے عطا کی۔ اس طریق تعلیم میں جو کتابیں برصغیر کی رائج ہیں، ان کا اکثر حصہ عہد عالم گیری میں لکھا گیا اور وہ بھی بادشاہ کے منظور نظر علماء (مثلاً میر زاہد، ملا محب اللہ بہاری) کے قلم سے۔ یہ کہنا بیجا نہیں کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں علوم اسلامی نے جو فروغ پایا اور دین کا جو احیاء ہوا اس کی بنیاد عہد عالم گیری میں رکھی گئی۔ (رود کوثر، ص ۴۷۳)

فتاویٰ عالم گیری

عہد عالم گیری کی سب سے اہم تصنیف "فتاویٰ عالم گیری" ہے، جسے ہندوستان کے حنفی علماء "ہدایہ" کے بعد بہترین فقہی کتاب سمجھتے ہیں۔ فقہ کے متعلق اس وقت کئی کتابیں موجود تھیں، لیکن کوئی مبسوط اور مکمل کتاب نہ تھی۔ جب اورنگ زیب نے باقاعدگی سے شرع کے احکام رائج کئے تو اس نے محسوس کیا کہ کئی باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق صحیح شرعی فیصلے پر پہنچنے میں دقت ہوتی ہے، چنانچہ اس نے ہندوستان کے ممتاز علماء کی ایک جماعت کو حکم دیا کہ فقہ کی تمام کتب سے "مسائل مُفتیٰ بہا" منتخب کر کے ایک کتاب تیار کی جائے جو فقہ کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو۔ اس جماعت کے صدر شیخ نظام تھے۔ علماء کے لئے وظائف مقرر ہوئے اور آٹھ سال کی محنت کے بعد کتاب تیار ہوئی۔ اس کی تیاری میں دو لاکھ روپے صرف ہوئے، معاصرانہ تذکروں سے خیال ہوتا ہے کہ بادشاہ اس کی تدوین و تالیف میں خود شریک تھا،

اور کتاب کا ایک صفحہ روزانہ ملا نظام سے پڑھوا کر سنتا تھا اور اس پر ضروری ترمیم کرتا تھا۔ فتاویٰ عالم گیری کے متعلق معاملات کے ایک مضمون نگار لکھتے ہیں: "حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب نے ہندوستان کے علماء کو تمام کتابوں سے بے نیاز کر دیا۔"

فن خطاطی

اورنگ زیب نے خطاطی کا فن محض ذاتی ذوق و شوق کے لئے نہیں سیکھا تھا، بلکہ اس کے ذریعے حصول سعادت دین کے ساتھ کسب معاش بھی کیا کرتا تھا۔ وہ فرصت کے اوقات میں صبح کو پانچ بجے سے سات بجے تک اور سہ پہر کو جاتی ہے سے سات بجے تک کلام مجید کے نسخے اپنے ہاتھ سے لکھتا تھا، جس کا سلسلہ اس نے ایام شہزادگی سے لے کر آخر عمر تک جاری رکھا۔ حضرت عالم گیر نے دو قرآن مجید اپنے قلم خاص سے تحریر فرما کر سونے کی جلدوں میں مدینہ منورہ میں حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر بطور نذر رکھوا دیے، اور ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کلام پاک کے نسخے آج بھی ہندوستان کے مختلف حصوں میں پائے جاتے ہیں۔ عبرت کی بات یہ ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے ملک اور سب سے بڑی مملکت کے شہنشاہ نے کلام پاک کے انہی نسخوں کے ہدیہ کی رقموں کو اپنی آخرت کی نجات کا ذریعہ سمجھا، چنانچہ اپنے وصیت نامہ میں لکھتا ہے "ٹوپی سلائی کا روپیہ میرے کفن میں استعمال کیا جائے اور قرآن پاک کی کتابت کا ہدیہ فقراء کو خیرات میں دے دیا جائے۔"

عالم گیر کی روحانی تربیت

عالمگیر نے سلوک و طریقت کی بھی تعلیم پائی۔ اس سلسلہ میں وہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تعلیمات سے متاثر تھے، اسی لئے ان کے فرزند ارجمند حضرت محمد معصوم قدس سرہ کے رشد و ہدایت سے مستفید ہوتا رہا اور حضرت کی صحبت عالم گیر کے حق میں بڑی دوا ثابت بن گئی۔ اس دور میں دارا شکوہ اور سرمد کی وجہ سے توحید وجودی میں موشگافیاں ہوئیں، ان سے طرح طرح کے فتنے اٹھتے گئے، جس کی آڑ میں شرعی احکام

۱ رود کوثر ص ۴۷۷ ۲ بزم تیموریہ جلد سوم ۳ ایک نسخہ حضور نظام دکن کی ملکیت میں ہے، دوسرا جناب مولوی سید خورشید علی صاحب ناظم دیوانی حیدرآباد کے پاس ہے، تیسرا نواب صاحب ماکروال کے پاس ہے۔ (بزم تیموریہ ص ۱۰)

Scanned by CamScanner

سے مداہنت اور اغماض کیا جانے لگا، شریعت کو حقیقت کا چھلکا بتایا گیا، انا الحق کا نعرہ بلند ہونے لگا، حسینوں کی صحبت میں رسائی حق کی راہ تلاش کی جانے لگی، سادہ رُخوں میں اللہ ہی کا رنگ دیکھا جانے لگا۔ توحید کے اس قسم کے پرستاروں کے خلاف حضرت مجدد الف ثانیؒ سے جو آواز اٹھائی تھی وہ برابر گونجتی رہی، خود اُن کے صاحبزادے خواجہ معصوم سرہندیؒ جو اُن کے علوم و معارف کے بہت بڑے شارح تھے، بلکہ انہی کے نقشِ قدم پر چل کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تلقین کر کے مسلمانوں کی مذہبی زندگی کی تجدید اور اصلاح میں لگے تھے۔

اورنگ زیب کا فطری اور ذہنی رجحان انہی کی تعلیمات کی طرف تھا، اس لئے وہ حضرت خواجہ معصوم سرہندیؒ کے حلقۂ بیعت میں داخل ہو گیا، ان سے تعلیم پا کر اپنی ایمانی اور روحانی بصیرت میں جلا بھی پائی، حضرت خواجہ معصوم نے اپنے ایک صاحبزادے شیخ سیف الدین کو امر بالمعروف اور نہی المنکر کی تلقین کے لئے عالم گیر کے پاس بھیج دیا تھا، شیخ سیف الدین اپنے والد بزرگوار کی طرح کمالات صوری اور معنوی کے حامل ہو گئے تھے، عالم گیر ان کو بہت محبوب اور مقرب رکھنے لگا تھا۔

عالمگیر نے حضرت خواجہ معصوم سے بارگراں بار جہاں داری اور اپنے حسنِ خاتمہ کے لئے دعا کرنے کی درخواست کی تھی، جس پر وہ تحریر فرماتے ہیں کہ اس کے لئے پوری ہمت کے ساتھ برابر دعائیں کرتے رہتے ہیں اور پھر اس کو یہ لکھ کر اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ "چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے آپ کو اس بارے میں خوف عنایت فرمایا ہے، اس لئے بہت کچھ امیدیں ہیں، یہ خوف کارہائے مشکل کو آسان کر دیتا ہے، کیونکہ حدیث میں ہے کہ خوف دنیا اور خوف آخرت کسی شخصِ واحد کے اندر جمع نہیں ہوتے، یعنی اگر کسی کے اندر خوف آخرت ہو گا تو خوف دنیا سے محفوظ رہے گا۔"

عالم گیر نے حضرت خواجہ معصوم کے صاحبزادے شیخ سیف الدین کی تعریف لکھی تھی، اس پر حضرت خواجہ معصوم تحریر فرماتے ہیں "فقیر زادہ کی ادائیگیٔ خدمت اور لوازم خیر خواہی آپ کی نظر میں پسندیدہ ہیں، یہ بات اس کے لئے موجب سعادت اور باعث امتیاز ہوئی، فقیر زادہ جو کہ صاحب کمالات صوری اور معنوی ہے، عزلت اور عدم اختلاط کی عادت رکھتا تھا، چند آدمیوں میں بیٹھنے کی بھی عادت نہ تھی، لیکن محض خیر خواہی نے اس کو اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ آپ کے پاس گیا ہے۔

پھر اپنے صاحبزادے کے توسل کو محض عنایات ربانی کا ایک سبب بتاتے ہیں، اس لئے اورنگ زیب کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں "مربی حقیقی اللہ تعالیٰ ہے، وہ خود درد و طلب دیتا ہے اور اپنی طلب میں دوڑاتا ہے اور خود راہ وصل کھولتا ہے۔"[1]

---

[1] بزم تیموریہ جلد سوم ص ۱۸

"از ما و شما بہانہ برساختہ اند"
ہمیں اور تمہیں صرف بہانہ بناتے ہیں

مدارس و مکاتب

عالم گیر کو جو علم و ہنر سے شغف تھا، اس کا اقتضا یہ تھا کہ وہ اپنی سلطنت میں ہر ممکن صورت سے اس کی ترویج کرے، چنانچہ اس نے تمام شہروں اور قصبوں میں مدارس و مکاتب قائم کئے، لائق اساتذہ مقرر کئے اور طلبہ کو وظائف دیئے۔

گجرات میں جو مدارس قائم ہوئے اور وہاں کے طلبہ کو جو سہولتیں پہنچائی گئیں اس کا حال "مرآۃ احمدی" میں اس طرح درج ہے "دیوان صوبہ کے نام حکم صادر ہوا، چونکہ ممالکِ محروسہ کے تمام صوبوں میں یہ مقدس اور بلند فرمان نافذ ہو چکا ہے کہ ہر صوبہ میں مدرسین مقرر کئے جائیں، میزان سے لے کر کشاف تک کے طالب علموں کو صدر صوبہ کے استصواب رائے سے اور مدرسوں کی تصدیق کو دیکھ کر اس صوبے کے خزانچی کو تحویل سے وجہ معاش دی جائے، اس لئے اس وقت احمد آباد، پٹن اور سورت میں تین مدرسین کا اور صوبۂ احمد آباد میں ۴۵ طالبان علم کا اضافہ کیا گیا، گجرات کے بوہروں کے لئے بھی اساتذہ مقرر کئے تا کہ ان کی صحیح تعلیم ہو، ان کے ماہانہ امتحان کے نتائج براہ راست اس کے پاس بھیجے جاتے تھے۔[1]

معمولات زندگی

ہندوستان کے اس مسلمان بادشاہ کی جو قلمی تصویر مآثر عالم گیری کے مؤلف نے پیش کی ہے اس کو ہم ہو بہو ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ (بحوالۂ بزم تیموریہ)

حضرت خلد مکانی اپنی فطری سعادت اندوزی کی وجہ سے مذہبی احکام و شعائر کے بے حد پابند تھے، قبلۂ عالم حنفی المذہب سُنّی تھے اور اسلامی فرائض خمسہ کی پابندی، نیز ان کے اجراء میں بے حد

---

[1] مرآۃ احمدی بحوالۂ بزم تیموریہ ص ۸۹ ج ۳

کوشاں رہتے تھے، حضرت ہمیشہ باوضو رہتے اور کلمۂ طیبہ نیز دیگر اوراد و وظائف ہر وقت زبان پر جاری رہتے تھے، نماز اول وقت مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا فرماتے اور تمام نوافل و سنن کو بہ صد خلوص و حضور قلب سے ادا فرماتے، ایام بیض کے روزوں کے بے حد پابند تھے اور ہفتے میں دوشنبہ اور پنج شنبہ اور جمعہ کو صائم رہتے تھے، جمعہ کی نماز بھی مسجد میں تمام مسلمانوں کے ساتھ ادا فرماتے، متبرک شب ہائے اسلامی میں بیداری و عبادات میں بسر فرماتے، اور انوار فیض الٰہی سے چراغ دین و دولت ہو کر اپنی دینی شعاع سے اہل علم کو منور فرماتے تھے، قبلۂ عالم حق طلبی کے شیدائی تھے، حضرت کا معمول تھا کہ دولت خانہ کی مسجد میں تمام رات اہل اللہ کے ساتھ سرگرم گفتگو و ذکر رہتے اور خلوت میں کبھی تکیہ مسند پر جلوس نہ فرماتے تھے۔

زکوٰۃ شرعی ادا کرنے میں خاص اہتمام فرماتے اور قبل جلوس جو زکوٰۃ اپنی ضروریات زندگی کے حساب میں سے ادا فرماتے، اس کے علاوہ عہد حکومت میں مصارف ذاتی کے لئے جو چند مواضع خاص فرمائے تھے ان کی زکوٰۃ بھی خود ادا فرماتے اور اولاد و احفاد کو بھی تاکید فرماتے کہ نصاب زکوٰۃ کامل طور پر ادا فرمائیں، رمضان کا مہینہ ادائے صوم و پابندی سنن وتراویح وغیرہ عبادات دینی میں بسر ہوتا تھا، ماہ صیام میں دو پہر رات گزرنے پر بیدار ہو کر علماء اور اولیاء کے ساتھ ذکر و عبادت میں مشغول رہتے تھے۔

رمضان کے اخیر عشرہ میں مسجد میں اعتکاف فرماتے، حج بیت اللہ جس کے ادا کرنے کے لئے بے حد مشتاق و گرویدہ تھے، اگرچہ بظاہر تو ادا نہ فرما سکے، لیکن اس کا کافی تدارک فرماتے اور حجاج کے ساتھ جو خاص رعایتیں کی جاتی تھیں ان کو نگاہ میں رکھنے کے بعد یہ امر یقینی ہے کہ خلد مکانی ہر سال حج کبریٰ کا ثواب حاصل فرما لیتے تھے۔

اپنے عہد معدلت میں ہر سال اور کبھی کبھی دوسرے اور تیسرے سال کے بعد حرمین شریفین کے زائرین و مجاورین کے لئے رقم کثیر ارسال فرماتے اور حجاج کا ایک گروہ کثیر بادشاہ کی نیابت میں طواف حج و سلام رسانی وغیرہ خدمات عبادت میں ہمیشہ مصروف رہتا۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت کی ذات پاک تمام صفات حسنہ کی جامع تھی، قبلۂ عالم نے ابتدائے سن تمیز سے تمام مکروہات و محرمات سے شدید پرہیز فرمایا اور منکوحہ عورتوں کے سوا کسی غیر محرم کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

بادشاہ دین پناہ کی مجلس میں کبھی غیبت و کذب کا چرچا نہیں ہوا اور حاضرین دربار کو حکم تھا کہ اگر کسی شخص کا عیب بیان کرنا ناگزیر ہو جائے تو اس کو ایسے مناسب الفاظ میں بیان کریں کہ گفتگو عیب جوئی میں نہ داخل ہونے پائے۔

بادشاہ رعیت نواز نے کبھی کوئی ایسا حکم صادر نہیں فرمایا جو رفاہ عام کے منافی ہو اور کبھی ایسے فعل کے مرتکب نہیں ہوئے، جو مخلوقِ خدا کی پریشانی کا باعث ہوا ہو، زنان بازاری اور دیگر فواحش کے شیدائی دارالحکومت سے خارج کر دئے گئے تھے اور تمام ممالکِ محروسہ میں اسی قسم کے احکام جاری تھے، احتساب کا محکمہ قائم تھا اور عاملان احتساب ہر شخص سے باز پرس کرتے تھے اور تمام ممالک محروسہ میں سلطنت کی وسعت کے باوصف احکام شرعی جاری و نافذ تھے۔

قبلۂ عالم نے کبھی اپنے نفس سے مغلوب ہو کر محض ذاتی بغض و عناد کی وجہ سے کسی فرد کو قتل نہیں کرایا اور نہ کسی غیر کو اس سنگین جرم کے ارتکاب کی ہمت ہوئی، جہاں پناہ اپنی قدردانی و پایہ شناسی سے سادات علماء اور اولیاء کی تعظیم و تکریم کرتے تھے اور اسی طرح اپنے فیض باطن سے بہترین طریقے پر اہل علم کی رہنمائی کا فریضہ ادا فرماتے تھے۔

غرض کہ حضرت کے عہد معدلت میں دین متین کا آوازہ بلند ہوا اور جس طرح ملک ہندوستان میں شریعت اسلامی کا کامل لحاظ رکھا گیا، اس کی نظیر فرماں روانِ سابق کے کارناموں میں قطعاً معدوم ہے۔[۱]

اورنگ زیب عالمگیر کے علمی کمالات

اورنگ زیب ایک وسیع النظر اور سلیم الفطرت عالم تھا اور زندگی کے آخری سانس تک کتابوں سے محبت کرتا رہا، وہ ایک مشغول حکمراں ہونے کے باوجود قلیل فرصت کو عربی کی فقہی اور مذہبی کتابوں کے مطالعہ میں شوق سے گزارتا اور پرانے اور نادر مخطوطات مثلاً نہایہ، احیاء العلوم اور دیوان صائب کو کتابوں کے ایک کامل عاشق کی ہوس سے ڈھونڈتا تھا، اس کے کثیر رقعات اس کی فارسی شاعری اور عربی ادب پر قدرت کی دلیل ہے، کیونکہ وہ ہمیشہ اپنے خط کو مناسب اشعار و اقتباسات سے مزین کرتا ہے، عربی اور فارسی کے علاوہ ترکی اور ہندی بھی آزادی کے ساتھ بول سکتا تھا، یہ اس کی جودتِ طبع اور سرپرستی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے پاس ہندوستان میں مسلمانوں کے قانون کا سب سے بڑا خلاصہ فتاویٰ عالمگیری ہے جو نہایت مناسب طور پر اسی کے نام کے ساتھ منسوب ہے، اور جس نے بعد کے عہد میں ہندوستان میں اسلامی نظام عدل کو واضح طور پر آسان کر دیا ہے۔

اورنگ زیب کی تعلیم لائق اور قابل اساتذہ کی نگرانی میں ہوئی، مولانا سید قنوجی ریاضی اور ادب

[۱] بزم تیموریہ جلد سوم ص ۲۳

کے ماہر تھے، عالم گیر نے امام غزالی کی اکثر کتابیں خصوصاً احیاء العلوم انہی سے پڑھی، تخت پر جلوہ افروز ہونے کے بعد بھی عالم گیر نے ان سے استفادہ جاری رکھا اور ہفتہ میں تین روز اس کے یہاں علمی مجلس ہوتی، جس میں مولانا محمد قنوجی ضرور شرکت کرتے، فتاویٰ عالم گیری کی تدوین میں بھی وہ شریک رہے، اورنگ زیب کو علوم دینیہ سے فطری رغبت تھی، لائق اور فاضل اساتذہ کی نگرانی میں ان علوم سے اس کا شغف اور بھی زیادہ بڑھا، اسی کو مآثر عالم گیری کا مصنف ان الفاظ میں پیش کرتا ہے "قبلۂ عالم کے کمالات کسبیہ کا عظیم الشان کارنامہ علوم دینیہ یعنی فقہ و تفسیر و حدیث کی تحصیل ہے، جہاں پناہ کو حضرت امام غزالی کی تصنیفات، شیخ شرف الدین منیری کے ملفوظات اور شیخ زین الدین و قطب الدین محی الدین شیرازی کے رسائل سے خاص شوق تھا اور یہ کتابیں اکثر مطالعہ میں رہتی تھیں۔

اورنگ زیب کا حفظِ قرآن

اورنگ زیب حافظ قرآن بھی تھا، اور یہ سعادت دور اول کے تیموری بادشاہوں میں صرف اسی کو حاصل تھی اور سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس نے کلام پاک اس وقت حفظ کیا جب وہ اپنی عمر کے تینتالیسویں سال میں تھا اور یہ دولت صرف ایک سال میں حاصل کرلی، ۱۰۷۱ھ میں حفظ کرنا شروع کیا اور ۱۰۷۲ھ میں ختم کیا، "سنقرءك فلا تنسى" سے ابتدا کی اور "لوح محفوظ" سے اختتام کی تاریخ نکلتی ہے، اورنگ زیب کے ایک درباری شاعر نے اس موقع پر یہ شعر کہا۔ [1]

تو حامیٔ شرع و حامی تو شارع
تو حافظ قرآں و خدا حافظ تو

اورنگ زیب عالم گیر ۱۶۵۸ء میں تخت نشین ہوا اور ۱۷۰۷ء میں دنیائے فانی کو خیر باد کہا، تقریبا پچاس سال تک کامیاب حکومت کی، اس کے بعد اس کے لڑکے یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔

یاد کرتا ہے زمانہ ان انسانوں کو
روک دیتے ہیں جو بڑھتے ہوئے طوفانوں کو

سلاطین مغلیہ کا تجزیہ اور تبصرہ

تیموری سلاطین رزم و بزم دونوں میدانوں کے مرد تھے، وہ جس درجے کے فاتح اور کشور کشا تھے اس درجے کے علم پرور اور ادب نواز بھی، وہ ترکی اور فارسی دونوں میں اور آخری دور کے بادشاہ اردو میں

بھی کمال اور شعر و ادب کا نہایت بلند اور ستھرا ذوق رکھتے تھے۔

ان کے دور میں ہنگامۂ کارزار کے ساتھ علم و ادب کی محفل بھی گرم تھی، ان کا دربار ہر فن کے اصحاب کمال اور علماء، شعراء کا مخزن تھا اور ان کی سرپرستی میں، بہت سے علمی و ادبی کام انجام پائے۔

اردو زبان کی ترقی میں تیموریوں کا بڑا حصہ ہے، اخیر میں آنے والے محمد شاہ اور شاہ عالم اور بہادر شاہ ظفر کی اردو شاعری مشہور ہے۔

"اورنگ زیب ایک وسیع النظر اور سلیم الفطرت عالم تھا اور زندگی کی آخری سانس تک کتابوں سے محبت کرتا رہا، وہ ایک مشغول حکمراں ہونے کے باوجود اپنی فرصت کو عربی کی علمی اور مذہبی کتابوں کے مطالعہ میں شوق سے گزارتا اور اس کے کثیر رقعات اس کی فارسی شاعری اور عربی ادب پر قدرت کی دلیل ہے، کیونکہ وہ ہمیشہ اپنے خط کو مناسب اشعار و اقتباسات سے مزین کرتا ہے، عربی اور فارسی کے علاوہ ترکی اور ہندی بھی آزادی کے ساتھ بول سکتا تھا، یہ اسی کی جودت طبع اور سرپرستی کا نتیجہ ہے آج ہمارے پاس ہندوستان میں مسلمانوں کے قانون کا سب سے بڑا خلاصہ فتاویٰ عالم گیری ہے جو نہایت مناسب طور پر اسی کے نام کے ساتھ منسوب ہے اور جس نے بعد کے عہد میں ہندوستان میں اسلامی نظام عدل واضح طور پر آسان کردیا ہے" (اورنگ زیب جلد ۵، از جادو ناتھ سرکار) یہ الفاظ اورنگ زیب کے اس سوانح نگار کے ہیں جس نے اس کے خلاف تعصب اور عداوت کا اظہار کرنا اپنی زندگی کا واحد اور معنی خیز مقصد قرار دیا ہے، مگر اورنگ زیب کے علمی کمالات کے لئے مذکورہ بالا تعریفی کلمات بادل ناخواستہ شاید اس لئے لکھ دیے گئے ہیں کہ اس عظیم المرتبت اور جلیل القدر فرماں روا کے آفتاب علم پر خاک ڈالنے کی کوشش بے سود ہوتی۔ [1]

آخر میں ہندو مورخوں کی تحریروں کے اقتباسات پیش کرتے ہیں، جنہوں نے اپنی رواداری، فراخ دلی اور وسیع المشربی سے کام لے کر مغلوں کی حکومت پر عام تبصرہ کیا ہے، اس سے حکمرانوں کی مذہبی اور سیاسی رواداری دونوں عیاں ہوں گی۔ بحوالہ ہندوستان کے عہد ماضی میں ص ۲۹۰۔

پروفیسر رام پرساد کھوسلا اور مغل حکومت

پروفیسر رام پرساد کھوسلا ایم۔اے پنجاب بی۔اے پنجاب کے رہنے والے تھے، اور چند یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر تھے، تاریخ ہند پر ان کی کتاب "موغل کنگ شپ اینڈ نوبلٹی" ۱۹۳۴ء

میں انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوئی تھی، اس کے خاتمہ میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کے اقتباسات ناظرین کے ملاحظہ کے لئے ذیل میں درج ہیں:

فیض رساں بادشاہت

مغلوں کی بادشاہت ہندوستان کے ازمنۂ وسطیٰ کے لئے بیّن طور پر فائدہ مند تھی، ان کی حکومت مطلق العنان ضرور تھی، لیکن انہوں نے اس ملک کے قدیم حقوق میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی، ان کی بادشاہت کے عیوب اپنی جگہ پر ہیں اور کوئی مطلق العنان حکومت کلیتاً باعثِ رحمت نہیں ہو سکتی، لیکن مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مغلوں کی حکومت اپنی شان و شوکت کے ساتھ اس زمانے کے لئے بالکل مناسب تھی اور اپنی خوبیوں ہی کی وجہ سے یہ پرشکوہ حکومت ایک طویل مدت تک قائم رہی۔ اس خاندان میں مسلسل چھ ایسے بادشاہ گزرے ہیں جن کی شخصیتیں بہت اعلیٰ تھیں، عام طور پر ان کی حکومت میں رحم دلی اور نرمی تھی، کبھی انہوں نے فوجی قوت کو رعایا کی فلاح و بہبود سے لاپرواہ ہو کر استعمال نہیں کیا، وہ کبھی لوگوں کے نجی معاملات میں دخل نہیں دیتے تھے، ملک کے رسم و رواج کو کسی قانون کے ذریعہ پس پشت نہیں ڈالتے تھے، نظری طور پر ان کی حکومت مطلق العنان ضرور تھی، لیکن عملی طور پر بڑی ہی فیض رساں تھی۔

قیامِ امن

پورے ملک میں ایک ایسا دبدبہ قائم تھا کہ دور دراز صوبوں کے حکام بھی ان کے خلاف سر اٹھانے کی جرأت مشکل ہی سے کرتے تھے۔ مغلوں کے زمانہ میں جب کہیں بدامنی ہوتی تو سختی سے روک دی جاتی تھی، اس عہد کے حکمرانوں نے امن و امان قائم کر کے ملک کو کمزور حکومت اور متزلزل نظام حکومت کی خرابیوں سے بچائے رکھا، ان کو قوت و اقتدار کی ہوس ضرور تھی، لیکن اسی کے ساتھ وہ رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے بھی برابر کوشاں رہے، اگر امرار کو شاہانہ سرپرستی میں ترقی ہوتی تو ادنیٰ درجے کے لوگوں کو بھی شاہانہ عنایتوں کی بدولت خوش حالی نصیب ہوئی۔

کاشت کاروں کی محافظت

حکومت کی جانب سے زراعت کی ترقی کے لئے بڑی کوشش اور نگرانی کی جاتی، آمدنی کا بڑا حصہ زمین سے حاصل ہوتا تھا، اس لئے کاشت کاروں کی فلاح و بہبود کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا، جب کسی

جانے سے فوج گزرتی تو وہاں کی رعایا کی حفاظت کا پورا سامان کیا جاتا تھا، عبدالحمید لاہوری کا بیان ہے کہ شاہجہاں ۱۶۳۳ء میں لاہور جا رہا تھا تو اس نے منتظموں کو حکم دیا کہ وہ تیر انداز لے کر راستہ کے ایک جانب کی حفاظت کرے اور میر آتش کو بندوقچیوں کے راستہ کی دوسری سمت متعین کیا، تا کہ شاہی لشکر کھیتوں کی فصل کو نقصان نہ پہنچا سکے، لیکن یہ بھی احتمال تھا کہ اس انتظام کے باوجود فصل کو کچھ نہ کچھ نقصان ضرور پہنچ جائے گا، اس لئے پہلے ہی سے داروغہ مشرف اور امین مقرر کر دیئے تھے کہ عالی اور ایک ہزار سے کم کے جاگیرداروں کے نقصان کا معاوضہ دیا جائے، ایک بار شاہی فوج ۱۶۳۹ء میں قندھار کی طرف جا رہی تھی جس سے غزنی میں کھیتوں کو بڑا نقصان پہنچا، چنانچہ وہاں کے کاشت کاروں کو اس کے معاوضہ میں دو ہزار اشرفیاں دی گئیں، ہر بادشاہ کاشت کاروں کی بڑی پاسداری کرتا تھا، کیونکہ انہی پر حکومت کی اصل آمدنی کا انحصار تھا۔

علوم کی سرپرستی

ملک میں بڑے بڑے کتب خانے بھی تھے، جب بابر کی فوجوں نے لاہور کے پاس قلعہ میں داخل ہو کر اس کو لوٹنا شروع کیا تو بابر نے وہاں کے کتب خانے کو بچالیا، اس کو علم نواز غازی خان نے قائم کیا تھا، ملک میں ماہرین فن اور شعرار کی کثرت اس کا ثبوت ہے کہ مغل بادشاہ ان فنون کی جانب سے کبھی غافل نہیں رہے، جن کو امن و امان کے زمانہ میں فروغ پانا چاہئے تھا ان کو جنگ و جدال سے جب بھی فرصت مل جاتی تو رعایا کی حالت کے سدھارنے میں لگ جاتے، ان کی آمدنی وافر تھی، لیکن جو روپیہ بادشاہ کے ہاتھ میں آتا تھا وہ مختلف ذرائع سے پھر رعایا کے ہاتھ میں پہنچ جاتا تھا۔

عدل گستری

مغل حکمراں عدل کو ایک مقدس فرض سمجھتے تھے، اس زمانہ میں ایک ادنیٰ آدمی کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ براہ راست بادشاہ کی خدمت میں پہنچ کر انصاف کا طلب گار ہو، گو اس حق کے استعمال کا موقع کم آتا تھا، تاہم اس کی وجہ سے بے انصافی کی بڑی روک تھام رہتی تھی، بعض اوقات یہ حق رعایا کے لئے بڑی نعمت ثابت ہوتا تھا۔

مذہبی رواداری

عدل و انصاف میں اہتمام اور مذہبی رواداری کی پالیسی کی وجہ سے عوام ہمیشہ مطمئن رہے، اسلامی

Scanned by CamScanner

ریاستوں میں سیاست اور مذہب کا گہرا لگاؤ رہا ہے، لیکن مغلوں کی مذہبی رواداری کی وجہ سے کوئی خطرہ ہونے نہیں پایا اور کسی زمانہ میں یہ کوشش نہیں کی گئی کہ حکمران قوم کا مذہب محکوموں کا بھی مذہب بنایا جائے حتیٰ کہ اورنگ زیب نے بھی حصول ملازمت کے لئے اسلام کی شرط نہ رکھی تھی، مغلوں کے عہد میں Corporation Act یا Five miles Act کی کوئی مثال نہیں ملتی ہے، لوگوں کے ضمیر کے خلاف کوئی Act of Unifority جیسا قانون نہیں بنایا گیا۔ الزبیتھ کے زمانہ میں ایک ایسا قانون تھا جس کے ذریعہ جبری طور پر عبادت کی جاتی تھی، مغلوں کے زمانہ میں اس قسم کا جبر نہیں کیا گیا۔

BORTHO LANDAS SALARY جیسے قتل عام سے مغلوں کی تاریخ کبھی داغ دار نہیں ہوئی، مذہبی جنگ کی خوں ریزی سے یورپ کی تاریخ بھری ہوئی ہے، لیکن مغلوں کے عہد میں ایسی مذہبی جنگ کی کوئی مثال نہیں ملتی، بادشاہ مذہب اسلام کا محافظ اور نگہبان ضرور سمجھا جاتا تھا، لیکن اس نے کبھی اپنی غیر مسلم رعایا کے عقائد پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا، بابر سے لے کر اورنگ زیب کی تخت نشینی تک مغلوں کی تاریخ تنگ نظری اور فرقہ پرستی کی تلخی سے تقریباً پاک ہے۔

رعایا نوازی

مغلوں کے زمانے میں وقتاً فوقتاً جو شاہی اعلانات ہوتے رہے ان سے مغلوں کی رعایا پروری کا اندازہ ہوتا ہے اکبر کہا کرتا تھا کہ ظلم ہر شخص کے لئے ناجائز ہے اور بادشاہ کے لئے خصوصیت کے ساتھ اور بھی ناروا ہے کہ وہ تو دنیا کا محافظ ہوتا ہے، جہاں گیر اپنے تزک میں لکھتا ہے:

بہر نگہبانی خلق خدا — شب نہ کنم دیدہ بخواب آشنا
از بے آسودگی جملہ تن — رنج پسندم بہ تن خویشتن

اورنگ زیب نے شاہ جہاں کو اس کی معزولی کے بعد ایک موقع پر لکھا تھا کہ خداوند تعالیٰ اس کو حکومت عطا کرتا ہے جس میں رعایا کی حالت سدھارنے اور ان کی حفاظت کی صلاحیت ہوتی ہے، حکمرانی کے معنی لوگوں کی نگہبانی ہے نہ کہ تن پروری اور عیاشی۔

مغل اپنے اقوال کا ثبوت عمل سے دیتے تھے، انکا نظام سلطنت نہ صرف مستحکم بلکہ فائدہ مند بھی تھا، حکومت کا استحکام اور اقتدار لوگوں کے حق میں بہت ہی مفید تھا، اس کی بدولت ایک عرصہ تک ملک میں امن اور اقتصادی خوش حالی رہی۔

مغلوں کا طرز حکومت اگرچہ مطلق العنان تھا، لیکن اس زمانہ کے لئے یہی طرز حکومت موزوں تھا،

حکومت کے لئے عوام کی نمائندہ جماعت کی ضرورت سمجھی جاتی تھی، تمام لوگ اس طرز زندگی سے مطمئن تھے، جس کو وہ اپنی خواہش سے اختیار کر لیتے تھے، حکومت کا انحصار بظاہر فوجی قوت پر تھا، لیکن عملاً وہ نیفی بیان تھا، رعایا کی تمام پرانی چیزیں باقی رہنے دی گئیں، ان کے رسم ورواج کو قائم رکھا گیا، جس سے ملک کو ترقی ہوتی رہی اور لاقانونیت کو روکے رکھا، امن وامان پر زیادہ زور دیا گیا، مغلوں کی شخصی استبداد مستعدی اور ہوش مندی تھی، اس لئے وہ کامیاب رہا، ازمنۂ وسطیٰ میں اصلی خطرہ انارکی یعنی طوائف الملوکی کا پھیلنا تھا، کسی کے ہاتھ میں تمام اقتدار کا مرتکز ہو جانا خطرہ نہیں سمجھا جاتا تھا، مغلوں نے ملک میں تخریبی عناصر کو کبھی بڑھنے نہیں دیا، قانون کا اقتدار اعلیٰ کامیابی کے ساتھ ہر حال میں برقرار رکھا گیا، گو زیادہ تر بادشاہ کی خواہش ہی کا نام قانون ہوتا ہے لیکن لوگوں نے اس زمانہ کے طرز حکومت کو آسانی سے قبول کر لیا تھا جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ طرز ان کے سیاسی خیالات اور رجحانات کے مطابق تھا، اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مغل مطلق العنان ضرور تھے، لیکن اس کے بڑے مدبر اور سیاست داں تھے۔

ڈاکٹر پی۔ سرن اور مغل حکومت

بنارس ہندو یونیورسٹی کے سابق پروفیسر ڈاکٹر پی۔ سرن ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی نے اپنی مشہور کتاب "دی پروونشل گورنمنٹ آف دی موغلز" میں مغلوں کے نظام عدل اور پولیس کے انتظامات پر بڑا سیر حاصل تبصرہ کیا ہے، اس کے کچھ اقتباسات درج ذیل ہیں:

مغل حکمرانوں کی عدل پسندی

مغل بادشاہوں نے اپنے نظام عدل سے عوام کو پورے طور سے مطمئن کر رکھا تھا، وہ دیوان عام میں عوام کی شکایت کو سنتے اور انصاف کرنے کی خاطر روزانہ دربار منعقد کرتے، انصاف کا طریقہ اتنا آسان تھا کہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی بادشاہ کے پاس پہنچ سکتا تھا، جو بھی چاہتا دربار عام کے سامنے حاضر ہو کر خود اپنا استغاثہ پیش کر دیتا، دربار کے عہدے دار اس کو لے کر بادشاہ کے سامنے پیش کر دیتے، بادشاہ اس کو پڑھوا کر سنتا، مدعی سے جرح کرتا پھر مناسب کارروائی کے لئے فیصلہ صادر کر دیتا۔ ابوالفضل کا بیان ہے کہ اکبر نے روزانہ ڈیڑھ پہر عدل وانصاف کے لئے وقت مقرر کر رکھا تھا، جہاں گیر اور بھی سخت تھا، وہ دو گھنٹے روزانہ عوام کی شکایتیں سنتا تھا، اس نے تو اپنے محل میں ایک زنجیر بھی لٹکا رکھی تھی، تاکہ ہر شخص کسی روک ٹوک کے بغیر براہِ راست اس سے فریاد کر سکے، یہ عدل پسندی اس کے اخلاص کی دلیل تھی، وہ اپنے تیرہویں سال جلوس میں جب احمد آباد گیا تو اس کا لحاظ خاص طور پر رکھا کہ شاہی لشکر کا کوئی

Scanned by CamScanner

فرد وہاں کے باشندوں پر ظلم نہ کرنے پائے، چنانچہ روزانہ تین گھنٹہ جھروکے میں بیٹھ کر مظلوموں کی فریاد سنتا اور ظالموں کو سزا دیتا تھا، احمد آباد میں وہ علیل ہو گیا تھا، لیکن علالت کے زمانہ میں بھی جھروکے کی نشست ختم نہیں کی، وہ ایسے موقع پر جسمانی راحت کو حرام سمجھتا تھا۔

اہم مقدمات کی سماعت کے لئے ہفتہ میں ایک دن مقرر تھا، اکبر ایسے مقدمات جمعرات کو، جہاں گیر منگل کو اور شاہ جہاں بدھ کے دن سنا کرتا تھا، یہ عدالت دیوان خانہ خاص میں منعقد ہوتی تھی اور وہاں صرف صدر یان عدالت مفتی، فقہاء، علماء اور بعض امراء طلب کئے جاتے تھے، برنیئر نے بھی مغلوں کے عدل و انصاف کی تعریف کی ہے۔ جب مغل بادشاہ سفر یا کسی مہم میں ہوتے اس وقت بھی ان کی عدالت برابر منعقد رہتی تھی، جب ان کا لشکر کوچ کرتا تھا تو اس کی نگہداشت بھی کرتے تھے کہ کسی کاشت کار کی کھیتی کو کوئی نقصان پہنچ نہ پائے، شاہ جہاں ایسے موقع پر کھیتوں کی حفاظت کے لئے عہدے دار مقرر کر دیتا تھا اور اگر کسی کی کھیتی کو نقصان پہنچ جاتا تو اس کی سماعت کے لئے ایک خاص عدالت منعقد کی جاتی۔

پنچایتی نظام

عدل و انصاف کا جو نظام تھا اور اس کی جو سہولتیں حاصل تھیں اس کی وجہ سے مقدمہ کی تعداد زیادہ ہونے نہ پائی تھی، اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ گاؤں کا پنچایتی نظام بدستور سابق قائم رکھا گیا تھا، برطانوی عہد کے حکام نے بھی اس کی تصدیق کی ہے کہ گاؤں میں انیسویں صدی عیسوی تک پنچایتی عدالتیں برابر کام کرتی تھیں، چھوٹے چھوٹے قضیے انہی عدالتوں میں طے پا جاتے تھے، اس لئے آج کل کی طرح بڑی عدالتوں میں مقدمات کا انبار نہ لگنے پاتا تھا، گاؤں کی پنچایتوں میں پوری دیانت اور غیر جانب داری سے جھگڑے چکا دیئے جاتے تھے اور فریقین کو مالی تباہی میں مبتلا نہ ہونا پڑتا، گو ان کو اس کا پورا اختیار تھا کہ وہ اپنے مقدمات کی اپیل اونچی عدالتوں میں کریں۔

مقدمات کی کمی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ ان کا فیصلہ جلد سے جلد کر دیا جاتا تھا اور پرگنوں کی عدالتوں میں جو مقدمات پیش ہوتے ان کے لئے فریقین کو لامتناہی مدت تک انتظار نہ کرنا پڑتا تھا۔

عدل نوازی کی اعلیٰ مثالیں

مغل بادشاہ منصفانہ فیصلہ کرنے میں بہت سخت تھے، اگر مجرم کوئی بڑا عہدے دار یا بادشاہ کا رشتہ دار بھی ہوتا تو بھی اس کو سخت سے سخت سزا دینے میں تامل نہ کیا جاتا تھا اور غلط قسم کے وقار اور رعب کو انصاف میں حائل ہونے نہیں دیا جاتا تھا، اور ہر حالت میں حکومت کی نیک نامی کا لحاظ رکھا جاتا تھا، مغل

حکمران عوام کا اعتماد حاصل کر کے اپنا وقار قائم کرنا زیادہ بہتر سمجھتے تھے، وہ بے جا رعب بٹھانے کے قائل نہیں تھے، ان کو جب کسی حاکم کے ظلم اور غیر منصفانہ رویہ کی خبر ملتی تو اس کو سخت سزا دینے میں مطلق تامل نہیں کرتے، تمام مغلیہ سلاطین کا یہی طریقہ رہا، پادری مونسریٹ نے عہد اکبری کا حال لکھا ہے کہ جب کوئی حاکم غلطی یا بری مثال پیش کرتا تو بادشاہ اس سے پورا مواخذہ کرتا، جن باتوں سے عوام کے اعتماد کو نقصان پہنچتا ان کے انسداد میں بادشاہ کوئی رو رعایت نہ کرتا، اس لئے تمام حکام اس کی سختی سے خوف زدہ رہتے اور اس کے حکم کی تعمیل پوری تندہی سے کرتے، بادشاہ کو انصاف اور عوام کے حقوق کا بڑا لحاظ تھا، اگرچہ جہاں گیر اور شاہ جہاں نے حکومت کے نظم و نسق میں اکبر جیسی مستعدی ظاہر نہیں کی، لیکن عدل پروری میں کسی قسم کی کمی نہیں کی، اس میں شک نہیں کہ اچھی سے اچھی حکومتوں میں بھی بے انصافی، بدمعاملگی کی مثالیں پائی جاتی ہیں، کوئی حکومت برائیوں کا پورا استیصال نہیں کر سکتی، لیکن مغلوں کے عہد میں جب نظم و نسق میں کچھ انتشار بھی پیدا ہو گیا تھا اس وقت بھی عوام کے مفاد کی پوری نگہداشت کی گئی، اس کی شہادت ملکی اور غیر ملکی اہلِ قلم کی تحریروں سے ملتی ہے، ۱۵۸۴ء میں حاجی ابراہیم سرہندی گجرات کا صدر اور قاضی تھا، احمد آباد کے لوگوں نے اس کے خلاف درخواست دی، ملا عبدالقادر بدایونی کا بیان ہے کہ حاجی رشوتیں لیا کرتا تھا، جب اس کی تفتیش کی گئی اور جرم صحیح ثابت ہو گیا تو قاضی کو نہ صرف برطرف بلکہ رنتھور کے قلعہ میں قید بھی کر دیا گیا۔

قانونی کارروائی

بادشاہ کے سامنے کوئی مقدمہ پیش کیا جاتا تو وہ پہلے مدعی کی درخواست پڑھوا کر سنتا، پھر فریقین کو طلب کر کے دونوں کے بیانات کی سماعت کرتا، اس کو سننے کے بعد قانونی مشیروں کے مشورے سے فیصلہ صادر کرتا، فوج داری کے مقدمات میں قاضی اور صوبے کے ناظم بھی یہی طریقہ اختیار کرتے تھے، دیوانی کے مقدمات میں تحریری ثبوت کے لئے کاغذات پیش کئے جاتے جن کی بڑی اہمیت ہوتی تھی، شہادت دینے اور لینے کے مختلف طریقے تھے، یا گواہ پیش کئے جاتے یا کاغذات سے ثبوت حاصل کیا جاتا، جسمانی اذیت کے جھوٹ اور سچ کا اقرار کرایا جاتا، اگر گواہ عیسائی ہوتا تو وہ انجیل ہاتھ میں لے کر حلف اٹھاتا، مسلمان کے ہاتھ میں کلام پاک دیا جاتا، اور ہندو گائے پر ہاتھ رکھ کر شہادت دیتے، اکبر نے مقدمہ کی تفتیش کے سلسلہ میں کچھ اصول مقرر کئے تھے، جس کی پابندی اس کے جانشینوں کے عہد میں بھی کی گئی، محکمۂ انصاف کے عہدے داروں کو ہدایت تھی کہ وہ شہادت اور بیانات پر کلی طور پر بھروسہ نہ کریں، بلکہ اپنے فہم و عقل سے بھی کام لیں، اگر ان کے خیال میں صحیح صورتِ واقعہ معلوم کرنے کا کوئی

Scanned by CamScanner

اور مناسب ذریعہ ہوتو اس کو بھی عمل میں لائیں۔

مغلوں کے پورے نظام سلطنت کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ ظاہر ہوگا کہ اس عہد میں ہندوستان کی حکومت شاندار حکومتوں میں سے تھی، اور اس کی تمام معاصر حکومتوں میں اس سے زیادہ وسیع اور مستحکم کوئی اور حکومت نہ تھی اور اس کے کارنامے صرف آرٹ اور کلچر ہی تک محدود نہیں تھے، بلکہ اس نے بڑی بڑی سیاسی شخصیتیں پیدا کیں، ہندو مسلمان دونوں کو متحد کیا، اس کی کارکردگی ایسی تھی جس پر فخر کیا جاسکتا ہے، اٹھارہویں صدی عیسوی میں سرجان شور بہت بڑا مدبر گزرا ہے جو حکومت کے نظم ونسق میں بڑا ماہر سمجھا جاتا تھا، اس کا بیان ہے کہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی برسر اقتدار ہوئی اس وقت صوبوں کے نظم ونسق میں ابتری تھی، لیکن اس کا جو نظام تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں کی حکومت استحکام اور دانشمندی کی مضبوط بنیاد پر قائم تھی، جس میں مختلف فرقوں کے حقوق کی پوری حفاظت تھی، ہندوؤں کے لئے قوانین انہی کے بنائے ہوئے تھے جن پر سختی سے عمل درآمد کرانے کی کوشش کی جاتی تھی اور حکومت کی جتنی واجب الادا آمدنی ہوتی وہ وصول کرلی جاتی تھی۔

مغلوں کا نظام حکومت ایک بڑا سیاسی تجربہ تھا جس کے اثرات موجودہ نظام حکومت میں بھی باقی ہیں، اس زمانے میں جو سیاسی تجربے ہوئے اور ان میں جو کامیابی اور ناکامیابی ہوئی وہ آئندہ نسلوں کے لئے سیاسی وراثت بنی، اور سب سے بڑا یہ سبق حاصل ہوا کہ حکومت وہی قائم رہ سکتی ہے جس کو لوگوں کا اعتماد اور محبت حاصل ہو، یہ دونوں چیزیں اس وقت حاصل ہوسکتی ہیں جب ملک میں امن اور خوش حالی ہو، اکبر نے اپنی پالیسی سے یہ سب کچھ کردکھایا، لیکن جب اس کی پالیسی پر عمل نہیں کیا تو حکومت کی بنیاد کمزور ہونے لگی، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس حکومت کی کامیابی حکمران کے تنہا اخلاق وکردار پر مبنی ہو اس کی ترقی پائیدار نہیں ہوسکتی، کیونکہ جب تک ایک اچھا حکمران ہے اس وقت تک نظم ونسق اچھا رہ سکتا ہے لیکن برے حکمران کے آجانے سے سارے نظام میں انتشار وخلل پیدا ہوسکتا ہے، مغل حکومت اسی کا نمونہ ہے، اگرچہ ان مغلوں نے خود بھی نظام قائم کیا تھا اس سے لوگوں کو غیر معمولی فائدہ ہوا اور اوپر کے نظم ونسق کی ابتری سے نیچے کے نظام میں کم سے کم خلل پڑا اور عام طور پر لوگ پولیس کے مظالم سے محفوظ رہے، چوروں اور ڈاکوؤں سے ان کو کم سے کم نقصان پہنچتا، آپس کے جھگڑوں میں ان کے ساتھ مناسب انصاف کیا جاتا، گاؤں کے مکھیا اور قانون گو ان کے حقوق کی پوری نگہداشت کرتے تھے، کسانوں اور کاشتکاروں کے لئے نہ ایسا نظام تھا اور نہ ماحول کہ وہ خواہ مخواہ تباہی اور بربادی کی طرف مائل ہوں جیسا کہ موجودہ دور میں ہے کہ مہاجن ان کو قرض لینے کی ترغیب دلاتا ہے، وکلاء ان کو مقدمہ بازی کی طرف مائل کرتے ہیں اور تاجروں کو فضول خرچی کے لئے آمادہ کرتے ہیں۔

شاہ عالم بہادر شاہ اول

بادشاہ اورنگ زیب کے بعد شاہ عالم بہادر شاہ اول کے نام سے تخت نشین ہوا۔ اورنگ زیب کی روح قفس عنصری سے پرواز ہوتے ہی تاریخ ہند کا رخ بدل گیا، ہمالیہ سے راس کماری تک پھیلی ہوئی سلطنت کے نظام کو قائم رکھنے کے لئے عالم گیری کا دل ودماغ چاہئے تھے مگر حکومت بدلنے کے ساتھ زمانہ بدلا اور تاریخ بھی بدل گئی، تخت طاؤس وہی تھا لیکن اس کے ہیروں کی خوش نمائی جاتی رہی تھی تیموری دربار وہی تھا لیکن اس کی رونق مٹ چکی تھی، ارباب عقل ودانش بھی موجود تھے مگر ان کی جودت طبع، ذہانت اور سیاست سے فائدہ اٹھانے والا کوئی نہ تھا، دیوان خاص کے کنگروں سے حسرت ویاس برسنے لگی، دیوان عام کی دیواروں پر افسردگی چھا گئی اور قلعۂ معلی سوگوار ہوگیا، معلوم نہیں یہ قضا وقدر کی مصلحت تھی یا عالم گیر کی اولاد کی پاداش، تیموری سلطنت اوج کمال پر تھی اس کے زوال کو روکنے کے لئے ایک آہنی قوت کی ضرورت تھی، مگر وہ قوت باقی نہ تھی، فطرت سرگرم کار ہوئی اور تیموری سلطنت کا وہی انجام ہوا جو روم، بابل اور نینوی کا ہو چکا تھا۔

عالم گیر کی دوررس نگاہیں اس نتیجہ پر پہنچ گئی تھیں، یہی وجہ ہے کہ وہ ایک لائق جانشین چھوڑنے کے لئے جس قدر مضطرب اور بے چین رہا کوئی اور حکمران نہ ہوا تھا، وہ اپنے لڑکوں کو نہ صرف میدان جنگ میں فنون سپہ گری، دربار میں رموز حکمرانی اور قلعۂ معلی میں لکھنے پڑھنے کی تعلیم دلاتا تھا، بلکہ ان کو اٹھنے بیٹھنے، رہنے سہنے اور بولنے، چالنے کے آداب خود سکھاتا تھا، بہر حال یہ اسی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ شاہ عالم بہادر شاہ نے ایام طفلی میں حفظ کلام اللہ کی سعادت حاصل کی اور آگے چل کر قرأت وتجوید کا ماہر ثابت ہوا، علم حدیث سے خاص دلچسپی رکھتا تھا، حدیث، فقہ، تفسیر وسلوک کی کتابیں برابر مطالعہ میں رکھتا تھا۔[1]

الغرض اسباب لیاقت موجود تھے اور تیموری سلطنت نہایت ہی اوج کمال پر تھی، مگر من جانب اللہ زوال کا فیصلہ ہو چکا تھا، لہذا ملک میں بغاوتوں کے ذریعہ اودے پور اور جودھپور کے راجاؤں نے سر اٹھایا، دوسری جانب سکھوں نے بغاوت کی، ان بغاوتوں کا قلع قمع کرکے سلطنت کا معاملہ قابو میں کرلیا تھا، مگر ۱۱۲۳ھ مطابق ۱۷۱۲ء میں بہادر شاہ اول نے پانچ سال حکومت کرکے داعئ اجل کو لبیک کہا۔

---

[1] بزم تیموریہ جلد سوم ص ۱۰۲

سلطان جہاں دار شاہ

بہادر شاہ کے انتقال کے بعد مغلیہ سلطنت کے اقبال کا آفتاب اور بھی تیزی سے ڈھلنے لگا، ابر بادلوں سے کبھی کبھی امید کی شعاعیں نکلتی بھی تھیں تو ان میں نور کے بجائے ظلمت نظر آتی تھی، تیموری دربار کا شیرازہ بکھر گیا، تدبر و سیاست میں انتشار آ گیا، بیرونی فتوحات کی جگہ صرف خانہ جنگیاں رہ گئی تھیں، میدان جنگ کی خون آشامیوں کے بعد دربار قائم بھی ہوا تو اس میں نہ اسلاف کی روایات تھیں، نہ ان کی متانت اور ان کا وقار، بہادر شاہ کے بعد جہاں دار شاہ تخت نشین ہوا، گو اس کی حکومت کی مدت صرف دس مہینے رہی، لیکن بوالہوسی اور ہولناکی نے شاہی دربار کی عزت و ناموس کو ایسا صدمہ پہنچایا کہ آئندہ تمام تیموری سلاطین کی حکومت محض تذلیل و تضحیک کی داستان بن کر رہ گئی۔[1]

سلطان فرخ سیر

جہاں دار شاہ کے بعد فرخ سیر بارھہ کے سیدوں کی امداد سے تخت نشین ہوا، لیکن دربار کی ریشہ دوانیوں اور آپس کی فتنہ انگیزیوں نے تباہی اور بربادی کی چنگاریوں کو اس طرح مشتعل کیا کہ سلطنت محض خاکستر ہو کر رہ گئی اور انہی سیدوں کے ہاتھوں مقتول ہوا، اس نے سات سال حکومت کی۔

سلطان محمد شاہ

محمد شاہ کے عہد میں سادات کے قتل کے بعد خانہ جنگیوں کی کمی نسبتاً ضرور رہی، لیکن اس کے طویل زمانہ میں وہ تمام سامان ایک ایک کر کے جمع ہونے شروع ہو گئے جو ایک عظیم الشان سلطنت کو نیست و نابود کرنے کے لئے ضروری ہیں، دربار میں اکبری اولوالعزمی کے بجائے شیشہ و پیمانہ کی بدمستی تھی، شاہجہانی شوکت و حشمت کی جگہ عسرت و یاس کی تصویر تھی اور عالم گیری جاہ و جلال کی جگہ بے بسی اور بے کسی کا عبرتناک منظر تھا، بادشاہ وقت اپنے امراء اور درباریوں کا آلۂ کار ہو کر رہ گیا تھا، خود غرض امراء میں

[1] بزم تیموریہ جلد سوم ص ۲۰۲

نیت کی پاکیزگی تھی، نہ مقصد کی یکجہتی، رہی سہی قوت نادر خان کی خوں ریزی، مرہٹوں کی غارت گری، روہیلوں کی سرکشی سے جاتی رہی۔

تیموریوں کی عظیم الشان حکومت کی بساط اب الٹنے کو تھی، صدیوں کا لگایا ہوا چمن ہمیشہ کے لئے ویران ہونے کو تھا اور ایک شاندار تہذیب و تمدن کا شیرازہ بکھرنے والا تھا، سلطنت کا دبدبہ اور حکومت کی شوکت جاتی ہی رہی، مغلیہ سلاطین اپنی زبان بھی کھو بیٹھے، دربار اور بازار میں فارسی کے بجائے اب ہندوستانی زبان کا اثر و اقتدار تھا، ایک حکمران قوم کے ہاتھ سے جب دولت گئی، حشمت گئی اور زبان بھی گئی تو پھر اس کے مٹنے میں کیا دیر تھی، صرف وقت کا انتظار تھا۔

انہی حالات میں محمد شاہ ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۸ء میں انتقال کر گیا اور اس کا لڑکا احمد شاہ تخت پر بیٹھا، لیکن ۱۱۶۷ھ مطابق ۱۷۵۴ء میں اس کو تخت سے اتار کر قید میں ڈال دیا اور معظم شاہ کے پوتے عالم گیر ثانی کے نام سے تخت نشین ہوا۔

سلطان عالم گیر ثانی

جب عالم گیر ثانی تخت پر بیٹھا تو اس کے قبضہ میں دوآبہ اور ستلج کے چند ضلع رہ گئے تھے، گجرات مرہٹوں کی پامالی میں تھا، بنگال، بہار اور اڑیسہ علی وردی خان کے جانشینوں کے تصرف میں تھا، اودھ میں صفدر جنگ کا پرچم لہرا رہا تھا، وسط دوآب میں بنگش حکمرانی کر رہے تھے، روہیل کھنڈ روہیلوں کے قبضہ میں تھا، پنجاب احمد شاہ درانی کو دے دیا گیا تھا، دکن میں نظام کی اولاد جکڑ رہی تھی، ان کے علاوہ یورپین طاقتیں علیحدہ اپنے قدم جما رہی تھیں، انہی حالات میں عالم گیر ثانی قتل کر دیا گیا اور خطرہ تھا کہ مرہٹے دہلی پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں، مگر احمد شاہ ابدالی پھر ہندوستان آیا اور پانی پت[1] کے میدان میں مرہٹوں کے تین لاکھ لشکر کا مقابلہ کیا، جس میں دو (۲) لاکھ مرہٹے مقتول ہوئے، جس سے مرہٹوں کی کمر ٹوٹ گئی، احمد شاہ چند دن دہلی میں قیام کر کے اور حکومت شاہ عالم ثانی کے حوالہ کر کے واپس چلا گیا۔

سلطان شاہ عالم ثانی

عالم گیر ثانی کے المناک قتل کے بعد شاہ عالم بادشاہ ہوا، پہلے وہ انگریزوں کا وظیفہ خوار رہا، پھر مرہٹوں کے ہاتھ لال قلعہ کے اندر ایک معزز قیدی بنا اور اس کے بعد غلام قادر روہیلہ کی سفاکیوں سے تیموری سلطنت کے فرماں رواں کا جو انجام ہوا وہ ارباب بصیرت کے لئے عبرت کا مقام ہے، اسی قلعہ معلی کے اندر جس کے مکینوں کی غضب آلود نگاہوں سے ہزاروں سرکش کانپ اٹھتے تھے خود اُن کی اولاد

[1] پانی پت کا واقعہ ۱۱۷۴ھ مطابق ۱۷۶۱ء میں پیش آیا۔

ایک ظالم سرکش کے پنجوں میں گرفتار تھی، اسی پر جلال دربار کا ایک اورنگ نشین جس کے اسلاف کی صولت و دبدبہ کے سامنے بڑے بڑے ارباب ثروت وحشمت سر عجز و نیاز جھکاتے تھے، ایک ستم ایجاد اور بے درد بانی کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے تھا، جن کی ہیبت کے سامنے ارباب دانش پلک مارنا بھی سوء ادب سمجھتے تھے، انہی کا ایک فرزند حرم دربار بے حس و حرکت پڑا تھا اور اس کے سینے پر ایک شقی القلب روہیلہ سوار تھا، مال و دولت کی تلاش میں حرم کی دیواریں کھودی جا رہی تھیں، نازنینان حرم کے پھول سے رخسار طمانچوں سے سرخ کئے جا رہے تھے، شہزادیوں کے دیدۂ تر سے خون کی نہریں رواں تھیں، آہ و بکا کے شور سے قلعۂ معلٰی کے در و دیوار گونج رہے تھے، عین اسی حالت میں ایک ظالم "جفاجو" اور کینہ پرور روہیلہ نے

ع نکالیں شاہ تیموری کی آنکھیں نوک خنجر سے (اقبال)

شاہ عالم کو موت نہیں آئی، وہ پھر بادشاہ بنایا گیا، لیکن وہ بادشاہ نہ تھا، ہو دنیا کے لئے عبرت کا درس تھا، شاہ عالم کے بعد اس کا لڑکا اکبر ثانی انگریزوں کا وظیفہ خوار ہو کر تخت نشین ہوا اور اس کے بعد اس کا بیٹا ابو ظفر بہادر شاہ ثانی ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں بادشاہ ہوا۔

شاہ ولی اللہؒ[1] کا حکومت مغلیہ کے دور احتضار میں مجاہدانہ وقائدانہ کردار

مرہٹہ گردی، جاٹ گردی، سکھ گردی اور نادر گردی کے ہوش ربا مصائب اور زلزلوں کے درمیان جو دلی کو زیروزبر کر کے رکھ دیتے تھے، صرف یہی نہیں کہ شاہ ولی اللہ مصائب وحوادث کے اس گرد و غبار بلکہ ان کی موسلادھار بارش کے درمیان زیر آسمان بیٹھے ہوئے تصنیف و تحقیق اور درس و تعلیم میں اس طرح منہمک تھے کہ ہوا کے تیز جھونکے سے زیر تسوید کتاب کا کوئی ورق نہیں الٹتا تھا، نہ بارش کا کوئی قطرہ اس کے کسی نقش کو مٹاتا تھا، بلکہ وہ ان حالات کو تبدیل کرنے، اس ملک میں مسلمانوں کے اقتدار کو دوبارہ واپس لانے اور ایک فرض شناس، حقیقت پسند، احکام شریعت پر عمل کرنے والی، عام شہریوں کی عزت و ناموس کے محافظ، انتشار انگیز طاقتوں کو ختم کرنے والی، مستحکم وخوش حال سلطنت کے قیام کے لئے بھی ساعی اور سرگرم تھے اور اس سلسلہ میں بھی وہ ایسا قائدانہ کردار ادا کر رہے تھے جو بڑے سے بڑا سیاسی مبصر ادا کر سکتا تھا جس کو تصنیف و تالیف اور درس و تحقیق سے ادنٰی مناسبت اور ذرہ برابر فرصت نہ ہو۔ شاہ صاحب کی اس جمعیت خاطر، ہمت واستقامت اور اولوالعزمی اور اس کے مقابلہ میں ملک کی زلزلہ انگیز فضا کو دیکھتے ہوئے اقبال کا یہ شعر حقیقت حال کی سچی تصویر معلوم ہوتا ہے۔

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ[2]

[1] تاریخ دعوت وعزیمت جلد ۵ ص ۲۹۴ [2] ایضاً

شاہ صاحب کا احساس اور اضطراب

شاہ صاحب جنہوں نے ابتدائے سن شعور میں اورنگ زیب عالم گیر کے دبدبۂ حکومت واقبال کے آثار دیکھے تھے اور اس سے پہلے کے قصے دہلی کے بزرگوں اور اہل خاندان سے سنے تھے، ان کی آنکھوں نے مغلیہ سلطنت کے عہد زوال اور فرخ سیر اور محمد شاہ کے زمانے کی بدنظمی، طوائف الملوکی، ریاستوں کی بدامنی، بلاتفریق مذہب وملت اہل ملک کی جان و مال، عزت و آبرو کا عدم تحفظ اور انسانی خون کی ارزانی، شعائر اسلام کی بے حرمتی اور مسلمانوں کی (جو چھ سو سال سے اس ملک پر حکومت کر رہے تھے) مجبوری اور بے بسی کا نظارہ دیکھا تو ان کا حساس ودردمند دل خون کے آنسو رویا اور خون کے یہ قطرے ان کے گوہر بار قلم سے ان خطوط کے صفحات پر جو انہوں نے اپنے زمانہ کے بعض اہل دول اور معتقدین کو لکھے ہیں ٹپک پڑے، یہاں اس کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں: نواب نجیب الدولہ کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"مسلمانان ہندوستان نے خواہ وہ دہلی کے ہوں خواہ اس کے علاوہ کسی اور جگہ کے کئی صدمات دیکھے ہیں اور چند بار لوٹ مار کے شکار ہوئے ہیں" "چاقو ہڈی تک پہنچ گیا ہے" "رحم کا مقام ہے"

ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"اگر غلبۂ کفر معاذ اللہ اسی انداز پر رہا تو مسلمان اسلام کو فراموش کر دیں گے اور تھوڑا ہی زمانہ گزرے گا کہ یہ مسلم قوم ایسی قوم بن جائے گی کہ اسلام اور غیر اسلام میں تمیز نہ کر سکے گی۔"

ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی جانب سے بعد سلام محبت مشام واضح ہو کہ نصرت مسلمین کے لئے یہاں دعا رکی جارہی ہے اور سروش غیبی سے آثار قبول محسوس ہوتے ہیں، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ہاتھ پر دینی جہد و جہاد کو زندہ کر کے اس کے برکات اس دنیا اور آخرت میں عطا فرمائے گا۔" "انہ قریب مجیب"

شاہ صاحب نے نواب نجیب الدولہ ہی کو احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان بلانے کے لئے خاص ذریعہ بنایا، ان کے نام براہ راست خط لکھنے کے علاوہ ان سے ہی خطوط لکھوائے اور ان کو بار بار تاکید کی، نواب نجیب الدولہ نے شاہ صاحبؒ کی وفات کے آٹھ سال بعد رجب ۱۱۸۴ھ مطابق ۱۷۷۰ء کو انتقال کیا، پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ:

"اس کی عدل گستری و بالغ نظری کا یہ واقعہ ہمیشہ تاریخ میں یادگار رہے گا کہ وہ جس وقت بستر مرگ پر آخری سانس لے رہا تھا تو اس نے اپنی فوجوں کو (جو اس کے ساتھ ہاپوڑ کے مقام پر تھیں اور گڑھ کا میلہ ہو رہا تھا) حکم دیا کہ گڑھ کے میلہ میں آنے جانے والے ہندو یاتریوں کے جان و مال کی پوری حفاظت کی جائے۔" (تاریخ دعوت وعزیمت جلد ۵ صفحہ ۲۹۴)

Scanned by CamScanner

شاہ صاحب نے احمد شاہ ابدالی کو نجیب الدولہ کی طرف سے بھی براہ راست ایک پرزور خط لکھا جو شاہ صاحب کی سیاسی بصیرت، دینی حمیت، اخلاقی جرأت اور زور انشاء کا آئینہ دار ہے۔ اس خط میں ہندوستان کی موجودہ صورت حال، اس کا تدریجی طور پر حکومت اس کے مختلف صوبوں کا نظم و نسق ملک کے مختلف نسلی و مذہبی گروہوں کی تعداد و طاقت کا تناسب، ان کے بارے میں مسلمان بادشاہوں کی سیاسی غلطیوں اور کمزوریوں، ان کا تدریجی طور پر طاقت پکڑ لینا اور اقتدار حاصل کرنا، اس سلسلہ میں مرہٹوں اور جاٹ کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور ان کے اقتدار، بار بار کے حملوں سے غربت اسلام اور مسلمانوں کی مظلومیت کا دل دوز نقشہ کھینچا گیا ہے اور اس باحمیت مسلمان قائد کو جو اس وقت ہندوستان سے لے کر ایران تک سب سے بڑی عسکری طاقت کا مالک تھا اس صورت حال کا مقابلہ کرنے اور سلطنت مغلیہ کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے اور ملک کی ذمہ داری سنبھالنے کا موقع دینے پر آمادہ کیا گیا ہے اور متانت کے ساتھ لکھا ہے:

"اس زمانہ میں ایسا بادشاہ جو صاحب اقتدار اور شوکت ہو اور لشکر مخالفین کو شکست دے سکتا ہو، دور اندیش و جنگ آزما ہو سوائے آنجناب کے کوئی اور موجود نہیں ہے۔"

آگے لکھتے ہیں: "ہم بندگان الٰہی حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شفیع بناتے ہیں اور خدائے عزوجل کے نام پر التماس کرتے ہیں کہ ہمت مبارک کو اس جانب متوجہ فرما کر مخالفین سے مقابلہ کریں، تا کہ خدا تعالیٰ کے یہاں بڑا ثواب جناب کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے اور مجاہدین فی سبیل اللہ کی فہرست میں نام درج ہو جائے، دنیا میں بے حساب غنیمتیں ملیں، اور مسلمان دست کفار سے خلاصی پا جائیں۔"

اسی خط میں انہیں سیاسی بصیرت اور حالات سے گہری واقفیت کی بنا پر ہندوستان کی ان نوخیز طاقتوں کے بارے میں جن کی کسی مقابل منظم طاقت کے نہ ہونے کی وجہ سے شجاعت و طاقت کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور ان کو ناقابل شکست سمجھا جاتا تھا، صحیح اندازہ پیش کیا ہے جو ایک تجربہ کار قائد اور سیاسی مفکر ہی پیش کر سکتا ہے۔ مرہٹوں کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:۔ "قوم مرہٹہ کو شکست دینا آسان کام ہے بشرطیکہ غازیان اسلام کمر ہمت باندھ لیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قوم مرہٹہ خود قلیل ہے لیکن ایک گروہ کثیر ان کے ساتھ ملا ہوا ہے، ایک گروہ میں سے ایک صف کو بھی اگر درہم برہم کر دیا جائے تو یہ قوم منتشر ہو جائے گی اور اصل قوم سیاسی شکست سے ضعیف ہو جائے گی، چونکہ یہ قوم قوی نہیں ہے اس لئے ان کا تمام تر حیلہ ایک کثیر فوج جمع کرنا ہے جو چیونٹیوں اور ٹڈیوں سے زیادہ ہو، دلاوری اور سامان حرب کی بہتات ان کے یہاں نہیں ہے۔"

شاہ صاحب کی ہدایت کے مطابق نجیب الدولہ نے احمد شاہ ابدالی کو جو خطوط لکھے پھر شاہ صاحب نے جو طویل و موثر خط براہ راست لکھا (جس کا کچھ اقتباس اوپر گزرا) وہ بے اثر نہیں رہا، احمد شاہ ابدالی نے ۱۱۷۳ھ مطابق ۱۷۵۹ء میں مرہٹوں کا زور توڑنے اور نجیب الدولہ اور شجاع الدولہ کی مدد کرنے کیلئے (جنہوں نے اس موقع پر سیاسی شعور اور اسلامی اتحاد کا ثبوت دیا تھا) ہندوستان کا قصد کیا، ایک سال ذیلی جنگوں اور جھڑپوں میں گزر گیا، بالآخر ۱۱۷۴ھ مطابق ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کو پانی پت کے میدان میں مرہٹوں اور افغانوں اور ہندوستانی اسلامی متحدہ محاذ کے درمیان وہ فیصلہ کن جنگ ہوئی جس نے ہندوستان کی تاریخ کا رخ بدل دیا اور مرہٹوں کو ہندوستان کے نئے ابھرتے ہوئے سیاسی نقشہ سے باہر نکال دیا، اس جنگ کا مختصر حال اور نتیجہ مولوی ذکاء اللہ صاحب مؤلف "تاریخ ہندوستان" کے الفاظ میں لکھا جاتا ہے:[1]

"لڑائی میں بڑا گھمسان ہو گیا مگر اب بھی مرہٹوں کا پلہ بھاری تھا، احمد شاہ نے اپنے بھگوڑے سپاہیوں کو گھیر کر قتل کرنے کا حکم سنایا اور یہ کہہ دیا جو بھاگے گا مارا جائے گا، اس کے بعد اس نے اپنی صف کو آگے بڑھنے کا حکم دیا، ایک سپاہ کو اپنے بائیں طرف دشمن کے بازو پر حملہ کا حکم دیا، اس تدبیر کا تیر نشانہ پر بیٹھا، قلب سپاہ میں بھاؤ بسواس راؤ گھوڑوں پر سوار لشکر کو لڑا رہے تھے، خنجر اور کھانڈے بازی ہو رہی تھی کہ یکایک خدا معلوم کیا ہوا کہ مرہٹوں کے لشکر کا قدم میدان جنگ سے اٹھ گیا، قدم کا تعاقب بڑے جوش و خروش سے ہر جانب میں پندرہ، پندرہ بیس بیس میل تک کیا اور مرہٹوں کو مار مار کر ڈھیر لگا دیا، جو مرہٹے ان دشمنوں کے ہاتھ سے بچ گئے ان کو گنواروں نے مار ڈالا، بسواس راؤ اور بھاؤ مارے گئے، جی سیندھیا کو کسی درانی نے چھپا رکھا تھا وہ بھی تلاش کرنے سے پکڑا گیا اور مارا گیا، ابراہیم خان گاردی بھی قید ہوا، ایک ہفتہ کی موت نے اس کے زخموں پر بھی مرہم رکھا، شمشیر بہادر بھی بھاگتے ہوئے مارے گئے، مالوہ میں ملہار راؤ جان بچا کر نکل گیا، اَپاجی سیندھیا بھی لنگڑا ہو کر وہاں جا پہنچا، ان دو سرداروں کے سوا کوئی اور نامور سردار نہیں بچا، مرہٹوں کو ایسی شکست کبھی نہیں ہوئی تھی، نہ ایسی مصیبت پڑی تھی، اس سے ساری قوم کا دل پژمردہ و افسردہ ہو گیا، اس صدمہ سے بالاجی بھی تھوڑے دنوں کے بعد مر گیا جب سے شکست کی خبر سنی تھی ایک مندر میں بیٹھ کر سنسکرت پڑھنا اختیار کر لیا تھا۔"

بقول ایک مورخ کے "مرہٹوں کی طاقت چشم زدن میں کافور کی طرح اڑ گئی، سرجدو ناتھ سرکار نے لکھا ہے کہ مہاراشٹر میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں صف ماتم نہ بچھی ہو، لیڈروں کی پوری نسل ایک ہی معرکہ میں غائب ہوئی۔"

[1] تاریخ دعوت و عزیمت۔

"اس فتح کے بعد احمد شاہ پانی پت سے نواح دہلی میں آیا اور چند روز متوقف رہا، ہندوستان کا بادشاہ شاہزادہ عالی گوہر یعنی شاہ عالم کو مقرر کیا اور بادشاہ سے شجاع الدولہ کے وزیر اور نجیب الدولہ کے امیر الامراء ہونے کی سفارش کی، شاہ عالم اس وقت دہلی میں نہ تھا، اس لئے اس کے بیٹے جوان بخت کو بادشاہ کا نائب دہلی میں مقرر کیا اور نجیب الدولہ کو دہلی کا منتظم مقرر کیا اور شجاع الدولہ کو خلعت دے کر اودھ اور الہ آباد کے صوبوں پر بھیج دیا اور خود قندھار کو چلا گیا۔"

خلیق صاحب لکھتے ہیں:

"مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں کی تحریک میں اتنی وسعت اور ہمہ گیری نہ تھی کہ وہ ہندوستان کی مرکزیت و وحدت کو برقرار رکھ سکنے کی تدبیر سوچتی، شاہ صاحب اپنے مجوزہ نظام میں اکبر، جہاں گیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے زمانے کی مرکزیت اور سلطنت ہند کے اقتدار اعلیٰ کو بحال دیکھنا چاہتے تھے، لیکن اس طرح سے کہ مطلق العنان بادشاہوں کے بجائے انصاف کی حکومت ہو۔

اگر سلطنت میں تھوڑی سی بھی جان ہوتی تو وہ جنگِ پانی پت کے نتائج سے فائدہ اٹھا کر اپنے اقتدار کو ہندوستان میں کچھ صدیوں کے لئے قائم کر سکتی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت اس وقت بے روح جسم کی مانند تھی، جنگِ پانی پت کا اصلی فائدہ فاتحین جنگ پلاسی نے اٹھایا۔"

شاہ عالم نے اپنی پست ہمتی اور کوتاہ نظری سے یہ زریں موقع کھو دیا اور ساری کوششوں اور خود اپنی والدہ زینت محل کے مشفقانہ خط کے باوجود پورے دس برس کے بعد اے۱۷ء کے آخر میں ۲۵ دسمبر کو قلعہ میں داخل ہوا، اس کے بعد اس کے اور اس کے جانشینوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا وہ تاریخ میں تفصیل کے ساتھ درج ہے۔ اس کا نقطۂ عروج (Climax) ۱۸۵۷ء کا انقلاب سلطنت بلکہ انتزاع سلطنت ہے (اگرچہ سلطنت برائے نام تھی) جو انگریزوں کے ہاتھ پیش آیا جنھوں نے اپنی دانش مندی اور سیاسی ذہانت سے ہندوستان پر تسلط کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔[1]

تیموری سلاطین کا خاتم سلطان بہادر شاہ ظفر

بہادر شاہ ظفر تیموری سلاطین کا خاتم ہے وہ بادشاہ بنا لیکن حکمرانی کے لئے نہیں بلکہ اپنے اسلاف کی سطوت و عظمت کی یاد میں آنسو بہانے کے لئے۔ سلطنت ایک بیرونی قوم کے قبضہ میں جا چکی تھی سکوں پر سے آل تیمور کا نام مٹ چکا تھا، بادشاہ محض ایک وظیفہ خوار کی حیثیت سے رہ گیا تھا، پھر بھی بادشاہ کہلاتا تھا، اس کی ساری بادشاہی قلعہ معلیٰ کی چہار دیواری تک محدود تھی، جہاں نہ وہ سلطنت کے لئے فرامین

[1] تاریخ دعوت و عزیمت

صادر کرتا اور نہ امیرانِ حکومت کی مجلسیں منعقد کرتا، بلکہ صرف دل کے پھپھولے پھوڑتا اور جب اداس ہو جاتے تو اس کے سوز و گداز کا اظہار اپنے نالہائے موزوں سے کرتا تھا، یہی وجہ ہے کہ اس کی آپ بیتی کو پڑھ کر دل پر جو اثر ہوتا ہے وہ اور شعراء کی جگ بیتی سے نہیں ہوتا، خود کہتا ہے۔

اے ظفر یہ تیرے اشعار ہیں یا نالۂ زار
کیا بلا ہیں کہ جو یوں دل میں اثر کرتے ہیں

ظفر تاج و تخت کا گو نہ سہی لیکن اقلیم سخن کا بادشاہ ضرور تھا، جہاں اس نے اپنی ذکاوت و ذہانت اور طبیعت کی بے قراری کے ایسے جوہر دکھلائے کہ اگر وہ سیاسی امور میں انہی اوصاف کو کام میں لاتا تو کیا عجب تھا کہ وہ اپنی ظفریاب فوجوں کے ساتھ اغیار کے شہروں اور ملکوں پر اپنی فتح و کامرانی کا پرچم لہراتا نظر آتا، اور ایک کامیاب مدبر اور سیاست داں بھی ثابت ہوتا، لیکن نہ اب رزم کی معرکہ آرائیاں تھیں اور نہ بزم کی نکتہ آفرینیاں، لامحالہ ایک بے چین اور بے قرار ذہن کی تمام قوتیں ایک ہی طرف منتقل ہو گئیں، اور وہ شعر و شاعری کا میدان تھا، وہ اپنے ہی رنگ اور طرز ادا کا مالک رہا، بات یہ تھی کہ طبیعت میں شاعری کا مادہ بھرا تھا، پھر زندگی کچھ ایسی گزری کہ شاعر نہ بھی ہوتا تو انقلابات زمانہ اور حوادث روزگار سے خواہ مخواہ شاعر ہو جاتا، اسلاف کی عظیم الشان حکومت ہاتھ سے گئی، عزت و وقار کا خاتمہ ہوا، لخت ہائے جگر کو اپنی آنکھوں سے خون میں تڑپتے ہوئے دیکھا اور آخر میں خود ایک مجرم کی حیثیت سے محبوس و مقید ہو کر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دی، شاعر بننے کے لئے اور کیا چاہئے تھا، اور شعراء نے بلبل کے نالہ و فریاد سے اپنی شاعری میں سوز و گداز پیدا کیا، ظفر نے اپنی ہی آہ و بکا سے اپنی شاعری میں درد اور درد میں تڑپ پیدا کی، اور شعراء نے عاشقانِ زبوں حال کے طوق و سلاسل کی ہولناک تصویریں کھینچ کر عبرت کا پیام دیا، ظفر کی اپنی ہی زندگی قید اور زنجیر کی داستاں رہی، اس لئے اس کی ہر صدی صحیح معنوں میں دنیا کی نیرنگیوں کی آواز باز گشت ہو گئی اور شعراء نے ایک خیالی چمن کی بربادی اور اس کے پھولوں کی پامالی پر دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا رونا رویا، ظفر نے اپنی سلطنت کے چمنستاں کو اجڑتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا، اس کے خیالات، میں محشر بپا نہ ہوتا تو آخر کس میں ہوتا، اپنی شاعری میں خونِ جگر خوب خوب بہایا، اس کی تمام شاعری مغلیہ سلطنت کی تباہی اور بربادی کا ایک مرقع ہے، یہ شاید قدرت کی طرف سے انتظام تھا کہ تیموری سلطنت کا آخری فرماں رواں وہ ہو جو صحیح طور پر اس کے کمالِ زوال کا خوں چکاں ماتم کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ ظفر کی شاعری حزن و ملال، رنج و الم اور یاس و حسرت کی سراپا داستان ہے، دیوان میں بعض غزلیں ایسی ضرور ہیں جن میں رنگینیوں اور سرمستیوں کی جھلک ہے اور بعض تو حد سے زیادہ سنجیدگی سے بھی گری ہوئی ہیں، مگر یہ شاید غایت رنج و مصیبت اور شدت غم والم کا رد عمل ہے، شدت غم سے

پھلنا پھولنا اس کے لئے ظفر شاعری میں رند و نوش اور عاشق از رنگین و ہوش ہو جاتا اور نہ اور کوئی وجہ نہ تھی، کیونکہ سیاست و حکومت کی وجہ سے ظفر دوست نے مزاج پر ایسا اثر ڈالا پایا تھا کہ وہ صرف [illegible] معاملات میں مشغول رہتا بلکہ آل تیموری کی عظمت و سیاسی بیداری اور بدی ظفر کے یہاں [illegible] نہ تھی۔

ظفر کا دیوان چار جلدوں میں شائع ہوا ہے، جس میں ہر قسم کے کئی ہزار سے زیادہ اشعار ہیں، جس سے ظفر کی مہارت اور مختلف زبانوں پر قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس مجموعہ میں وہ حصہ [illegible] نہیں جو ظفر نے غدر کے بعد کہا۔ اس زمانہ کا کلام شائع نہ ہو سکا بلکہ ضائع ہو گیا، حالانکہ اس عہد کی شاعری میں درد، صرف وحشی بلکہ چند باتیں میں اور بھی درد اور شدت پیدا ہو گئی ہوگی۔[۱]

ظفر کا شاعرانہ کلام

ظفر نے حمد و نعت سے اپنے دیوان کی ابتدا کی ہے اور اس دیوان میں درد و غم اور عشق الٰہی و ذکر علی ہذا کے متعلق اشعار کہے ہیں، اور ناصحانہ کلام بھی ہے، بطور نمونہ چند اشعار مختلف عنوان سے متعلق جستہ جستہ درج ہیں، ملاحظہ ہو:

خدا کی حمد

اگر ہو جائے پارہ پارہ دل اس کی محبت میں ۔۔۔ تو پھر ہر پارۂ دل کو سمجھ سی پارہ قرآں کا
یہ خیال ہے کچھ رحمت الٰہی کا ۔۔۔ گناہ سمجھے ہے دعویٰ وہ بے گناہی کا
یہ لطف دیکھ کر خود بے نیاز ہے لیکن ۔۔۔ دھیان ہے اسے بندوں کی خیر خواہی کا

ظفر کی المیہ شاعری

بلا سے گرچہ ہوتا راز دل افشاں ہے رونے میں ۔۔۔ نہ روکو مجھ کو رونے سے مزا آتا ہے رونے میں
سنا ہے نوح کے طوفان کو یاروں نے کانوں سے ۔۔۔ مگر آنکھوں سے اپنی ہم نے وہ دیکھا ہے رونے میں
ظفر ہم اپنا رونا روئیں جا کر سامنے کس کے ۔۔۔ رہا کون اپنے آنسو پونچھنے والا ہے رونے میں

---

[۱] [illegible] تیموریہ جلد سوم ص ۴۰۲ ۔۔۔ یہ دیوان نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوا ہے [illegible] ۳۰

دنیا کی بے ثباتی کی تمثیل اور پُر درد تصویر کے متعلق

[illegible] میں صبا میرا اگر ہووے گزر ۔۔۔ کہ بلبل سے ذرا اتنا کہہ [illegible]
[illegible] کیا شاخ گل پر بیٹھ کر ۔۔۔ یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں جانور

اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے

جو تماشا دیکھنے دنیا میں تھے آئے ہوئے ۔۔۔ پھر نہ دیکھا پھر چلے آخر وہ پچھتائے ہوئے
ذرا حسن کو بھی مشکل سے جنہیں آتا تھا خواب ۔۔۔ خاک پر سوتے ہیں اب وہ پاؤں پھیلائے ہوئے
پھرا اس گلشن ہستی پر کہ ہے کچھ دن بہار ۔۔۔ صبح کے مانند کیوں پھرتے ہو دل کھائے ہوئے

صبر و ضبط سے کام لینے اور خدا پر بھروسہ کرنے کے لئے کہتا ہے

ستم کرتا ہے بے صبری سے کیا کیا آسماں پیہم ۔۔۔ دل اس کے ہاتھ سے پُر درد ہے اور چشم ہے پُرنم
کروں کا پر نہ شکوہ اگرچہ ہوں گے لاکھ غم پر غم ۔۔۔ کہ جاؤں گا میں ہر دم یہی جب تک ہے دم میں دم
خدا دارم چہ غم دارم ۔۔۔ خدا دارم چہ غم دارم

ہے اگر نہیں کوئی رفیق و آشنا میرا ۔۔۔ خدا ہے مہرباں میرا نگہباں ہے خدا میرا
خدا آساں کرے گا گو ہے مشکل مدعی میرا ۔۔۔ خدا حامی ہے میرا اور خدا مشکل کشا میرا
خدا دارم چہ غم دارم ۔۔۔ خدا دارم چہ غم دارم

ظفر کا ناصحانہ کلام

اتنا نہ اپنے جامے سے باہر نکل کے چل ۔۔۔ دنیا ہے چل چلاؤ کا رستہ سنبھل کے چل
کم ظرف پر غرور ذرا اپنا ظرف دیکھ ۔۔۔ مانند جوش غم نہ زیادہ ابل کے چل
اوروں کے بل پہ بل نہ کر اتنا نہ چل نکل ۔۔۔ بل ہے تو بل کے بل پہ تو اپنے ہی بل پہ چل
پھر آنکھیں بھی ہیں کہ رکھ دیکھ کر قدم ۔۔۔ کہتا ہے کون تجھ کو نہ چل چل سنبھل کے چل

اورنگ زیب عالمگیر کے بعد آنے والے مغل بادشاہوں کا تذکرہ سامان جو اخیر میں [illegible] کے

وظیفہ خوار ہو گئے تھے اور بادشاہ برائے نام تھے اور یہ نام بھی ۱۸۵۷ء میں غدر کے بعد ختم ہو گیا، بہادر شاہ گرفتار کر کے رنگون میں نظر بند کر دیے گئے، جہاں اسی حالت میں ۱۸۶۲ء مطابق ۱۲۷۹ھ میں ان کا انتقال ہو گیا اور مغل حکومت کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا۔

ہندوستان کے سیاسی حالات

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کے انتقال تک ہندوستان میں چین کے بعد اس وقت کی دنیا کی دوسری بڑی حکومت مسلمانوں کے قبضہ میں تھی، جس کی وسعت کی نظیر پوری تاریخ ہند میں اشوک کے بعد کسی کے زمانہ میں نہیں ملتی تھی، اس کا رقبہ کنیا کماری سے کابل تک پندرہ لاکھ مربع میل سے بھی زائد تھا اور آبادی بیس کروڑ کے قریب تھی، اورنگ زیب کی وفات کے ساتھ ہی مغلیہ سلطنت کی چولیں ڈھیلی پڑ گئیں، اس کے بعد آنے والے اس کے جانشینوں میں عالم گیر کا سا جذبہ اور انتظامی ملکہ نہ رہا، اس نے انتظامی سہولت کے لئے پورے ملک کو تین حصوں میں تقسیم کر کے اپنے تین بیٹوں کے حوالہ کر دیا تھا، لیکن بعد میں ان کے آپسی اختلاف کی وجہ سے ملک متحد نہ رہ سکا۔

۱۷۱۲ء تک اس کے بڑے بیٹے معظم بہادر شاہ نے حکومت کی، اس کے بعد ۱۷۱۹ء تک اسی خاندان کے ایک فرد فرخ سیر کے قبضہ میں ملک رہا، لیکن عوام کے دلوں میں بادشاہوں کا خوف نہ رہا، رعایا عیش پرست ہو گئی، بادشاہ کے محلات عیاشی کے اڈے بن گئے، شاہی بیگمات کی بھی سیاست میں مداخلت ہونے لگی، غرض یہ ہے کہ بددیانتی جاہ طلبی اور دولت کی ریل پیل نے سلطنت میں ہر ایک کو مدہوش کر دیا، محمد شاہ کے عہد میں جس نے ۱۷۴۸ء تک عنانِ حکومت سنبھالی اور اس میں اور اضافہ ہو گیا اور اس پر ایک کے بعد دیگرے ملک کی بدقسمتی سے نااہل و کمزور حکمراں آتے رہے، ایک طرف مغل بادشاہوں کا یہ حال تھا تو دوسری طرف ان کے آپسی اختلافات سے فائدہ اٹھا کر مرہٹوں نے گجرات و مہاراشٹر پر قبضہ کر لیا، یہ مسائل و مصائب ہی کیا کم تھے کہ ادھر شمال سے ایران کا بادشاہ ۱۷۳۹ء میں کابل، پشاور اور لاہور وغیرہ کو جو اس وقت تک سلطنت مغلیہ ہی میں شامل تھے فتح کرتا ہوا دہلی پر چڑھ آیا اور تھانیسر کے مقام پر ایک تباہ کن جنگ میں قریب ایک لاکھ لوگوں کا قتل عام کر کے اور پچاس کروڑ کی دولت سمیٹ کر واپس ایران چلا گیا، اس کا مقصد اس وقت ہندوستان میں شامل کابل میں پناہ لینے والے افغانوں کو اس کے سپرد نہ کرنے پر صرف محمد شاہ کو سبق سکھانا تھا، بس اب کیا تھا ملک کے مختلف

صوبوں کے گورنر و نواب بادشاہ دہلی کے خلاف جری ہو گئے، بہار، اڑیسہ، سندھ، دکن اور کشمیر وغیرہ میں الگ الگ خودمختار ریاستیں قائم ہو گئیں اور انگریز بھی ۱۷۵۷ء تک بنگال اور ۱۷۶۴ء تک الہ آباد وغیرہ پر قابض ہو گئے، بکسر کے میدان میں شکست کھا کر شاہ عالم اب انگریزوں کے رحم و کرم پر تھا، اور ۱۷۶۵ء میں ایک معاہدہ کے تحت اس نے بنگال، اڑیسہ وغیرہ کو بھی کمپنی کے حوالہ کر دیا، اس کے بعد دہلی کے امور سلطنت میں مرہٹوں کا عمل دخل بھی بڑھ گیا، جو بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ گیا تھا کہ اس طرح ان کا فوجی اثر و سیاسی زور آہستہ آہستہ پورے ملک میں پھیل نہ جائے، لیکن عین اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر رحم کیا اور دہلی کے قریب پانی پت کے میدان میں افغانستان سے احمد شاہ ابدالی نے آ کر ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کو صرف نوے ہزار مسلمانوں کو لے کر ایک سخت جنگ میں مرہٹوں کے دو لاکھ سپاہیوں کو نیند کی آغوش میں سلا کر ایک بہت بڑی مصیبت سے مسلمانوں کو کچھ ہی دنوں کے لئے سہی محفوظ رکھا، کشمیر، سندھ اور پنجاب کا اپنی مملکت میں الحاق کر کے اور باقی سلطنت شاہ عالم کے حوالہ کر کے خود واپس افغانستان چلا گیا، اگر وہ کچھ سالوں تک خود دہلی پر حکومت کرتا تو شاید مغلیہ سلطنت کے شیرازہ کو بکھرنے سے بظاہر بچایا جا سکتا تھا، لیکن ایسا نہ ہو سکا اور جلد ہی مرہٹوں کا نہ سہی انگریزوں کا اثر ملک میں بڑھنے لگا اور ان کی توجہ زیادہ تر تجارت کے بجائے سیاست ہی پر ہو گئی، یہاں تک کہ جب ۱۷۶۱ء میں جنوب میں سلطنتِ خداداد کا قیام عمل میں آیا تو وہ پورے ملک میں بکھری اپنی فوجی قوت کو سمیٹ کر اس کے خاتمہ کے لئے جنوب کی طرف چل پڑے اور ان کی اس سیاسی کشمکش کا سلسلہ ۱۷۹۹ء میں ٹیپو کی شہادت تک جاری رہا جس کے ساتھ ہی ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی قسمت پر مہر لگ گئی، جس کا ثبوت جلد ہی ۱۸۵۷ء میں پورے ملک پر انگریزوں کے مکمل قبضہ کے ساتھ سامنے آیا[1]

انگریزوں کی سیاسی سرگرمیاں

الغرض پورے ملک میں مغلیہ سلطنت کے زوال پذیر ہونے کے بعد مختلف خودمختار ریاستیں وجود میں آ گئیں، ایک طرف مرہٹہ گجرات اور مہاراشٹر پر قابض اور متصرف تھے، دوسری جانب حیدرآباد دکن کا علاقہ نظام کے ماتحت تھا جس کو مملکتِ آصفیہ بھی کہا جاتا تھا، کرناٹک کے مقام ارکاٹ پر نواب محمد علی تھے اور میسور میں سلطان حیدر علی اور ٹیپو برسرِ اقتدار تھے اور بنگال میں نواب سراج الدولہ اور اودھ میں نواب شجاع الدولہ اور دہلی میں مغل حاکم شاہ عالم سرفراز تھے، ان ہم وطنوں کی اس قدر طاقتوں کے

[1] سیرت سلطان ٹیپو شہید

باوجود سات سمندر پار سے آنے والے انگریز کیسے کامیاب ہوئے اور پورے ملک کو غلام کس طرح بنالیا، ان کی سیاسی سرگرمیوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے، اگلے صفحات میں اسی پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

انگریزوں کی ہندوستان آمد

ہندوستان کی دولت و مال داری کے قصے ساری دنیا میں مشہور تھے، یورپ کی قوموں کو بھی نفع اٹھانے کی فکر تھی، اسی ضمن میں پرتگیزی جہازی واسکوڈی گاما ایک عرب مسلمان کی مدد سے ۹۰۴ھ مطابق ۱۴۹۸ء میں کالی کٹ پہنچا، اور سمندر کا یہ نیا راستہ مکمل گیا، پرتگیزوں کی دیکھا دیکھی ہالینڈ، جرمنی، سویڈن، فرانس اور انگلستان کے سوداگروں نے بھی ہندوستان کا رخ کیا، لیکن تھوڑے ہی دنوں میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے سوا سب کے قدم اکھڑ گئے، آگے چل کر فرانس کو بھی سامنے سے ہٹنا پڑا اور انگریزوں کے لئے میدان بالکل صاف ہو گیا۔

انگریز سوداگر سولہویں صدی عیسوی کے ختم ہوتے ہوتے ہندوستان پہنچ چکے تھے، ۱۶۱۲ء میں انگریزوں نے گجرات کے مشہور اور اس وقت ملک کے ایک بڑے تجارتی و بندرگاہی شہر سورت میں اپنی پہلی تجارتی کوٹھی قائم کی، جس کا نام ایسٹ انڈیا کمپنی رکھا، جلد ہی ان کو تجارت میں کامیابی حاصل ہوئی، یہاں تک کہ انہوں نے ملک کے مشرقی ساحل پر چنیا پٹنم کے راجہ سے زمین کے ایک حصہ کو پٹہ پر لے لیا، اس وقت مشرقی ساحلی شہر بمبئی پر پرتگالیوں کا قبضہ تھا، مچھروں کی کثرت، بدبو اور تعفن کی وجہ سے اس وقت تک اس شہر پر ہندوستانی حکمرانوں کی کوئی خاص توجہ نہیں تھی، ۱۶۶۱ء میں دس پونڈ سالانہ پر یہ زمین ایسٹ انڈیا کمپنی کو پٹہ پر دے دی، کمپنی نے بمبئی پر توجہ دی اور ۱۶۸۷ء میں سورت سے اپنی تجارتی کوٹھی بمبئی منتقل کر دی اور اس کے ساتھ ہی مدراس اور کلکتہ میں بھی مزید کوٹھیاں قائم کیں، وہ یہاں سے گرم مصالحے اور سوتی ریشمی کپڑے یورپ لے جاتے تھے، لیکن جب اس وقت کے مغل حکمرانوں کو یہ معلوم ہوا کہ انگریز تجارتی کوٹھیوں کے نام سے ملک میں فوجی قلعے تعمیر کر رہے ہیں تو تمام صوبوں میں اپنے گورنروں کے نام حکم جاری کر دیا کہ وہ فوری انگریزوں کی ملک میں تجارت پر باضابطہ روک لگا دیں، ان کے مال کو ضبط کریں اور ان کے سرکردہ لوگوں کو گرفتار کریں۔

چند ہی سالوں میں برطانوی تجارتی کمپنی کا ہندوستان میں دیوالیہ نکل گیا، کمپنی کے وکیلوں کے معافی مانگنے پر ۱۶۹۰ء میں بنگال کے گورنر نے ان کو نہ صرف دوبارہ تجارت کی اجازت چند شرائط پر دی،

کلکتہ کا ایک قطعہ زمین بھی ان کو کارخانہ قائم کرنے کے لئے دے دیا، اس کے بعد کئی سال تک انگریزوں نے اپنے ماضی سے سبق حاصل کرتے ہوئے ملک کے سیاسی معاملات میں دخل اندازی سے بچ کر اپنی پوری توجہ تجارتی دائرہ کو وسعت دینے ہی پر دی، ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا تو اس کے نتیجہ میں ملک میں کئی خود مختار ریاستیں وجود میں آئیں تو اس کے بعد انگریزوں کو پھر فوجی طاقت کا خیال ہوا، انگلستان اور فرانس کی لڑائی اور کرناٹک کے ریاستی جھگڑوں نے اس خیال کو اور مضبوط کیا اور انگریز بھی میدان میں اتر آئے، کرناٹک کے جھگڑوں میں انگریزوں نے نواب محمد علی کا ساتھ دیا اور فتح بھی نواب محمد علی کو ہوئی لہٰذا نواب محمد علی انگریزوں کا حلیف ہو گیا اور کرناٹک پر انگریزوں کا اثر ہو گیا، ادھر نظام حیدرآباد بھی عملاً انگریزوں کے ماتحت ہو گیا تھا۔

انگریزوں کے ساتھ ہندوستانیوں کی پہلی جنگ

کرناٹک اور اس کے آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کے بعد انگریزوں کی ہوس اقتدار بڑھ گئی، اس سلسلہ میں انہوں نے اپنی راہ میں آنے والی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے جنگ سے بھی دریغ نہیں کیا، چونکہ ان کی تجارتی سرگرمیاں کلکتہ میں بھی تھیں اس لئے اب بمبئی، سورت، مدراس اور حیدرآباد کے بعد ان کی نظریں بنگال پر تھیں، اس وقت وہاں کے حاکم نواب سراج الدولہ تھے جن کو ان کے نانا علی وردی خان نے اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا اور وصیت کی تھی کہ مغربی قوموں سے خبردار رہنا ورنہ بنگال تمہارا نہیں ہوگا، ایک دفعہ موقع پا کر انگریزوں نے سمندری راستہ سے ان کی حکومت پر بلاوجہ حملہ کر دیا، سراج الدولہ اپنی اس توہین کو کب برداشت کرتا، چنانچہ اس نے ۲۰ رجون ۱۷۵۷ء کو پلاسی کے میدان میں اپنی ستر (۷۰) ہزار فوج کے ساتھ انگریزوں کی صرف تین ہزار فوج کا مقابلہ کیا، لیکن اس کے وزیر و رشتہ دار میر جعفر کی غداری کی وجہ سے سراج الدولہ کو شکست ہوئی اور خود اس کو انگریزوں نے جنگ کے بعد گرفتار کر کے بے دردی سے قتل کر دیا، قدرت نے بھی ان غداروں سے سخت انتقام لیا اور ان سب کو دنیا ہی میں عبرت ناک سزا ملی۔

دوسری جنگ

اختتام جنگ کے بعد انگریزوں نے میر جعفر کو کلکتہ کا حاکم بنایا تھا، لیکن صرف تین سال بعد ہی اس

---

۱ سیرت سلطان ٹیپو شہید ص ۴۳

کو معزول کرکے اس کے داماد میر قاسم کو بنگال کا نواب مقرر کر دیا گیا، لیکن اپنے خسر کے برخلاف اس نے انگریزوں کے اشارے پر چلنے سے انکار کر دیا اور اپنی سلطنت میں انگریز تاجروں کی طرح ہندوستانی تاجروں پر سے بھی تجارتی محصول کو ختم کر دیا، اس طرح گورے اور کالے تاجر ایک ہی صف میں آ گئے تو انگریزوں نے دوبارہ اس کے خسر میر جعفر کو ۱۷۶۳ء میں بنگال کا حاکم بنایا، محب وطن میر قاسم اپنی اس توہین کو کیوں کر برداشت کرتا، چنانچہ اس نے اس وقت کے اودھ کے حکمراں نواب شجاع الدولہ اور دہلی کے تموری حاکم شاہ عالم کی مدد سے جو اس وقت خود اودھ کی پناہ میں تھا انگریزوں کو ملک سے باہر نکالنے کا منصوبہ بنایا، ان کی انگریزوں کے ساتھ ۲۲ ر اکتوبر ۱۷۶۴ء کو بکسر کے میدان میں ایک خون ریز لڑائی ہوئی، اس جنگ میں میر قاسم کے کمانڈر نجف خان نے میر جعفر کا کردار ادا کیا، جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی پچاس ہزار فوج کو صرف سات ہزار فوج کے مقابلہ میں شکست ہوئی، مغل بادشاہ شاہ عالم انگریزوں کے پاس پناہ لینے پر مجبور ہو گیا، اور انگریزوں کا وظیفہ خوار ہو کر بہار، بنگال اور اڑیسہ کو کمپنی کے انتظام میں دے دیا، نواب اودھ نے بھی انگریزوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔

جنوبی ہند کے بعد شمال مشرقی ہند کے ایک بڑے حصہ پر بھی اب ان کا قبضہ ہو گیا، بمبئی اور سورت تو ان کے قبضہ میں پہلے ہی سے تھے، اس طرح ہندوستان میں انگریزوں کی غلامی کا باقاعدہ دور شروع ہوا، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ملک کی آزادی کے لئے محبان وطن فرزندان نواب حیدر علی و ٹیپو سلطان شہید کی کوششوں کے پہلے باضابطہ باب کا بھی آغاز ہوا[1]

مرہٹہ

مرہٹہ ہندوستان میں صوبہ مہاراشٹر کے مغربی گھاٹ کے مشرق میں بسنے والی ایک زراعت پیشہ ان جوان غیر آریائی یعنی دراوڑی نسلوں و خاندانوں کی آمیزش سے پیدا ہوئی، جنہوں نے شمالی ہند سے فرار ہو کر دکن میں پناہ لی تھی، ہندومت کی سماجی تقسیم کے اعتبار سے ان کا تعلق شودر طبقہ سے تھا بقول مصنف "تاریخ دعوت و عزیمت" اس وقت مرہٹہ قوم کی حیثیت ایک چھاپہ مار ملاقت اور ایک احتجاجی گروہ سے زیادہ نہ تھی، لیکن مغلیہ سلطنت کی روز افزوں کمزوری، سرداروں کی باہمی زور آزمائی کی وجہ سے وہ ہمہ گیر طاقت بن گئے۔

یہ جنوبی ہند میں احمد نگر کی نظام شاہی و بیجاپور کی عادل شاہی حکومت کے سلاطین کے پاس فوجی ملازمت کرتے تھے، اس قوم کو فوجی اعتبار سے سب سے پہلے ان کے قومی رہنما شیواجی بھونسلے نے

[1] سیرت سلطان ٹیپو شہید ص ۴۳

منظم کیا، ۱۶۷۴ء میں اس نے پہلی دفعہ اپنے لئے راجہ کا خطاب بھی اختیار کیا، جب کہ اس سے کچھ سال قبل تک ان کی حیثیت پورے ملک میں ایک غیر منظم قوم کی تھی، ۱۷۶۱ء تک انہوں نے گجرات، پنجاب، مالوہ اور اڑیسہ وغیرہ پر قبضہ کر لیا تھا، جنوبی ہند میں ان کی حکومت تنجاور تک پہنچ گئی تھی، ۱۶۸۰ء میں شیواجی بھونسلے کے انتقال کے بعد ان کی قیادت اس کے بیٹے سنبھاجی بھونسلے نے کی، ۱۷۰۷ء تا ۱۷۶۱ء تک مرہٹوں کا اقتدار بالاجی باجی راؤ کے پاس رہا اور یہی پوری مرہٹہ تاریخ میں ان کے انتہائی سیاسی عروج کا زمانہ تھا، ان کی نظر اب ہندوستان کی مختلف سلطنتوں کی طرف تھی اور اس کے لئے وہ پیش قدمی کرنے والے ہی تھے کہ ۱۷۶۱ء میں افغانستان سے احمد شاہ ابدالی نے آکر پانی پت کے میدان میں اپنی صرف نوے ہزار فوج کے مقابلہ میں مرہٹوں کی تین لاکھ فوج کا مقابلہ کرکے دو لاکھ مرہٹوں کا قتل عام کیا اور ہمیشہ کے لئے ان کی کمر توڑ دی، جب میسور میں سلطنت خداداد کا قیام عمل میں آیا تو بحیثیت ایک ہندو قوم کے ان کا ایک اسلامی سلطنت سے اپنے وجود کو خطرہ محسوس کرنا فطری امر تھا، اس لئے ان کی بچی ہوئی طاقت گوالیار کے جنرل سندھیا، ناگپور کے جنرل بھونسلے، اندور کے جنرل ہلکر اور گجرات کے گائیکواڑ کی قیادت میں مختلف جگہوں سے پونا آکر پیشوا مادھوراؤ کی کمان میں جمع ہو گئی، ان کی سلطنت خداداد کے ساتھ تنہا جنگیں و لڑائیاں بھی ہوئیں اور خود انگریزوں کے خلاف میسور کی چار جنگوں میں سے پہلی اور تیسری جنگ میں بھی یہ لوگ باقاعدہ سلطنت خداداد کے خلاف انگریزوں کے حلیف رہے۔

نظام دکن

اس کی حکومت کو سلطنت حیدر آباد یا مملکت آصفیہ بھی کہا جاتا تھا، سترہویں صدی عیسوی میں ہندوستان کی مسلم حکومتوں یعنی گولکنڈہ کی قطب شاہی، بیجاپور کی عادل شاہی، احمد نگر کی نظام شاہی اور بیدر کی برید شاہی سلطنتوں پر مغل بادشاہ اورنگ زیب نے قبضہ کرکے ان سب کو ملا کر ایک بڑا صوبہ دکن کے نام سے قائم کیا اور اورنگ زیب کی ۱۷۰۷ء میں وفات کے بعد جب مغلیہ سلطنت میں انتشار پیدا ہو گیا تو اس کا اثر جنوب کے صوبہ دکن پر بھی پڑا، دربار دہلی کی طرف سے اس صوبہ کے نظم و نسق کو درست کرنے اور اس کو مستحکم کرنے کے لئے ۱۷۲۰ء میں نظام الملک کو اس صوبہ کا گورنر مقرر کیا گیا، لیکن

[1] سلطنت خداداد میسور میں سلطان حیدر علی اور ان کے بیٹے ٹیپو نے قائم کی تھی۔

اس نے مغل بادشاہ کی سیاسی وفوجی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ۱۷۲۴ء میں اپنی خودمختاری کا اعلان کر کے حیدرآباد کو اپنی سلطنت کا باقاعدہ دارالحکومت منتخب کیا، مغل بادشاہ نے اس حکومت کو تسلیم کر لیا اور اس کو آصف جاہ کا خطاب بھی دیا، اسی نسبت سے بعد میں اس کو حکومت آصفیہ کہا جانے لگا، ۱۷۲۷ء میں نظام الملک کی اپنی پڑوسی مرہٹہ حکومت کے ساتھ جنگ ہوگئی، جس کے نتیجہ میں اس کو اپنے کئی سرحدی علاقوں سے ہاتھ دھونا پڑا، اس کے بعد نظام الملک کا انتقال ہوگیا، اس کے بعد ان کے بیٹے اور رشتہ داروں میں خانہ جنگی رہی، جس سے فائدہ اٹھا کر مرہٹوں نے دکن کا بڑا حصہ اپنے قبضہ میں کر لیا، لیکن اسی سال ۱۷۶۱ء میں جب پانی پت کے میدان میں احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں مرہٹوں کو تاریخی شکست کا سامنا کرنا پڑا تو نظام علی خان مرہٹوں سے اپنے مقبوضہ علاقوں کو واپس لینے میں کامیاب ہوگیا۔[1]

عین اسی زمانہ میں دکن کے پڑوس میں میسور کے اندر سلطنتِ خداداد کا قیام عمل میں آیا، حیدر علی کی فوجی ترقی سے نظام کو خطرہ پیدا ہوگیا کہ کہیں حیدر علی دکن میں اس کے زیر قبضہ علاقوں کو بھی اپنی سلطنت میں شامل نہ کر لے، اسی ممکنہ خطرہ کی وجہ سے اسی وقت سے نظام عملاً انگریزوں کا حیدر علی کے خلاف فوجی حلیف بن گیا، ۱۷۶۸ء میں انگریزوں کے ساتھ ایک معاہدہ کے مطابق اس نے اپنے زیر قبضہ کرناٹک کا ایک بڑا علاقہ سات لاکھ روپے سالانہ کے عوض ان کو دیدیا، جس کے بدلہ میں انگریزوں نے بوقت ضرورت نظام کی فوجی مدد کرنے کا وعدہ کیا، اس طرح اب تک شمال میں جو حیثیت نواب اودھ کی تھی وہی حیثیت جنوب میں نظام دکن کی ہوگئی۔ مجموعی طور پر انگریزوں کے خلاف میسور کی چار جنگوں میں سے تین جنگوں میں نظام نے سلطنت خداداد کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا اور ایک مسلم حکمران ہونے کے باوجود اس نے ایک اسلامی سلطنت کے زوال وخاتمہ میں اہم رول ادا کیا، ٹیپو کی شہادت کے بعد ۱۸۰۰ء میں انگریزوں نے اس کی رہی سہی خودمختاری بھی ختم کر دی اور خود نظام الملک ثانی کا سن ۱۸۰۳ء میں انتقال ہوگیا۔[2]

نواب کرناٹک (ارکاٹ)

سلطنت میسور کے آس پاس قائم حکومتوں میں مرہٹوں اور نظام کے علاوہ نواب محمد علی کی حکومت بھی تھی، جن کو نواب کرناٹک بھی کہتے تھے، سترہویں صدی عیسوی میں مغلوں نے جنوبی ہند کے اس حصہ کو فتح کر کے اس علاقہ کا نام کرناٹک رکھا تھا، یہاں کے باشندے تامل زبان بولتے تھے، اس طرح یہ علاقہ موجودہ تامل ناڈو میں واقع تھا، اس کو ارکاٹ بھی کہا جاتا تھا۔

[1] سیرت سلطان ٹیپو شہید ص ۶۳ [2] سیرت سلطان ٹیپو شہید ص ۶۳

۱۷۵۱ء میں ارکاٹ کے سابق حکمران خاندان کے ایک شخص چندا صاحب اور موجودہ حکمرانی کے دعوے دار محمد علی میں جنگ چھڑ گئی، چندا صاحب کی پشت پناہی اس وقت ہندوستان میں موجود فرانسیسی کر رہے تھے، جب کہ محمد علی کی مدد مدراس سے ایسٹ انڈیا کمپنی کر رہی تھی، محمد علی نے انگریزوں سے مدد کی امید میں اپنے قبضہ کا ایک بڑا علاقہ انگریزوں کو دے دیا، اس طرح اس علاقہ میں پہلی دفعہ انگریزوں کی باقاعدہ حکومت محمد علی کی کمزوری کی وجہ سے قائم ہوئی، اس کے عوض انگریزوں نے دہلی دربار سے محمد علی کو کرناٹک کی نوابی کا فرمان دلا دیا، چندا صاحب اس دوران مارا گیا اور ارکاٹ پر باقاعدہ محمد علی کا قبضہ ہو گیا چونکہ محمد علی کو ارکاٹ پر قبضہ دلانے میں انگریزوں نے ہی اس کی فوجی مدد کی تھی، اس لئے یہ نواب بھی ہمیشہ کے لئے انگریزوں کا فوجی حلیف بن گیا، اس طرح سلطنتِ خداداد کے خلاف انگریزوں کی جنگوں میں یہ بھی بالواسطہ شریک ہی رہا، ۱۷۹۵ء میں نواب محمد علی کا ٹیپو کی شہادت سے چار سال پہلے انتقال ہوا، دراصل اس کو انگریزوں نے ٹیپو کے خلاف اپنے ساتھ شریک کر کے میسور پر حکمرانی کا خواب دکھایا تھا، لیکن حسب عادت اس سے اپنا کام لینے کے بعد انگریزوں نے اس سے بھی اپنی توجہ ہٹا لی، اس طرح جس سیاسی مفاد اور اقتدار کے لالچ میں اس نے اپنے ہم مذہب مسلم حکمرانوں کے خلاف سازش میں اسلام دشمنوں کے ساتھ شرکت کی تھی اس میں بھی وہ ناکام رہا۔[1]

انگریزوں کے ساتھ میسور کی پہلی جنگ

جیسا کہ پچھلے صفحات میں "انگریزوں کی ہندوستان آمد" کے عنوان کے تحت گزر چکا ہے کہ ۱۷۶۱ء میں جب حیدر علی نے میسور کا اقتدار سنبھالا تو انگریز بنگال کے علاقہ پر نواب سراج الدولہ کو پلاسی کے میدان میں شکست دے کر قابض ہو چکے تھے، ۱۷۶۴ء میں بکسر کی لڑائی کے بعد اودھ کے حصہ پر بھی ان کا قبضہ ہو چکا تھا، اس طرح ہندوستان میں انگریزوں کا سیاسی دَور شروع ہو کر ان کا وجود اب ایک مسلم حقیقت بن چکا تھا، ارکاٹ کے تخت پر بھی انہوں نے فرانسیسیوں کے حلیف چندا صاحب کو قتل کر کے اپنے سیاسی حلیف نواب محمد علی کو بٹھا دیا تھا، ادھر نظام حیدرآباد بھی عملاً انگریزوں ہی کے ماتحت تھا، پونا میں مرہٹہ افواج تھیں جو بوقت ضرورت اپنے ذاتی اور سیاسی مفادات کے لئے انگریزوں کی فوجی مدد بھی کرتی تھی، چونکہ ارکاٹ کے اقتدار کے سلسلہ میں چندا صاحب اور محمد علی کے درمیان رسہ کشی کے دوران

[1] سیرت ٹیپو سلطان شہید، ص ۶۳

Scanned by CamScanner

فرانسیسی افواج کے توسط سے میسور کی فوجوں نے چنداصاحب کی حمایت کی تھی، اس لئے چنداں صاحب کے قتل اور شکست کے باوجود نواب ارکاٹ محمد علی میسوری افواج کی دشمنی کو بھول نہیں سکا تھا، اس لئے فطری طور پر اپنے پڑوس میں وہ کسی مستحکم حکومت کا وجود برداشت نہیں کرسکتا تھا، یونہی وہ عملاً انگریزوں کے ماتحت ہی ہوگیا تھا، اہم سیاسی وفوجی امور میں وہ اپنے محسن انگریزوں کونظر انداز کر کے کوئی اہم فیصلہ بھی خود سے نہیں کرسکتا تھا، محمد علی کے ساتھ سرحدی جھگڑے بھی تھے، دوسری طرف نظام حیدر آباد کا انگریزوں کے ساتھ ایک فوجی معاہدہ ہو چکا تھا، جس کے مطابق بوقت ضرورت انگریزوں کے لئے نظام کی فوجی مدد کرنا ضروری تھا، حیدر علی کے توسیع پسندانہ عزائم سے اس کو بھی اپنے لئے خطرہ تھا اور مذکورہ بالا معاہدہ بھی اسی خوف کی وجہ سے عمل میں آیا تھا، جہاں تک مرہٹوں کا سوال تھا وہ کئی بار حیدر علی کے ساتھ الجھ چکے تھے اور ماضی میں اپنی شکستوں کا بدلہ لینے کے لئے ہروقت موقع کی تاک میں رہتے تھے، انگریز تو مسلمانوں کے ازلی دشمن تھے ہی اس لئے انگریزوں کے حیدر علی سے متعلق خدشات یقین میں بدل رہے تھے، انگریز، مرہٹہ، نظام اور نواب محمد علی میں سے کسی کو بھی تنہا حیدر علی کا مقابلہ کرنے کی ہمت و جرأت نہیں تھی، لیکن ان میں سے ہرایک کو اپنی سلطنتوں کے بقاء کے لئے حیدر علی کو راستے سے ہٹانا بھی ناگزیر تھا، چنانچہ انگریزوں کی مکاری وعیاری کی وجہ سے یہ چاروں حکومتیں میسور پر حملہ کرنے کے لئے متحد ہوگئیں، حالانکہ نظریاتی اعتبار سے ان چاروں حکومتوں کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں تھا، پھر بھی مشترکہ دشمن کے خاتمہ کے لئے وقتی اجتماع واتحاد اُن کی مجبوری تھی، باہم مشورہ سے متحدہ افواج کی کمان انگریز کمانڈر جنرل اسمتھ کے ہاتھ میں دی، اور پہلی جنگ ۱۱۸۱ھ مطابق ۱۷۶۷ء میں شروع ہوئی اور حیدر علی اور سلطان ٹیپو کی جیت پر ختم ہوئی، جب انگریزوں کو پسپائی ہوئی تو انہوں نے کمال ہوشیاری سے حیدر علی سے صلح کی درخواست کی، حیدر علی نے سیاسی مصلحتوں کی خاطر چند شرائط پر صلح کا معاہدہ کرلیا اور اس جنگ کا ۱۱۸۳ھ مطابق ۱۷۶۹ء میں خاتمہ ہوا۔[1]

انگریزوں کے ساتھ میسور کی دوسری جنگ

یہ جنگ ۱۷۸۰ء میں شروع ہوئی اور ۱۷۸۴ء تک جاری رہی، اس جنگ میں معاملہ مساویانہ رہا اور آخر میں صلح چند شرائط پر طے پائی، اسی درمیان میں حیدر علی کا ۱۷۸۲ء میں انتقال ہوگیا اور اس کی قائم مقامی ان کے جانباز بیٹے سلطان ٹیپو نے کی۔

[1] سیرت سلطان ٹیپو شہید

انگریزوں کے ساتھ میسور کی تیسری جنگ

۱۲۰۵ھ مطابق ۱۷۹۰ء میں انگریزوں اور میسور کی سلطنت خداداد کے والی سلطان ٹیپو کے درمیان زبردست معرکہ ہوا، اس مرتبہ بھی نظام حیدر آباد اور مرہٹوں کی فوجیں بھی انگریزوں کے ساتھ تھیں، تقریباً دوسال تک جنگ جاری رہی، بالآخر صلح ہوئی، مگر اس میں سلطان ٹیپو کو بڑی پریشانی کا سامنا ہوا، چونکہ صلح میں آدھی سلطنت جاتی رہی، اس کے علاوہ تین کروڑ روپے نقد دینا پڑا، اسلحہ ساز فیکٹری کی جگہ بھی انگریزوں کے پاس چلی گئی جس سے سلطان ٹیپو کی پریشانی میں مزید اضافہ ہوا۔

خلافت عثمانیہ کے پاس سفارت کی روانگی

سلطان ٹیپو جس طرح محب وطن تھا، اس سے بڑھ کر محب اسلام تھا، اس لئے وسیع تر اسلامی مفادات کے لئے اتحاد بین المسلمین اس کی زندگی کا نصب العین بن گیا تھا، یہی وجہ تھی کہ نظام حیدر آباد و نواب کرناٹک سے ٹکراؤ سے اس نے حتی الامکان گریز کیا نظام کے پاس بار بار دائمی اتحاد کی خاطر اپنے سفیر روانہ کئے نظام کے نام اس سلسلہ میں اس کے مختلف خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر اسلامی اتحاد کے جذبات کس قدر موجزن تھے، ۱۷۸۴ء میں نظام کے نام لکھے گئے اپنے ایک خط میں ٹیپو نے تحریر کیا کہ "میں اسلامی سلطنتوں کو ہمیشہ تقویت پہنچانا چاہتا ہوں اور اپنی جان ومال بھی اسلام کی خاطر قربان کرنا چاہتا ہوں اس لئے ان حالات میں تمام مسلمانوں کو میرے خلاف ہونے کے بجائے میرا ساتھ دینا چاہئے، طرفین میں اتحاد واتفاق کے لئے میں دو خاندانوں میں شادی بیاہ کے لئے بھی تیار ہوں، تاکہ دونوں اسلامی سلطنتوں میں اتحاد کا سب کو یقین ہو جائے" لیکن افسوس کہ ان حکمرانوں کی خود غرضی نے ہمیشہ ان کو ٹیپو کا سیاسی حریف ہی بنائے رکھا، اپنے ہم وطنوں وہم مذہب سلاطین سے مایوس ہوکر اس نے انگریزوں کے خلاف اپنی جنگ میں فرانسیسیوں سے مدد لی، لیکن ان کے اپنے داخلی مسائل کی وجہ سے ان کی دوستی بھی دیر پا نہیں رہ سکی، چنانچہ ان سب سے مایوس ہوکر اس نے ہندوستان سے باہر افغانستان ایران اور خلافت عثمانیہ (ترکی حکومت) سے مغربی سامراج کے خلاف فوجی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی، ۱۷۸۴ء میں سب سے پہلے عثمان علی خان کو اس نے اس مہم پر قسطنطنیہ روانہ کیا اور اس کو حکم دیا وہ خلیفۂ روم کا عندیہ معلوم کرے کہ دینی مفادات کے لئے اس کے ساتھ حکومت میسور کا کسی

طرح کا سیاسی وفوجی معاہدہ ممکن ہے یا نہیں؟ مگر افسوس یہ سفارت ناکام ثابت ہوئی، سلطان ٹیپو اپنی اس سفارتی ناکامی سے مایوس نہیں ہوا، بلکہ اس کے بعد بھی دو دفعہ خلیفہ روم کی خدمت میں اپنا سفارتی وفد روانہ کیا، آخری وفد فروری ۱۷۹۷ء کو روانہ کیا گیا تھا جو ٹیپو کے نام سلطان سلیم کا ایک جوابی خط بھی لے کر واپس ہوا، اس خط میں خلیفہ نے ٹیپو کو مشورہ دیا تھا کہ وہ فرانسیسیوں پر بھروسہ نہ کرے اور انگریزوں سے صلح کر لے، ظاہر ہے کہ ٹیپو خلیفہ روم کے اس مشورہ کو کیسے قبول کرتا، خلیفۂ روم کے علاوہ اتحاد بین المسلمین کے ارادے سے ٹیپو نے ایران کے حاکم کریم خان زند اور افغانستان کے حکمران زمان شاہ درانی کے پاس بھی اپنے وفود روانہ کئے، ایران اس کے جواب میں تجارتی وفوجی اہمیت کی حامل ایک فوجی بندرگاہ بھی ٹیپو کے حوالہ کرنے پر راضی ہو گیا تھا، اسی طرح زمان شاہ بھی ٹیپو کی فوجی مدد کے لئے ہندوستان کی سرحد پر پہنچ گیا تھا، لیکن ایران کے افغانستان پر اچانک حملہ کی وجہ سے اس کو راستہ ہی سے واپس جانا پڑا۔[1]

نظام سے مفاہمت کے لئے ٹیپو کی کوشش

ٹیپو کو جب اپنے خلاف انگریزوں کی سازش سے بننے والے متحدہ محاذ کا علم ہوا تو اس نے پھر ایک بار نظام حیدر آباد سے مصالحت ومفاہمت کی کوشش کی، اس نے نظام کو خط لکھا کہ اس کی طرف سے اس کو جن زیادتیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے وہ اس کو بھول جانے کے لئے تیار ہے، بحیثیت مسلم حکمرانوں کے اپنے مذہبی دشمنوں کے خلاف ہمارا اتحاد ناگزیر ہے، آپ کے جن علاقوں پر میں نے جنگ کے دوران قبضہ کر لیا تھا اس اتحاد کی خاطر میں اس سے دست بردار ہونے کے لئے بھی تیار ہوں، اس سلسلہ میں میری نیت وخلوص پر آپ کو یقین دلانے کے لئے میں اپنے لڑکے کی شادی بھی آپ کی لڑکی سے کرنا چاہتا ہوں، لیکن اس کے وزیر میر عالم کی جنرل کارنواس سے ساز باز کی وجہ سے یہ سلسلہ آگے نہیں بڑھ سکا، اور میر عالم نظام کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہوا کہ ٹیپو کے بجائے انگریزوں کا ساتھ دینے ہی میں اس کا فائدہ ہے، غرض یہ کہ ٹیپو نے بحیثیت ایک سچے مسلمان کے ایک دوسرے مسلمان کے خلاف جنگ سے باز رہنے کی حتی الامکان کوشش کی اور دوسری طرف بحیثیت ایک محب وطن کے مرہٹوں سے بھی مصالحت کی کوشش کی، لیکن افسوس کہ انگریز اپنی عیاری سے ان دونوں کو ٹیپو سے دور رکھنے اور اس کے خلاف اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گئے۔[2]

---

[1]، [2] سیرت سلطان ٹیپو شہید ص ۶۳

اندرونِ ملک ہندو راجاؤں کو دعوتِ اتحاد

ٹیپو نے انگریزوں کے وجود سے مادر وطن کی سرزمین کو پاک کرنے کے لئے اندرون وبیرون ملک صرف بڑی طاقتوں سے رابطہ پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ملک کی چھوٹی چھوٹی خودمختار سلطنتوں کو بھی اس نے انگریزوں کی چال اور ہندوستان کے سلسلہ میں ان کے ناپاک عزائم سے آگاہ کیا، چنانچہ اس نے کشمیر، جودھپور، جے پور اور نیپال وغیرہ کے ان ہندو راجاؤں کے پاس بھی اپنے سفیر دعوتِ اتحاد دے کر روانہ کئے، جن کی بظاہر نظام ومرہٹہ افواج کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں تھی، لیکن ان کو بھی حقیر نہ سمجھتے ہوئے اس نے ملک کی آزادی کے لئے ہندوستان ہندوستانیوں کے لئے کا نعرہ بلند کرتے ہوئے اپنے ساتھ ان کو شامل ہونے کی دعوت دی، لیکن افسوس کہ طویل فاصلہ پر ہونے اور اپنے اندرونی مسائل کی وجہ سے وہ چاہتے ہوئے بھی ٹیپو کے ساتھ انگریزوں کے خلاف ملک کی لڑائی میں شامل نہیں ہو سکے۔[1]

ملت فروشوں کی خفیہ سرگرمیاں

ایک طرف انگریز ٹیپو کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لئے کمر بستہ تھے اور اپنی تیاریاں مکمل کر چکے تھے تو دوسری طرف انگریزوں ہی کی ہدایت پر ٹیپو کے نمک خوار افسران خود اپنے محسن آقا کے خاتمہ کے لئے انگریزوں کو مواقع فراہم کرنے کے منصوبوں پر غور وخوض کر رہے تھے، اس میں ان سب کی قیادت وزیر اعظم سلطنتِ خداداد میر صادق کر رہا تھا، ملت فروشی کی ان خفیہ سرگرمیوں میں اس کے ساتھ میر معین الدین، میر قمر الدین وغیرہ وغیرہ شامل تھے، ان کی اکثریت شیعہ مذہب سے تعلق رکھتی تھی، اس سلسلہ میں چند مخصوص افراد کی ایک خفیہ مشاورتی نشست بھی ہوئی، جس کے بعد انگریزوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دی گئی کہ حملہ کے لئے کون کون سے راستے محفوظ ہیں اور کن کن قلعہ داروں کو رشوت دے کر خریدا جا سکتا ہے۔

اتمام حجت کا آخری حربہ

انگریز جنرل کو اپنی پوری تیاریوں کے بعد ٹیپو پر اپنی فتح کا تقریباً یقین ہو گیا تھا، مگر خانہ پوری کے درجے میں مصالحت کا مسودہ دار السلطنت کا محاصرہ کرنے سے پہلے ٹیپو کے پاس بھیجا، اس میں من مانی

---

[1] سیرت سلطان ٹیپو شہید ص ۶۳

Scanned by CamScanner

ایسی شرطیں لکھی تھیں جو ٹیپو کے لئے کسی درجے میں قابلِ قبول نہیں ہوسکتی تھیں، ایسی غلامی پر اس کے نزدیک موت کو ترجیح تھی، چنانچہ اس نے صلح کے پیغام کو فوراً ٹھکرادیا، اس کے نمک حرام اور سازشی وزراء نے بھی (یعنی میر صادق وغیرہ نے) اس کو سختی سے مسترد کرنے کا ہی مشورہ دیا، تاکہ کہیں صلح ہوکر ان کا منصوبہ دھرا کا دھرا ہی نہ رہ جائے، بالآخر انگریزوں کے ساتھ چوتھی اور آخری جنگ کا آغاز باقاعدہ مارچ ۱۷۹۹ء کی ابتداء میں ہوگیا۔

معرکۂ حق و باطل کا فیصلہ کن دن

۱۷۹۹ء مئی کی چوتھی تاریخ تھی سلطان نے آج بھی حسبِ معمول نمازِ فجر مسجدِ اعلیٰ میں ہی ادا کی، نماز کے بعد سلطان کے پرائیویٹ سیکریٹری میر حبیب اللہ نے عرض کیا کہ وقت کا تقاضہ ہے کہ حضور جانِ عزیز پر رحم فرمائیں اور اپنے شاہزادوں کی یتیمی اور اسیری کا تصور کریں، دوسرے الفاظ میں وہ کہنا چاہتا تھا کہ دشمنوں سے صلح کرلیں، سلطان نے جواب دیا کہ ہم برسوں سے اس سلطنتِ خداداد کو جو ہماری رعایا بالخصوص مسلمانوں کی ملکیت ہے بچانے کی فکر کررہے ہیں، لیکن وزراء و افسرانِ سلطنت ہی درپردہ اس کی تباہی کے درپے ہیں، انسان کو صرف ایک دفعہ موت آتی ہے، اس سے ڈرنا لاحاصل ہے، اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ وہ کب آئے اور کہاں آئے؟ میں اپنی ذات کو مع اپنی اولاد کے دینِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر نثار کرنے کا فیصلہ کرچکا ہوں، یہ سن کر میر حبیب اللہ خاموش ہوگیا۔

ادھر آفتاب معمول کے مطابق طلوع ہورہا تھا، لیکن ادھر سلطان کا نیّرِ اقبال ڈوب رہا تھا، آج تاریخِ انسانی خودداری و آزادی کا ایک باب ختم کرکے غلامی کا ایک نیا باب شروع کرنے والی تھی سرزمین سری رنگا پٹنم بھی اپنے مالکِ حقیقی سے گریاں کناں تھی کہ آج سے اس کی پشت پر پاک روحوں کی جگہ ناپاک روحوں کی حکمرانی کا آغاز ہونے والا ہے، انگریز اپنے منصوبے کے مطابق اپنی تمام تیاریوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچا چکے تھے، ابلیسِ لعین اپنے چیلوں کے ذریعہ اپنے ناپاک عزائم کو عملی جامہ پہنتے دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا، قلعہ کے اندر، باہر ہر جگہ سازشیں مکمل ہوچکی تھیں، ضمیر فروشی و ملت فروشی کا سودا مکمل ہوچکا تھا اور غدارانِ ملک و ملت کی طرف سے سلطان کی تیاریوں کی تمام خبریں بھی پوری تفصیل کے ساتھ ویلزلی کو مل رہی تھیں، میر صادق اپنے اخوان الشیاطین کے ساتھ مل کر انگریزوں کو قلعہ پر حملہ کا پورا منصوبہ سمجھا چکا تھا، اس خبیثِ ننگِ دین و ننگِ وطن کی باتوں و وعدوں پر انگریزوں کے

بھروسہ کرنے کی سابق تجربات کی روشنی میں کوئی وجہ بھی نہیں تھی، مگر [illegible] سپاہیوں سے زیادہ سلطانی افواج کے ان ضمیر فروشوں پر بھروسہ تھا جو سلطان کی پیٹھ میں چھرا گھونپ چکے تھے، ناامیدی اور مایوسی کے اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں بھی امید کی ایک شمع روشن تھی، یہ سلطان کے وفادار و جاں نثار سپاہیوں کا وہ دستہ تھا جس نے اپنے وطن و مذہب کی حفاظت کے لئے آخری دم تک اس کے شانہ بشانہ لڑنے کا اپنے خدا سے عہد کیا تھا، ان کے سب نے [illegible] کے ارادوں کو ان کی منشاء و دعا کے مطابق اب تک [illegible] رکھا تھا، وقت کے [illegible] ساتھ ان میں اپنے رب سے ملنے اور جنت میں پہنچنے کا اشتیاق بڑھ رہا تھا، [illegible] والی وہ جمعیت تھی جس کے بعض سپاہیوں کے ناموں سے خود سلطان بھی ناواقف تھا، [illegible] کی نورانیت و بشاشت یہ گواہی دے رہی تھی کہ یہ اپنے خون کے آخری قطروں سے اپنے وطن کی ایک سنہری تاریخ لکھنے جارہے ہیں، اس طرح آج نہ صرف تاریخِ اسلامی بلکہ تاریخِ انسانی کا ایک اہم [illegible] شروع ہونے والا تھا اور وہ وطن کی مکمل صبحِ آزادی کا خواب دیکھنے والے اس [illegible] کی زندگی کا تقدیرِ الٰہی کے مطابق آخری دن بھی تھا۔[1]

میر صادق موت کے گھاٹ

جعفر از بنگال صادق از دکن • ننگِ قوم ننگِ دین ننگِ وطن

سلطان ٹیپو بڑی دیر تک انگریزی افواج سے لڑتا رہا، جب دشمنوں کا ہجوم بڑھتا گیا تو [illegible] دروازہ سے واپس شہر میں داخل ہونے کی کوشش کی، لیکن میر صادق اس طرف سلطان کو [illegible] اس دروازے کو بند کرکے خود کمک لانے کے بہانے باہر نکل چکا تھا، سلطان کے ایک وفادار سپاہی احمد خان سے اس کی یہ کمینی حرکت دیکھی نہ گئی، اس نے فوراً میر صادق پر یہ کہتے ہوئے وار کیا کہ سلطان کو دشمنوں کے منہ میں دے کر خود کہاں بچ کر جارہا ہے، ایک ہی وار میں اس کا سر تن سے جدا ہوگیا، [illegible] تک اس کی لاش اسی جگہ پڑی سڑتی رہی، پورا حلیہ بگڑ گیا تھا، بعد میں چند لوگوں نے جمع ہوکر اس کی لاش کو زمین میں دفن کردیا، اس کی قبر کے پاس سے جب بھی کوئی گزرتا تو اس پر ضرور تھوکتا۔ غدار میر معین الدین بھی اسی دن ایک خندق میں گر کر مرگیا۔[2]

[1] [2] سیرت سلطان ٹیپو شہید ص ٦٣

شیر کا ایک دن گیدڑ کے سو سال سے بہتر ہے

مغرب کا وقت قریب تھا، گھمسان کی لڑائی جاری تھی، مرد تو مرد ہندو، مسلم خواتین تک بڑھ کر دشمنوں پر حملہ کر رہی تھیں، ایک ایک کر کے اکثر جانثار شہید ہو کر اپنی وفاداری کا ثبوت دے چکے تھے، اور ان کی لاشیں ہر جگہ بکھری پڑی تھیں، اسی دوران سلطان کے نومسلم خادم راجہ خان نے سلطان کو آواز دی کہ حضور اگر اب بھی اپنی جان کی حفاظت کے لئے خود کو دشمن کے حوالہ کر دیں تو وہ آپ کے منصب پاس رکھ کر آپ کی جان کو بخش دیں گے، سلطان یہ الفاظ سن کر جلال میں آ گیا، غصہ سے کانپتے ہوئے پلٹ کر بلند آواز سے کہنے لگا کہ:

"میرے نزدیک شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے"

کچھ ہی دیر میں سلطان کے گھوڑے طاؤس کی پیٹھ میں گولی لگی، جس سے وہ گر گیا اور سلطان بھی زمین پر آ گیا، اور اس کی دستار بھی سر سے الگ ہو گئی، اب سلطان پیدل ہی لڑ رہا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے کئی انگریز افسر سلطانی تلوار کی زد میں آ کر جہنم رسید ہو گئے، گولیوں کے دو شدید زخموں سے اب ٹیپو کی طاقت جواب دے رہی تھی، پھر بھی شیر دل سلطان تھک کر بیٹھنے کے بجائے لڑ ہی رہا تھا، اس کے سپاہی جو گولے دشمن پر پھینک رہے تھے اس میں بارود کے بجائے میر صادق کی سازش سے مٹی بھری ہوئی تھی، نتیجہ یہ تھا کہ اس سے ان کو کوئی نقصان نہیں ہو رہا تھا، غداروں کی اطلاع پر دشمنوں کی پوری طاقت اس جگہ سمٹ کر آ گئی تھی جہاں سلطان ان سے لڑ رہا تھا۔[1]

آفتابِ حریت شہید ہو گیا

صبح سے شروع ہوئی لڑائی کا یہ سلسلہ عصر کے بعد بھی برابر جاری تھا، دست بدست دشمنوں سے مقابلہ کی وجہ سے سلطان کے جسم پر اب تک کئی گولیاں پیوست ہو چکی تھیں اور وہ بری طرح زخمی ہو چکا تھا، مغرب کا وقت قریب تھا آسمان پر جس طرح سورج دن بھر کی مصروفیت کے بعد ڈوب کر دنیا کو ظلمت میں پہنچانے والا تھا، اسی طرح وطن کی حریت کا یہ آفتاب بھی اپنی پچاس سال کی زندگی کی مسلسل جدوجہد

[1] سیرت سلطان ٹیپو شہید ص ۳۳۵

ری پیہم کے بعد تھک کر مائل بغروب ہی تھا، اسی دوران دور سے دشمن کے ایک سپاہی نے سلطان کی کنپٹی کو ایک فائر سے نشانہ بنایا، گولی دائیں کان کے ذرا اوپر لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے سلطان زمین پر گر گیا اور اسی وقت اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی، "انا للّٰہ وانا الیہ راجعون" یہ مغرب کا وقت تھا، تاریکی پھیل رہی تھی، ہر طرف لاشوں کا انبار تھا، بارہ ہزار سلطانی سپاہی صرف اس دن وطن کی آزادی کے لئے اپنی جان نثار کر چکے تھے۔[1]

سقوطِ سری رنگا پٹنم

سلطان کی شہادت اور بارہ ہزار وفاداروں کی وفاداری کے ساتھ ہی جس میں سینکڑوں ہندو مسلم عورتیں اور بعض شاہی خواتین بھی شامل تھیں میسور کی یہ چوتھی اور فیصلہ کن جنگ ختم ہو گئی، جس کے بعد دارالسلطنت پر دشمنوں کا مکمل قبضہ ہو گیا، انگریز جنرل ہارس سلطان کی لاش کے قریب پہنچ کر فرطِ مسرت سے چیخ اٹھا کہ---------"آج سے ہندوستان ہمارا ہے"

سلطان کیا شہید ہوا ملک کی آزادی کا ایک سنہرا اور آخری باب ختم ہوا، تاریخ نے پھر ایک بار کروٹ لی، ہندوستان کی سیاسی موت ہو گئی، ملک میں آزادی کا پرچم سرنگوں ہو گیا، وطن کا تابناک ماضی اور روشن حال اور پر امید مستقبل ان شہدائے حریت کی لاشوں میں دب گیا۔

تجہیز و تکفین

دوسرے دن ۵ رمئی کو جنرل ہارس نے اسلامی رسومات کے مطابق سلطان کی تجہیز و تکفین کی اجازت دی، زوال آفتاب کے بعد جنازہ محل سے روانہ ہوا، سلطان کی زندگی کے چار خادم خاص جنازہ کو کندھا دے رہے تھے، ساتھ میں شہزادہ عبدالخالق کے علاوہ دیگر عہدے دار اور عمائدین سلطنت بھی تھے، انگریز فوج کی چار کمپنیاں میت کے پیچھے پیچھے چل رہی تھیں، محل، گلیاں اور بازار سنسان تھے، جنازے میں سب سے آگے قاضیٔ شہر تھے جو قرآنی آیات بلند آواز سے پڑھ رہے تھے، راستہ میں بلا

[1] سیرت سلطان ٹیپو شہید ص ۳۳۵

تفریقِ مذہب وملت مزید لوگ اس جلوس میں شامل ہوتے گئے، ہندو عورتیں اپنے سروں پر مٹی ڈال کر ماتم کر رہی تھیں اور مسلمان خواتین جنازہ کو دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر روتیں اور اپنے سروں کے بالوں کو نوچتی تھیں۔

لال باغ پہنچنے کے بعد چار انگریز کمپنیوں کے ہتھیار بند سپاہیوں نے اپنے ہتھیار بھی نیچے کر لئے، قاضی شہر نے نماز جنازہ پڑھائی پھر نعش کو لال باغ میں حیدر علی کے پہلو میں بڑے احترام اور پرنم آنکھوں کے ساتھ دفن کیا گیا۔

غرض یہ کہ وطن عزیز کا یہ قابل فرزند غروب آفتاب سے پہلے پہلے منوں مٹی کے نیچے قبر کی شکل میں جنت کے باغوں میں پہنچ چکا تھا، اور مادی تھکاوٹ کی زندگی سے منتقل ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کی راحت کی طرف جا چکا تھا، اور اہلِ وطن افسردہ دلوں اور نم دیدہ آنکھوں کے ساتھ اس کو الوداعی سلام کر رہے تھے، جو سیماب اکبر آبادی کے الفاظ میں کچھ اس طرح تھا:[1]

اے شہید مرد میدانِ وفا تجھ پر سلام
تجھ پہ لاکھوں رحمتیں لاانتہا، تجھ پر سلام
ہند کی قسمت ہی میں رسوائی کا سامان تھا
ورنہ تو ہی عہد آزادی کا ایک عنوان تھا
اپنے ہاتھوں خود تجھے اہل وطن نے کھو دیا
آہ کیسا باغ باں شام چمن نے کھو دیا

ٹیپو کے زوال سے ہندوستانی سیاست پر اثر

۱۷۹۹ء میں ٹیپو کی شہادت اور سلطنتِ خداداد کے زوال کے بعد انگریزوں کے مقابلہ کے لئے پورے ہندوستان میں کوئی بڑی طاقت نہیں رہ گئی تھی، ملک میں ان کے توسیع پسندانہ عزائم کی راہ میں یہی سب سے بڑی رکاوٹ تھا، ان کی شہادت کے بعد ہی ان کی زبان سے پہلی دفعہ یہ معنی خیز جملہ نکلا کہ "آج سے ہندوستان ہمارا ہے" ٹیپو کی زندگی میں خود اُن کے مطابق ان کی زبان سے ان الفاظ کی ادائیگی بے معنی تھی، ۱۸۰۰ء میں نظام حیدر آباد سے اپنا مطلب پورا کر لینے کے بعد اس کی بچی رہی کی خود مختاری چھین لی گئی، اس کو دیئے گئے تمام مقبوضات ایک ہی سال کے اندر واپس لے لئے گئے اور

---

[1] سیرت سلطان ٹیپو شہید

بھی اس کا عملاً محکوم بن کر رہ گیا، پہلی ہی دھمکی میں خود اس نے اپنے نئے مقبوضات بڑی بے شرمی سے ان کے حوالے کر دیئے، ادھر پونا میں مرہٹہ سردار نانا نے جب ٹیپو کی شہادت کی خبر سنی تو بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا کہ "ٹیپو کیا ختم ہو گیا، برطانوی طاقت میں اضافہ ہو گیا، اب پورا ہندوستان ان کا ہے" ایک اور مرہٹہ سردار نے کہا کہ ٹیپو کا مارا جانا میرے داہنے بازو کے کٹ جانے کے برابر ہے، ناگپور کے رگھوجی بھونسلے، پونا کے نانا فرنویس، اندور کے تکوجی ہلکر اور سندھیا وغیرہ کی افواج مل کر بھی جو مجموعی طور پر ٹیپو کی افواج سے کہیں زیادہ تھیں کمپنی کا مقابلہ نہیں کر سکیں، ۱۸۰۳ء میں فرخ آباد کے مقام پر ہلکر کی افواج کو انگریزوں نے شکست فاش دی اور ۱۸۰۳ء میں دہلی کے آس پاس موجود تمام مرہٹہ سرداروں سندھیا اور بھونسلے وغیرہ کی افواج کو کمپنی نے شکست دے کر آگرہ اور علی گڑھ میں اس کے مقبوضات پر بھی قبضہ کر لیا، بڑودہ اور گجرات پر قبضہ کے بعد انگریزوں نے پونا میں پہلے اپنا ریزیڈنٹ مقرر کیا اور پھر ۱۸۱۸ء میں اس پر بھی قبضہ کر لیا، ادھر میسور کے نوعمر ہندو راجہ نے بھی چند ہی دنوں میں اپنے تمام علاقے کمپنی کے حوالہ کر کے برائے نام ہی میسور کے تخت پر فائز رہنا گوارا کیا، دہلی کا شاہ عالم بھی انگریزوں کی پناہ میں آ گیا اور اس کی حیثیت بھی عملاً کمپنی کے باج گزار کی بن گئی، ۱۸۳۵ء میں اس کا نام سکوں سے بھی خارج کر دیا۔

۱۸۴۳ء میں انگریزوں نے سندھ کو بھی اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا، ۱۸۵۶ء میں اودھ کی برائے نام حکومت بھی ختم کر دی گئی، سکھوں کے ساتھ دو لڑائیوں کے بعد ۱۸۴۹ء میں ہی ان کی حکومت چلی گئی تھی، شاہ عالم کے بعد اکبر شاہ دوم اور بہادر شاہ بھی ۱۸۵۷ء تک صرف لال قلعہ ہی پر حکومت کرتے رہے اور انگریزوں کی طرف سے ملنے والے وظیفوں پر ان کا انحصار رہا، ۲۲ر ستمبر ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں سینکڑوں سالوں سے چلی آ رہی اسلامی سلطنت اور مغلیہ کے آخری تاج دار بہادر شاہ ظفر کو بھی انگریزوں نے قید کر کے رنگون جلا وطن کر دیا، جہاں اس کا ۱۸۶۲ء میں اسی حالت میں انتقال ہو گیا۔

غرض یہ کہ ٹیپو کی شہادت کے اثرات ہندوستان کی سیاست میں صرف اٹھاون سال میں ہی ظاہر ہو گئے اور پورے ملک پر ان کا قبضہ ہو گیا اور ان کی شمالی سرحدیں دَرّہ خیبر تک پھیل گئیں۔

سلطنتِ خداداد کے زوال کا اثر عالمِ اسلام پر

ٹیپو کی شہادت سے پہلے عالم اسلام کے مختلف مسلم ممالک کے پاس دنیا کا جملہ رقبہ ۱۷% تناسب کے ساتھ کل ایک کروڑ ستاون لاکھ مربع میل رقبہ تھا، حالانکہ اس وقت بھی مغربی سامراج کی مسلم ممالک

Scanned by CamScanner

پر قبضہ کے لئے ریشہ دوانیاں جاری تھیں، لیکن اس وقت اسلامی دنیا کا سب سے بڑا ملک ہندوستان تھا اور ہندوستان میں بھی ان کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ ٹیپو ہی تھا، اس لئے اس کے ہوتے ہوئے ان کو اپنے ناپاک مقاصد میں خاطر خواہ کامیابی نہیں مل سکی، جب یہ دیوار اُن کے راستہ سے ہٹ گئی تو انہیں اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں دیر نہ لگی، صرف نصف صدی کے اندر پہلے تو پورے برصغیر پر ان کا قبضہ مکمل ہوگیا، اس کے بعد عالم اسلام کے مختلف سولہ ممالک جن میں سے ایشیا کے دس ملیشیا، بیرونی، عراق، قطر، عمان، مالدیپ، کویت، بحرین، عرب امارات اور اردن اور افریقہ کے چھ مصر، سوڈان، نائجیریا، یوگینڈہ، تنزانیہ اور کینیا پر ان کا قبضہ ہوگیا، آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اس کے نتیجہ میں ٹیپو کی شہادت کے صرف پچاس ساٹھ سال کے اندر عالمِ اسلام کا رقبہ ۱۷٪ سے گھٹ کر ۵٪ (یعنی ایک کروڑ ۵۷ لاکھ مربع میل کے بجائے صرف ۴۵ لاکھ مربع میل ہوگیا، دوسرے الفاظ میں پوری تیرہ (۱۳) سو سالہ اسلامی تاریخ کا یہ سب سے بڑا سیاسی زوال تھا، اگر ٹیپو کچھ سال اور زندہ رہتا تو اتنا جلد شاید انگریزوں کو ہندوستان سے فرصت ہی نہ ملتی اور ان کے لئے اس کے بعد عالم اسلام کے دوسرے حصوں پر توجہ دینے کی نوبت بھی نہیں آتی، اس طرح ٹیپو کی شہادت اور سلطنتِ خداداد کے زوال کا عالمِ اسلام کو بحیثیت ایک مبلغ اسلام نہ صرف دینی نقصان ہوا، بلکہ بحیثیت ایک مسلم حکمراں اس کی شہادت سے عالم اسلام کی سیاست پر بھی غیر معمولی اثرات مرتب ہوئے، گویا ٹیپو کا انگریزوں کے مقابلہ میں وجود ہی ان کی توجہ کو اسلامی دنیا کے دوسرے علاقوں پر بانٹنے سے روکے ہوئے تھا۔

شاہ عبدالعزیزؒ کا قائدانہ کردار انگریزوں کے خلاف

شاہ صاحبؒ کے بعد ان کے صحیح جانشین اور علم و بصیرت اور غیرت وحمیت دینی کے وارث ان کے فرزند ارجمند سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنے والد نامدار کے شروع کئے ہوئے کام کو نہ صرف جاری رکھا، بلکہ اس کی توسیع وتکمیل کی کوشش کی اور سیاسی حالات کی تبدیلی کے ساتھ اپنی توجہ اس وقت کے سیاسی میدان کے اصل حریف اور حقیقی طاقت (انگریزی اقتدار) کی طرف موڑ دی جس نے اب خطرہ سے بڑھ کر واقعہ کی شکل اختیار کرلی تھی۔

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موج تند جولاں بھی نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہہ و بالا

شاہ عبدالعزیزؒ کے بعد انہی کے دانش گاہ کے دو تربیت یافتہ صاحب عزیمت داعی و مصلح حضرت

سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید نے حضرت شاہ صاحب کے سیاسی نقشہ میں رنگ بھرنے کی کوشش کی اور اس کو خلافت علی منہاج النبوۃ کی اساس پر قائم کرنے کے لئے اپنی جان کی بازی لگادی، انہوں نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات اور ان کی دی ہوئی روشنی سے کتنا فائدہ اٹھایا۔ ان کے عزائم کتنے بلند، ان کی نگاہ کتنی دور بیں، ان کا قلب کتنا وسیع اور فراخ تھا، وہ پنجاب کے مسلمانوں کو سکھوں کی قومی حکومت کے استیصال کی اس طرح کی فوری مصیبت سے بچانے کے بعد (جس طرح شاہ ولی اللہ نے مرہٹوں اور جاٹوں کے روزمرہ کے قتل وغارت گری سے اپنے وقت کے ماحول ومعاشرہ کو بچانے کی کوشش کی تھی) اور انگریزوں کو وہ "بیگانگان، بعید الوطن وتاجران متاع فروش" کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں نکالنے کے بعد ہندوستان کو آزاد کرانا اور اسلام کے عدل ومساوات کے اصول پر اس کا نظم ونسق قائم کرنا چاہتے تھے۔

اس کا اندازہ ان کے مکاتب سے ہوتا ہے جو انہوں نے سلاطین وقت امراء نامدار، صاحب حمیت مسلمانوں اور ہوش مند والیان ریاست کو لکھے ہیں۔

شاہ عبدالعزیزؒ جو دہلی میں مصروف درس وافادہ تھے لیکن ان کی حقیقت بین نگاہیں سارے ہندوستان پر تھیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو غیر معمولی طور پر حقیقت پسند ذہن اور صاحب حمیت وعزیمت طبیعت عطا فرمائی تھی، اس انقلاب کا پورا جائزہ لیا اور اس نتیجہ تک پہنچ گئے کہ اس وقت بچے کھچے اسلامی اقتدار اور اس ملک میں مسلمانوں کے مستقبل کے لئے خطرہ انگریز ہیں، شاہ عبدالعزیز نے سب سے پہلے اس وقت ہندوستان کو دارالحرب قرار دینے کی جرأت کی اور صورت حال کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے ہوئے فقہ واصول فقہ کی روشنی میں مسئلہ کی ایسی تنقیح کی جس سے ان کی بصیرت کا اظہار ہوتا ہے اور اخلاقی ودینی جرأت کا بھی۔

شاہ صاحب نے اس خطرہ کے پہچاننے میں جو مسلمانوں اور ہندوستان کو درپیش تھا خداداد بصیرت اور مومنانہ فراست سے کام لیا، اور اس کے لئے وہ اپنے زمانہ میں جو تدبیر کرسکتے تھے اس میں کوئی کمی نہیں کی، ان کی یہی بصیرت اور جذبہ ان سے انتساب رکھنے والی جماعت مجاہدین (جس کی قیادت حضرت سید احمد شہید اور شاہ صاحب کے بھتیجے حضرت شاہ اسمٰعیل شہید کر رہے تھے) میں پورے طور پر کارفرما نظر آتا ہے اور جس کا پورا مظاہرہ مولانا ولایت علی عظیم آبادی، مولانا یحییٰ علی صادق پوری، مولانا احمد اللہ و مولانا عبداللہ صاحب انگریزوں کے خلاف سرحدی جنگوں اور صادقین صادق پور کی عظیم قربانیوں میں جلوہ فگن ہے جن کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

پھر یہ جذبہ اس جماعت سے ان علماء اور دینی قائدین کی طرف منتقل ہوا، جنہوں نے ۱۸۵۷ء میں اس

Scanned by CamScanner

کے لئے جان کی آخری بازی لگا دی اور جن میں مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی، مولانا لیاقت علی الہ آبادی، حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی اور حضرت حافظ ضامن شہیدؒ کے نام معروف و مشہور ہیں اور اس کے بعد ان علماء کی طرف جنہوں نے اس شمع کو روشن رکھا اور ۱۹۴۷ء تک اسی کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح جاری رکھا۔

ع خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

غیر منقسم ہندوستان کی سب سے بڑی تحریک جہاد

سب سے بڑا مہتم بالشان اور انقلاب انگیز تحریک جہاد کا احیاء ہے جو اس دور میں باوجود انتہائی ضرورت اور حالات کے تقاضے کے بالکل فراموش ہو چکا تھا، وعظ، درس اور عمل کسی جگہ بھی اس کا وجود نہ تھا، مدارس میں بقول حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ مسائلِ حیض و نفاس کے برابر بھی اس کی طرف توجہ اور اس کی اہمیت نہیں رہی تھی، مسلمانوں کے قویٰ مضمحل ہو رہے تھے، حوصلے پست ہو چکے تھے اور فاتح اور زندہ اقوام کی خصوصیات رخصت ہو رہی تھیں حتّٰی کہ ہتھیار لگانا تقدس اور مشیخت کے خلاف سمجھا جانے لگا تھا اور انحطاط نمائی ہوتی تھی، مسلمان کفر کا غلبہ اور اپنی مظلومی برداشت کرنے کے عادی ہوتے جا رہے تھے جو نہایت مضر تھا۔

ہندوستان کے اس نازک ترین اور پر آشوب دور کا مقابلہ کرنے سے مسلمان غافل تھے، سید احمد شہیدؒ نے اس زمانے میں جہاد کا نام لیا، علانیہ اس کی تعلیم و تبلیغ کی، منبروں پر بیان کیا، سارے ملک اور بیرونی ملک میں اپنے داعی اور مبلغ بھیجے، سینکڑوں آتشیں خطوط لکھے جن کا ایک ایک فقرہ شمشیر وسنان کا کام کرتا تھا، اہلِ ایمان کو غیرت دلائی، علماء کو ان کا فریضہ یاد دلایا، عوام و خواص کے دلوں پر اس کی دینی عظمت و تقدس کا نقش بٹھایا، علماء و شرفاء کو اس میں شریک کر کے لوگوں کی جھجک دور کی اور خود اس میں فنا ہو کر مشائخ اور بزرگانِ اُمت کے لئے اُسوہ چھوڑا پھر جہاد کر کے سارے ہندوستان میں سرفروشی اور جان بازی کی روح پھونک دی، اور ایک ایسی قوم پیدا کر دی جس کے سر میں قرنِ اول کا نقشہ اور دلوں میں صحابہ رضی اللہ عنہم کا سا ولولہ تھا۔[1]

ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط

اس جدوجہد کے اصل مقاصد اور اسباب کیا تھے؟ خود سید صاحبؒ نے اپنے خطوط و مکاتب میں اپنے اصلی جذبات و خیالات کا اظہار جابجا فرمایا ہے، ذیل میں ان تحریرات کے چند اقتباسات پیش کئے

[1] سیرت سید احمد شہید جلد دوم ص ۵۴۳

جاتے ہیں: یہ خطوط آپ نے علماء، شرفاء اور امراء کو لکھے ہیں۔ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں "جناب کو خوب معلوم ہے کہ یہ پردیسی سمندر پار کے رہنے والے دنیا جہاں کے تاج دار اور یہ سودا بیچنے والے سلطنت کے مالک بن گئے ہیں، بڑے بڑے اہلِ حکومت کی حکومت اور ان کی عزت و حرمت کو انہوں نے خاک میں ملا دیا ہے، جو حکومت و سیاست کے مرد میدان تھے وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں، اس لئے مجبوراً چند غریب و بے سروسامان کمر ہمت باندھ کے کھڑے ہو گئے اور محض اللہ کے دین کی خدمت کے لئے اپنے گھروں سے نکل آئے، یہ اللہ کے بندے ہرگز دنیادار اور جاہ طلب نہیں، محض اللہ کے دین کی خدمت کے لئے اٹھے ہیں مال و دولت کی ان کو ذرہ بھر طمع نہیں" دوسرے خط میں لکھتے ہیں "ملک ہندوستان کا بڑا حصہ غیر ملکیوں کے قبضہ میں چلا گیا ہے اور انہوں نے ہر جگہ ظلم و زیادتی پر کمر باندھی ہے، ہندوستان کے حاکموں کی حکومت برباد ہو گئی، کسی کو ان کے مقابلے کی تاب نہیں، بلکہ ہر ایک ان کو اپنا آقا سمجھنے لگا ہے، چونکہ بڑے بڑے اہلِ حکومت ان کا مقابلہ کرنے کا خیال ترک کر کے بیٹھ گئے ہیں، اس لئے چند کمزور و بے حقیقت اشخاص نے اس کا بیڑا اٹھایا ہے۔"

مقصود اصلی ہندوستان ہے

اور ایک خط میں کسی شاہزادہ کو تحریر فرماتے ہیں "اس ملک (سرحد) کو مشرکین کی نجاستوں سے پاک کرنے اور منافقین کی گندگی سے صاف کرنے کے بعد حکومت و سلطنت کا استحکام اور ریاست و انتظام سلطنت کی استعداد رکھنے والوں کے حوالہ کر دیا جائے گا، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ احسانِ خداوندی کا شکر بجا لائیں گے اور ہمیشہ ہر حال میں جہاد کو قائم رکھیں گے اور مقدمات کے فیصلے شرع شریف کے قوانین سے بال بھر بھی تجاوز نہیں کریں گے، اس کے بعد میں اپنے مجاہدین کے ساتھ ہندوستان کا رخ کروں گا، تاکہ اس کو شرک و کفر سے پاک کیا جائے، اس لئے کہ میرا مقصود اصلی ہندوستان پر جہاد ہے نہ کہ ملکِ خراسان (سرحد و افغانستان) میں سکونت اختیار کرنا۔

ریاست گوالیار کے ایک مسلمان عہدے دار غلام حیدر خان کے نام ایک مکتوب میں مزید تحریر فرماتے ہیں۔ "اس صورت میں بڑے سرداروں کے لئے مناسب یہی ہے جو سالہا سال سے اپنی مسند ریاست پر چلے آ رہے ہیں کہ اس وقت ان کمزوروں کی ہر طرح امداد کریں اور اس بات کو اپنی حکومت کے استحکام کا باعث سمجھیں۔"

Scanned by CamScanner

ان اقتباسات سے بلاشبہ ظاہر ہوتا ہے کہ سید صاحبؒ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بڑھتے ہوئے اثر و تسلط اور انگریزی اقتدار کو حقیقی خطرہ سمجھتے ہیں اور اس خطرے کے ازالہ اور ان "بیگانگانِ بعید الوطن" اور "تاجرانِ متاع فروش" کے اخراج کے لئے غیر مسلم والیانِ ریاست اور اہلِ حکومت و طاقت کو اپنے ساتھ جدوجہد کرنے اور تعاون کی دعوت دیتے ہیں، جو اُن کی اعلیٰ سیاسی بصیرت کی دلیل ہے، اس کے ساتھ وہ ان کو یقین دلاتے ہیں کہ اس منظم اور متحد مقابلے اور جدوجہد ہی میں ان کی ریاست اور طاقت کی بقاء ہے کہ انگریزی غلبہ اور اقتدار کا یہ سرطان ہندوستان کے جسم سے خارج کر دیا جائے اور ملک کو اس غیر ملکی طاقت کے چنگل سے نکال لیا جائے۔[1]

سرحد کا انتخاب اور پنجاب و افغانستان کے حالات

سید صاحبؒ کے نزدیک اگرچہ مقصودِ اصلی ہندوستان تھا، لیکن پنجاب میں جس پر کچھ عرصہ سے رنجیت سنگھ کی باقاعدہ حکومت قائم ہو گئی تھی مسلمانوں کے ناگفتہ بہ حالات، ان کی فوری امداد کی ضرورت جو ایک شرعی فریضہ تھا، نیز فوجی مصالح اور سیاسی تدبر کا تقاضا تھا کہ یہ مہم ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد سے شروع کی جائے جو طاقتور و پرجوش افغانی قبائل کا مرکز ہے اور جہاں سے ترکستان تک آزاد مسلمان حکومتوں کی ایک مسلسل زنجیر ہے، نقشہ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ پنجاب کے مسلمانوں کی امداد ہندوستان کی دوبارہ تسخیر اور ایک طاقتور اسلامی ملک کے قیام کے لئے بظاہر اس سے زیادہ موزوں مقام نہیں ہو سکتا۔

سید صاحبؒ کی نگاہ کے سامنے ان لوگوں کا انجام تھا جنہوں نے ہندوستان کے کسی حصہ کو اپنی تحریک اور جنگی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور بہت جلد ان کے گرد سازشوں، مخالفتوں اور ریشہ دوانیوں کا ایک جال پھیلا دیا گیا، جس میں وہ جکڑتے چلے گئے، اور ان کے ہاتھ پاؤں بندھ کر رہ گئے، انگریزوں کی زیرک و پرفن حکومت حوصلہ مند قائد اور اپنے ہر مخالف کے لئے ایسے حالات پیدا کر دیتی تھی کہ اس کی جنگی کارروائیوں اور آزادانہ سرگرمیوں کا میدان تنگ سے تنگ ہوتا چلا جاتا اور بہت جلد محسوس کر لیتا کہ وہ ایک قفس میں محبوس ہے اور بالکل بے بال و پر اور بے دست و پا رہ گیا ہے، نواب امیر خان کا سارا معاملہ سید صاحبؒ کی نظر کے سامنے تھا کہ انگریزوں کے جوڑ توڑ سے وہ کس طرح اکیلا رہ گیا اور کس طرح انہوں نے اس کے مختلف سرداروں کو اس سے توڑ لیا، اور ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ وہ اپنے کو

۱ سیرت سید احمد شہید، حصہ اوّل، ص ۳۹۲ تا ۳۹۴

...ہا اور مصالحت پر مجبور سمجھنے لگا، اس سے پہلے ہندوستان کے دورِ آخر کے سب سے بڑے صاحب عزم امیر ٹیپو سلطان کو انہوں نے کس طرح سب سے کاٹ لیا تھا اور کس طرح اُسے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا کہ آخر اس جوان مرد نے تنہا سرخروئی حاصل کی اور ہندوستان کے کسی والیِ ریاست یا امیر نے اس کا ساتھ نہیں دیا، یہ سید صاحبؒ کی بہت بڑی سیاسی بصیرت تھی کہ انہوں نے ہندوستان کے اندر اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں کا مرکز نہیں بنایا، جس کے لئے بہت جلد ایک ایسا جزیرہ بن جانے کے قوی امکانات تھے، جس کے چاروں طرف مخالفتوں، مزاحمتوں اور سازشوں کا ایک سمندر پھیلا ہوا ہوتا اور جس کو کہیں سے کمک یا رسد ملنے کی کوئی توقع نہ رہتی۔

تو نے دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن، اندرون چنگیز سے تاریک تر

اس مرکز یعنی ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد کے انتخاب میں اس بات نے بھی مدد دی ہوگی کہ افغانوں کی جواں مردی، سپہ گری، جنگی صلاحیت اور شجاعت و جسارت کی ہندوستان میں بڑی شہرت تھی، جو افغانی ہندوستان کے مختلف حصوں میں عرصہ سے سکونت پذیر ہو گئے تھے، وہ ان مردانہ اوصاف کے حامل اور سپہ گری میں ممتاز تھے۔

سید صاحبؒ اس انتخاب میں حق بجانب تھے، پنجاب میں مسلمان جس نازک دور سے گزر رہے تھے اور جن مظالم اور اہانتوں کا نشانہ بن رہے تھے، سارے ملک پر جو بے حمیتی اور بے حسی طاری تھی، افغانستان و سرحد اپنی بہترین فوجی صلاحیتوں کے باوجود کسی دینی دعوت کے نہ ہونے کی وجہ سے جس طرح چھوٹے چھوٹے مناقشات اور حقیر منافع و مقاصد کے لئے اپنی اس طاقت کو جو تنظیم اور دینی روح کے بعد سارے ہندوستان کو فتح کر لینے کے لئے کافی تھی، ضائع کر رہے تھے، ان سب حقائق کا تقاضا تھا کہ ایک صاحب حمیت و عزم انسان جس کے سینے میں حمیت اسلامی کا دریا موجزن ہو اور جس کے ساتھ مخلصین و صادقین اور جاں بازوں کی ایک منتخب جماعت ہو، وہ اپنا کام ایسے رخ سے شروع کرے جہاں ایک طرف وہ اس عظیم الشان طاقت کو صحیح مصرف پر لگائے، دوسری طرف پنجاب کے ان مسلمانوں کی مدد کرتا ہو جو ظلم کی اس چکی میں پس رہے تھے، ہندوستان کی طرف بڑھے اور اس ملک کو فرنگی تسلط سے آزاد کرتا ہوا صحیح اسلامی حکومت قائم کرے۔[1]

۱ سیرت سید احمد شہید حصہ اوّل ص ۳۹۲ تا ۳۹۴

Scanned by CamScanner

پنجاب میں مسلمانوں کی حالت

اٹھارہویں صدی کے وسط میں سکھوں نے پنجاب میں اہم سیاسی طاقت حاصل کر لی تھی، احمد شاہ ابدالی کی وفات پر شمالی ہندوستان میں سکھ ہی اصل طاقت تھے، پورا پنجاب، ملتان کا ایک حصہ، جمنا اور ستلج کے درمیان کا سب سے بڑا علاقہ سکھ رئیسوں اور سرداروں کے قبضہ میں تھا، شمال مغرب میں دریائے سندھ، مشرق میں جموں کی ریاست، جنوب میں انگریزی عملداری اور حصار اور جیسلمیر کے ریگستان ان کے وسیع اقتدار کی سرحدیں تھیں۔

یہ بالکل قدرتی بات تھی کہ جب اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر سکھوں کے ہاتھ میں منتقل ہوا تو اس انقلاب کا سب سے زیادہ اثر مسلمانوں پر پڑا، جو کل تک اس ملک کے حکمراں اور اس بڑھتی ہوئی طاقت کے راستے میں مزاحم تھے، اب پنجاب میں مسلمان ایک ایسی غلام قوم کے فرد تھے جس سے حاکموں کی قدیم سیاسی رقابت بھی تھی اور شدید مذہبی نفرت بھی، ۱۷۹۹ء میں رنجیت سنگھ نے ایک ایک کر کے وہ تمام ریاستیں اور صوبے جو خود مختار سکھ سرداروں اور مسلمان حکمرانوں کے پاس تھے فتح کر لیے، جن مسلمان ریاستوں نے نذرانے دینے سے انکار کیا اور مقابلہ کیا ان کو بے تربیت اور نیم وحشی اور فتح کے نشہ میں سرشار فوجوں کے ہاتھوں سخت عذاب کا سامنا کرنا پڑا، ان کے شہر اکالیوں اور خالصہ فوج کے ہاتھوں بُری طرح تباہ و برباد ہوئے اور مسلمان رعیت کو لرزہ خیز مظالم کا نشانہ بننا پڑا، احمد خان رئیس جھنگ کی شکست کے بعد سکھوں نے شہر کو لوٹ لیا اور تمام رعیت کو روٹی کے ٹکڑوں کا محتاج کر دیا، اور اس بات کی فریاد چودھریوں نے جب مہاراج سے کی تو فرمایا کہ ہماری فتح یاب فوج فتح کے وقت بے بس ہوتی ہے۔ سن رسیدہ نواب مظفر خان والی ملتان اور اس کے جوان سر بیٹوں کی دست بدست جنگ اور دلیرانہ شہادت کے بعد ملتان حملہ آوروں کے رحم و کرم پر تھا، چار پانچ سو مکانات پیوند زمیں ہو گئے کسی کے پاس روٹی کا ایک ٹکڑا نہ رہا، شہر میں مکانات کو آگ لگا دی گئی اور سب کچھ لے لیا گیا، سینکڑوں آدمی برہنہ کر دیے گئے، عورتوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا گیا، بہت سی شریف عورتوں نے کنوؤں میں گر کر جان دی اور عزت بچائی، قصور میں سکھوں نے لوگوں کے بدن کے کپڑے تک اتار لئے، عورتیں ننگِ سر، ننگِ بدن بے ستر ہو کر جابجا اپنے آپ کو چھپاتی پھرتی تھیں مگر کوئی جگہ امن کی نہیں ملتی تھی، بہت سی شریف عورتیں جنہوں نے کبھی بیگانے مرد کی صورت نہیں دیکھی تھی اپنے ہاتھ سے پھانسی دے کر مر گئیں، کئی چاہات[1] میں کود پڑیں، غرض ہر ایک امیر و غریب شہر کا رہنے والا ایسا لٹا کہ پارۂ نان کا محتاج ہو گیا، بڑے

[1] چاہ کی جمع چاہات یعنی کنویں

بڑے مکانوں کو سکھوں نے آگ سے جلا دیا، بہت سی جوان عورتیں اور لڑکیاں اور لڑکے سکھوں نے شہر سے پکڑ لئے اور غلام بنانے کے ارادے سے اپنے پاس رکھ لئے[1]

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ پنجاب پر رنجیت سنگھ کی "باقاعدہ" حکومت قائم ہو جانے کے بعد بھی مسلمانوں کو وہ عام شہری حقوق اور مذہبی آزادی حاصل نہیں ہوئی جو ایک باضابطہ اور منظم حکومت میں رعیت کو حاصل ہوتی ہے، ان کو بعض مذہبی احکام ادا کرنے کی اجازت نہ تھی، بہت ہی اہم مسجدیں فوج کے استعمال اور لوگوں کے ذاتی قبضہ میں تھیں۔

اس غلامی، مذہبی بندش اور ذلت آمیز طرز عمل نے مسلمانوں کے اخلاق پست ہو گئے تھے، ساری قوم پر بے اعتمادی اور مایوسی چھائی ہوئی تھی اور وہ زندگی پر موت کو ترجیح دیتے تھے، عقائد و اخلاق و عادات مسخ ہو رہے تھے، دینی حمیت اور اسلامی روح سے پوری قوم محروم ہوتی چلی جا رہی تھی، مذہب و معاشرت، دل و دماغ پر اس بدترین غلامی کے بدترین اثرات پڑ رہے تھے، جن کا مٹنا آسان نہ تھا۔

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں جہاں میں
سو بار ہوئی حضرت انساں کی قبا چاک

افغانستان اور سرحد

افغانستان اور سرحد مسلمانوں کی طاقت کا بڑا مرکز رہے ہیں، ہندوستان میں مسلمان فاتح یا تو اسی ملک کے رہنے والے تھے یا اس راستے سے آئے، آخر میں بھی جب ہندوستان کے مسلمانوں اور ان کی حکومت پر کوئی نازک وقت آیا ہے اور یہ حکومت یہاں کے حالات سے عہدہ برآ نہیں ہو سکی تو اس ملک نے عین وقت پر مدد کی ہے، احمد شاہ ابدالی نے تو آخر وقت میں مسلمانوں کی عزت رکھ لی اور مرہٹوں کی طاقت کو ہمیشہ کے لئے فنا کر دیا۔

لیکن انیسویں صدی کی ابتدا میں جب تمام عالم اسلام میں ایک عام زوال تھا، یہ ملک بھی طوائف الملوکی اور بے نظمی کا شکار ہو گیا، نااتفاقی اور خانہ جنگی نے اس طاقت ور ملک کو اتنا کمزور کر دیا کہ ہندوستان اور پنجاب کے مسلمانوں کی مدد تو درکنار اس کو اپنی آزادی اور اپنے مقبوضات کا برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔

[1] سیرت سید احمد شہید حصہ اول ص ۳۹۲ تا ۳۹۳

نہ صرف ہندوستان بلکہ تاریخ اسلام کا ایک بڑا اندوہناک حادثہ اور بڑی حسرت انگیز حقیقت ہے کہ ایسی قوم جو جواں مردی، جانبازی اور جنگی قوت وقابلیت میں خاص امتیاز رکھتی ہے اور جو مسلمانوں کی طاقت کا ایک بڑا سرچشمہ اور سہارا ہے، ان تمام فوجی صفات اور اپنی کثیر تعداد کے باوجود اپنی قومی سیرت ومزاج کی بعض بنیادی کمزوریوں کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کی کوئی بڑی خدمت انجام نہ دے سکی اور خود اپنی اور اپنے ملک کی حفاظت سے بھی قاصر رہی اور قوت وجرأت کا یہ خزانہ ایک ایسے نازک تاریخی موڑ پر جب غیر اسلامی طاقتیں ابھر رہی تھیں اور دنیا پر چھائی چلی جا رہی تھیں حقیر مقاصد اور آپس کے جھگڑوں میں بے دریغ صرف ہو کر رہ گیا اور مسلمانوں کے کچھ کام نہ آیا۔[1]

تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے
صاحب نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک

رائے بریلی سے جہاد کے لئے سفرِ ہجرت

یہ تھے وہ حالات جب سید صاحبؒ نے جہاد کے عزم سے ہندوستان کو خیر باد کہا اور اپنے مخلص رفقاء کے ساتھ جن کو آپ سالہا سال سے اس مقصد کے لئے تیار کر رہے تھے، ہندوستان سے ہجرت فرمائی اور ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد پر پہنچنے کے لئے آپ نے ہندوستان، بلوچستان، افغانستان کا نہایت طویل اور بے حد پُر مشقت سفر اختیار کیا، آپ کی بلند ہمتی، عالی حوصلگی اور جوش جہاد اور مجاہدین کی جفاکشی، صبر وضبط اور شوقِ جہاد کا اندازہ لگانے کے لئے اتنا کافی ہے کہ ہندوستان سرحد اور افغانستان کے نقشے پر ایک نظر ڈالی جائے اور راجپوتانہ، مارواڑ، سندھ، بلوچستان، افغانستان اور صوبہ سرحد کے ان ریگستانوں، میدانوں، پہاڑوں، دّروں، جنگلوں اور دریاؤں کا تصور کیا جائے، جو ان مجاہدین کو طے کرنے پڑے، حقیقت میں اس ہفت خواں کا سر کرنا خود ایک مستقل جہاد تھا، بعض جگہ پانی کی قلت، سامانِ خوراک کی کمی، راہ کی ناشناختگی، مقامات کی دشوار گزاری، قزاقوں کا خطرہ، بھوک اور پیاس کی شدت، اجنبی قوموں، اجنبی ملک، نئی نئی زبانوں کا سامنا، شبہات اور اندیشے، تحقیقات وتجسس یہ تمام چیزیں پیش آئیں، مگر ان کے قدم میں لغزش اور ارادے میں تذبذب نہ پیدا ہوا، اس کے ساتھ اگر اس کا تصور کیا جائے کہ اس قافلہ میں دہلی اور اودھ کے کیسے کیسے نازک طبع امیر گھرانوں کے افراد اور ناز پروردہ اشخاص

---

[1] سیرت سید احمد شہید حصہ اول ص ۳۹۲ تا ۳۹۴

صاحبزادے، شرفاء، سادات، علماء اور مشائخ تھے تو اس روح اور جوش وبے خودی کا اندازہ ہوتا ہے جو میر کارواں نے ان میں پیدا کر دی تھی اور جس کی پرورش اور ترقی ان کی صحبت میں برابر ہو رہی تھی، یہ جمادی الآخر ۱۲۴۱ھ مطابق ۱۷ جنوری ۱۸۲۶ء روز دوشنبہ آپ کی ہجرت کا دن تھا۔[1]

اے شیخ بہت اچھی مکتب کی فضا لیکن
بنتی ہے بیاباں میں فاروقی وسلمانی

پنجتار سے بالاکوٹ کی طرف ہجرت

سرحد کا قیام اور ہجرت کے بعد کا زمانہ ایک مسلسل جہاد کا زمانہ تھا جس میں یا تو عملاً جنگ تھی یا اس کی تیاری یا اس کے مقدمات یا اس کے نتائج سالہا سال کی اس مدت میں اطمینان کی گھڑی شاید ہی کبھی نصیب ہوئی ہو، اس مدت میں میدانِ جنگ کے سب نشیب وفراز اور حالات کے سب تغیرات پیش آئے، فتوحات بھی ہوئیں اور عمل داری بھی قائم ہوئی، ایک دینی ریاست کا انتظام بھی کرنا پڑا، شکستیں بھی ہوئیں، سالہا سال کے رفقاء اور معتمدین کے ساتھ دغا بھی کی گئی، ایک ایک وقت میں بیسیوں کی تعداد میں برسوں کے ساتھیوں کی اچانک شہادت کی خبر بھی سننے میں آئی، دن رات کے ساتھیوں اور عمر بھر کے رفیقوں کو بارہا اپنے ہاتھ سے قبر میں اتارا، وفادار رفیقوں اور جاں بازوں کا جو قیمتی سرمایہ ہندوستان سے لے کر چلے تھے، اس میں برابر کمی واقع ہوتی رہی، جن توقعات کے ساتھ ہندوستان سے رخصت ہوئے تھے ان میں سے بہت کم پوری ہوئیں، جن سے مدد کی امید تھی انہوں نے مدد کے بجائے دھوکا دیا اور زک پہنچانے سے باز نہ آئے، برسوں کی کھیتی دنوں اور گھنٹوں میں کٹ کٹ گئی، تنگی، ترشی، مسلسل فاقے، مسلسل آزمائشیں رہیں، ان حالات کی وجہ سے اس قافلہ نے بالاکوٹ کا رخ کیا، بالاکوٹ پہنچنے کے بعد ایک دن حضرت سید احمد شہیدؒ نے فرمایا "حتی الامکان دعوت فی سبیل اللہ میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور ہم بھی جہاں جہاں گئے وہاں کے لوگوں کو ہر طریقے پر وعظ ونصیحت سے سمجھاتے رہے، مگر سوائے تم غرباء کے کسی نے ہمارا ساتھ نہ دیا، بلکہ ہم پر طرح طرح کا افتراء کیا، اب ہمارے کاتب بھی خطوط لکھتے لکھتے تھک گئے اور بھیجتے بھیجتے تنگ آ گئے اور کچھ ظہور میں نہ آیا، اب یہی خوب ہے

---

[1] سیرت سید احمد شہید حصہ اول ص ۳۹۲ تا ۳۹۴

کہ اپنے سب غازی بھائیوں کو پہروں پر سے اپنے پاس بلوالیں، کل صبح کو اسی بالاکوٹ کے نیچے ہمارا اور کفار کا میدان ہے، اگر اللہ نے ہم عاجز بندوں کو ان پر فتح یاب کیا تو پھر چل کر لاہور دیکھیں گے اور جو شہید ہو گئے تو انشاء اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں چل کر عیش کریں گے۔

شہادت کی تیاری

آپ نے سب غازیوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ ”بھائیو! آج رات کو اپنے پروردگار سے بکمال اخلاص توبہ و استغفار کرو، اور گناہوں کی بخشش چاہو، یہی وقت فرصت کا ہے، کل صبح کو کفار سے مقابلہ ہے، خدا جانے کس کی شہادت ہے، کون زندہ رہے“ بالآخر دوسرے دن عین میدانِ کارزار میں حضرت سید احمدؒ اور شاہ اسمٰعیل اور ان کے بہت سے ساتھی شہادت سے سرفراز ہوئے، بالاکوٹ کے معرکہ نے ثابت کر دیا کہ اللہ نے فتح و غلبہ کی مسرت و طرب کے بجائے ان کو فدائیت و شہادت کا شرف عطا فرمایا اور رضا و قبول کے دستِ شفقت نے ان کو اپنی آغوشِ رحمت کی طرف کھینچ لیا۔

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے

شہدائے بالاکوٹ کا مقام و پیغام

اس معرکہ میں وہ پاک نفوس شہید ہوئے جو عالمِ انسانیت کے لئے رونق و زینت اور مسلمانوں کے لئے شرف و عزت اور خیر و برکت کا باعث تھے، مردانگی و جواں مردی پاکیزگی و پاک بازی، تقدس و تقویٰ اتباعِ سنت و شریعت اور دینی حمیت و شجاعت کا وہ عطر جو خدا جانے کتنے باغوں کے پھولوں سے کھینچا گیا تھا اور انسانیت اور اسلام کے باغ کا جیسا ”عطر مجموعہ“ صدیوں سے تیار نہیں ہوا تھا اور جو ساری دنیا کو معطر کرنے کے لئے کافی تھا، ۲۴ ذوالقعدہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ کی مٹی میں مل کر رہ گیا، مسلمانوں کی نئی تاریخ بنتے بنتے رہ گئی، حکومتِ شرعی ایک عرصہ تک کے لئے خوابِ بے تعبیر ہو گئی، بالاکوٹ کی زمین اس پاک خون سے لالہ زار اور اس گنجِ شہیداں سے گلزار بنی، جن کے اخلاص و للّٰہیت، جن کی بلند ہمتی و استقامت، جن کی جرأت و ہمت اور جن کے جذبۂ جہاد و شوقِ شہادت کی نظیر پچھلی

صدیوں میں ملنی مشکل ہے، بالاکوٹ کی سنگلاخ و ناہموار زمین پر چلنے والے بے خبر مسافر کو کیا خبر کہ یہ سرزمین کن عشاق کا مدفن اور اسلامیت کی کس متاعِ گرانمایہ کا مخزن ہے [1]

یہ بلبلوں کا صبا مشہدِ مقدس ہے
قدم سنبھال کے رکھیو یہ تیرا باغ نہیں

انگریزوں کے خلاف شاملی کا آخری میدان

انگریزوں کے خلاف ملک میں کی جانے والی جنگیں اور بیرونِ ملک کی جانے والی جدوجہد خدا کی مکتبِ عملی کے ماتحت ناکام ہو گئی، بالآخر ایک اور آزمائش باقی تھی اور وہ ۱۸۵۷ء میں قائم ہونے والا شاملی کا میدانِ جنگ تھا، اس جنگ میں انگریزوں کے مقابل مسلمانوں کا لشکر تھا، لشکر کے سپہ سالار حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی تھے اور بڑے علماء میں مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی اور حافظ ضامن شہیدؒ وغیرہ شریک تھے، سابقہ جنگوں کی طرح اس جنگ میں اپنوں کی ریشہ دوانیوں اور حرص و ہوس نے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا اور مسلمانوں کو ناکامی ہوئی، اس ہنگامہ کے بعد ملک میں انگریزوں کا باقاعدہ راج ہو گیا، اب بڑے علماء کے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے، حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی تین دن روپوش رہے اور اس کے بعد محفوظ رہے اور مولانا رشید احمد گنگوہی گرفتار ہوئے اور ان کو جیل ہوئی اور چھ ماہ بعد رہا ہوئے اور حضرت حاجی امداد اللہ چند دنوں روپوش رہ کر مکہ مکرمہ ہجرت فرما گئے اور مہاجر مکی بنے اور حافظ ضامنؒ شہادت سے سرفراز ہوئے۔

اسلامی حکومت کی بقا کے لئے کی جانے والی علانیہ جنگ کی صورت میں یہ آخری کوشش تھی جو ۱۸۵۷ء میں ختم ہو گئی، اور انگریزوں کی حکومت قائم ہو گئی، اس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کا نام ختم کر کے انگلستان کی حکومت نے ہندوستان کا انتظام خود اپنے ہاتھ میں لے لیا، یکم دسمبر ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۸۵۸ء کو الٰہ آباد میں ایک بڑا دربار ہوا، جس میں ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے عام معافی کا اعلان کیا گیا، اور اسلامی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور انگریزوں کی ماتحتی اور غلامی کی مہر لگ گئی۔

اس کے بعد تحریک آزادی شروع کی گئی، جس میں اہلِ وطن بھی شریک تھے، مگر زیادہ تر قربانیاں مسلمانوں ہی کو دینی پڑیں، چونکہ انگریز انہی کو اپنا مزاحم سمجھتے تھے اور ہندوؤں کو طفلِ مکتب گردانتے تھے

[1] سیرت سید احمد شہید ص: ۴۵۹

اور حقیقت بھی یہ ہے کہ مسلمانوں نے تحریک آزادی میں بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں۔

دین سے غفلت اور جہالت کی بنا پر مسلمانوں کی حالت اصلاح پذیر ہو گئی تھی، جس کے لئے مدرسہ کا قیام ناگزیر تھا، چنانچہ ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء میں دیوبند کے چند بزرگوں نے دینی علوم کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ کا سلسلہ شروع کیا، اس کے سب سے پہلے مدرس ملا محمود تھے اور سب سے پہلے شاگرد محمود الحسن تھے، جو بعد میں شیخ الہند کے نام سے معروف و مقبول ہوئے۔ دارالعلوم کی بنا کا مقصد بانیوں کی نظر میں عظیم تر تھا، بالخصوص بانی اعظم مولانا قاسم نانوتویؒ نے دارالعلوم کے لئے کچھ اصول تحریر فرمائے تھے، ان کا کچھ نصب العین اور مطمح نظر تھا جس کو حضرت شیخ الہند محمود الحسنؒ جو سب سے اول معلم اور ہیں دارالعلوم کے مزاج شناس اور راز دار شاگرد رشید اور چہیتے معتمر مرید باصفا تھے بیان کیا ہے، اس سلسلہ میں ان کا ارشاد ہے "جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا ہے کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے، تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے" (اسیر مالٹا بحوالہ سوانح قاسمی) اسی بنا پر انگریزوں کو ملک بدر کرنے کے لئے ملک میں جب تحریک آزادی تیز تر ہوتی گئی اس کے لئے رجال کار زیادہ تر دارالعلوم ہی کے فیض یافتہ تھے اور انہوں نے بڑی بڑی قربانیاں دیں۔

دارالعلوم دیوبند

ایک مثالی دینی درسگاہ

دارالعلوم دیوبند برصغیر ہند میں مسلمانوں کی ایک ایسی درسگاہ ہے، جو فرنگی اقتدار کے بڑھتے ہوئے طوفانوں کا مقابلہ کر کے منصب شہود پر جلوہ گر ہوئی تھی، یہ دین و تقویٰ اور علم و عرفان کی ایسی جلوہ گاہ ہے جس نے مسلمانوں کے دلوں کو جگایا اور ایسے فرزندان توحید پیدا کئے جو آسمان دین و دانش کے ماہ و انجم بن کر آج بھی قلوب انسانی پر ضوفشاں ہیں۔

آفتاب کی ارغوانی شعاعیں ابھی دیوبند کی وادیوں میں پوری طرح پھیلی نہ تھیں کہ فلک کی آنکھ نے یہ منظر دیکھا کہ بستی کے ایک گوشے میں چند لوگ جمع ہیں۔ یہ پرستاران توحید تھے۔ یہ صلحائے امت تھے اور ناموس دین کے نگہبان تھے۔ ان کے سینوں میں عشق الٰہی کی آگ بھڑک رہی تھی، ان

کی آنکھیں نم آلود تھیں، ان کے دل کی دھڑکنیں تیز تھیں ان کے نورانی چہروں سے عزم و ثبات کے چشمے پھوٹ رہے تھے ان میں کا ہر ایک علوم نبوت کا رمز شناس اور دین حق کا شیدائی تھا۔

یہ سعید ہستیاں یہاں کیوں جمع ہیں؟ یہ سوال ہے جو افق دین پر اُبھرتا ہے۔ آیئے ایک طائرانہ نگاہ حقیقت حال پر ڈالیں۔

یہ برصغیر میں اُنیسویں صدی کے وسط کا دَور ظلمت ہے ـــــ جب اسلام کی عظمت و شکوہ کا مہر نیم روز ڈوب چکا تھا البتہ اس کی ہلکی ہلکی کرنیں اپنے دھندلے نقوش کی جھلکیاں دکھا رہی تھیں۔ مسلمانوں کی حکومت و اقتدار کی وہ شمع جو صدیوں سے فروزاں تھی، اس کا نقشہ غالب کی زبان میں یہ تھا

"اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے۔"

مسلمانوں کے ہاتھ سے زمام حکومت چھن گئی تھی، ان کا اقتدار اپنی زندگی کی آخری سانس لے رہا تھا۔ اسلام کی شوکت و تجمل کا نیر اعظم غروب ہو رہا تھا اسلامی تہذیب کے نقوش مٹنے لگے تھے۔ شعائر اسلامی نگاہ سے اوجھل ہوتے جا رہے تھے دینی تعلیم گاہیں ویران ہو گئی تھیں اور خانقاہیں سنسان تھیں۔ مسلمانوں کے چہروں پر اُداسی تھی اور دل پر غم اندوہ کے بادل منڈلا رہے تھے۔ دینی شعور محو ہو رہا تھا، سنت نبویؐ مردہ ہو رہی تھی اور گمراہی اور ضلالت کے بھیانک سائے تیزی سے پھیل رہے تھے۔ شرک و بدعات نے سر اُٹھا لیا تھا۔ دین کی اصل صورت مسخ ہونے لگی تھی، الحاد اور بے دینی کی بادِ سموم چلنے لگی تھی۔ چمنستان اسلام پر خزاں کا رنگ آ رہا تھا اور مرغان خوشنوا اپنی نوائے شیریں بھول گئے تھے۔

یہ تھا وہ دلفگار نقشہ جسے یہ مقدس ہستیاں دیکھ رہی تھیں۔ اور وہ اپنے سینوں میں ایک خلش، ایک اضطراب اور ایک عزم لے کر اس گوشہ میں جمع ہوئی تھیں۔ یہ بزرگ سوچ رہے تھے کہ کس طرح احیائے دین کا کام کیا جائے اور کس عنوان سے بقائے سنت کی تدبیر کی جائے، وہ سب فکر و خیال کے عمیق سمندر میں غوطہ زن تھے اور اپنے تصرف باطنی اور نور بصیرت سے مسئلہ کا حل تلاش کر رہے تھے، آخر کار نصرت خداوندی اور عون ایزدی سے وہ اس بات پر متفق اور ہم خیال ہو گئے کہ علوم نبوت کے احیاء کے لئے ایک "دبستان علم و آگہی" کی داغ بیل ڈالی جائے۔ ان کا یقین تھا کہ یہی وہ طریقہ ہے جس سے مسلمانوں کے قلب و دماغ کی تیرگی دور کی جا سکتی ہے اور اسلام کی شعاعیں پھیلائی جا

Scanned by CamScanner

سکتی ہیں۔ اسی کے ذریعہ سینوں میں علم وعرفان کی شمعیں روشن ہو سکتی ہیں اور اسی کے ذریعہ مردہ رگوں میں نورِ ایمانی گردش کر سکتا ہے اور اسی سے ابوبکرؓ — عمرؓ — علیؓ — عثمانؓ — طلحہؓ — زبیرؓ خالدؓ وطارقؒ — الف ثانیؒ — اور ولی اللہؒ کی روح پرور اور ایمان افروز زندگی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر سکتا ہے۔

یہ صالح ہستیاں منتخب روزگار تھیں — خدا رسیدہ تھیں، انہیں نورِ بصیرت حاصل تھا۔ یہ عرفانِ شریعت سے آراستہ تھیں اور یہ اس کا مومنانہ فراست، حکیمانہ صلاحیت اور ملہمانہ بصیرت کا کرشمہ تھا کہ خداوند قدوس کے حکم سے دیوبند کی خاک پر علومِ نبوت کی ایک درسگاہ عالمِ وجود میں آگئی، بادی النظر میں یہ ایک حقیر درسگاہ تھی، لیکن فی الحقیقت یہ علومِ معرفت کا عظیم سرچشمہ تھا اس میں بڑی جامعیت تھی، بڑی ہمہ گیریت تھی، یہ ایک دانش کدہ تھا، یہ علم وعرفان کا مرکزِ عظیم اور دین وتقویٰ کا مظہرِ جلیل تھا، فکر وعمل کی بہترین جلوہ گاہ تھی اور اس طائفہ ولایت کے سرخیل حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تھے۔ کون محمد قاسم؟ جو اشارہ ربانی کے رمز شناس تھے، جن کے باطنی محاسن اور جن کے اخلاقی مکارم نے کفر کی ظلمتوں کا سینہ چیر کر اس میں نورِ ایماں پیوست کیا اور جن کے باطنی شعور اور فکری بلوغ سے ظلمت کدۂ ہند میں وحیٔ الٰہی کی روشنی پھیلانے کا اہتمام ہو رہا تھا۔ پھر یہ کہ اسلام کا بطلِ جلیل تنہا نہ تھا، اس کی معاونت کے لئے دیگر رجال کار بھی تھے وہ کون؟ وہ حاجی سید عابد حسین تھے، وہ مولانا ذوالفقار علی تھے، وہ مولانا فضل الرحمٰن تھے، یہ وہ بندگانِ خدا تھے جن کی اصابت فکر، جن کی جلالت علم اور جن کی فراست وفہم پر ماہ وپروین گواہ تھے۔

پھر یہی برصغیر کی وہ عظیم دبستان تھی جس سے علومِ نبوت کے چشمے پھوٹے اور خزاں رسیدہ چمنستانِ وطن کی آبیاری کا آغاز ہوا، پھر گل ولالہ میں تازگی آئی اور برگ وبار میں بالیدگی پیدا ہوئی اور دار العلوم کے بانی کا یہ خواب ایک حقیقت بن کر جلوہ گر ہو گیا کہ:

> ''میں خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوں اور میرے ہاتھوں اور پیروں کی دسوں انگلیوں سے نہریں جاری ہیں اور اطراف عالم میں پھیل رہی ہیں۔''

پھر یہی خاکِ دیوبند ہے جہاں سے مجاہدینِ اسلام کا ایک کارواں گزرا تھا جس کے سرخیل حضرت احمد شہید بریلویؒ تھے اور جن کی زبان سے یہ ملہمانہ کلمات نکلے تھے:

> ''مجھے اس مٹی سے علم کی خوشبو آتی ہے''

سید شہیدؒ کی یہ پیشین گوئی بھی ثابت ہوئی اور آج دیوبند کی خاک ایک سدا بہار گلشن عام بن کر جلوہ گر ہے اور اس کی مہک سے سارا عالم معطر ہے، یہی وہ درسگاہ ہے جس نے فرنگی حکمرانوں کی عیارانہ چالوں کا چیلنج قبول کیا اور لارڈ میکالے کی اس معاندانہ روش کا مقابلہ کیا۔ جس نے ایسی تعلیمی منصوبہ بندی کی تھی جس کا مقصد ایسی نسل تیار کرنا تھا جو رنگ ونسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو اور دل ودماغ کے لحاظ سے انگریز۔ چنانچہ اس مذموم مقصد کے خلاف صلحائے اُمت نے یہ قدم اٹھایا کہ ایسی تعلیمی اسکیم تیار کی تھی جس سے ایسی نسل تیار ہو سکے جو رنگ ونسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو اور دل ودماغ کے اعتبار سے اسلامی ہو۔''

پھر ایک حسین ودلنواز صبح طلوع ہوئی، جب دیوبند کی مسجد کے صحن میں یہ منظر انسانی آنکھوں نے دیکھا کہ ایک انار کے درخت کے سائے میں ایک استاد، ایک شاگرد کو ''علومِ نبوت'' کا درس دے کر ایک عظیم الشان درسگاہ کی افتتاحی تقریب انجام دے رہا ہے۔ استاد کا نام بھی محمود ہے اور شاگرد کا بھی محمود۔ پھر بزرگانِ ملت اور صلحائے اُمت کی نیت کا خلوص ان کا ولولۂ دینی، ان کا جوشِ ایمانی، ان کی بے پناہ قربانی، ان کا جذبۂ خدمت کی فراوانی نے دنیائے اسلام میں غلغلہ پیدا کر دیا، برصغیر کے مسلمانوں میں بڑا انقلاب آیا، ذہنی ابتذال وانحطاط دور ہونے لگا، دل کی بجھی ہوئی شمعیں پھر روشن ہونے لگیں، پھر سینوں میں عزائم بیدار ہونے لگے، توحید ورسالت کے امین ونگہبان پھر سربکف ہو کر دنیا میں نظر آنے لگے، دانش کدوں کے بند دروازے پھر کھل گئے۔ خانقاہوں کی رونق پھر واپس آگئی اور پھر ۱۲۸۲ھ ہجری سے لے کر ۱۳۸۲ھ ہجری تک دیوبند کے منبع عرفان نے ایسے بے شمار فرزندانِ توحید پیدا کئے جو دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل گئے اور جو آسمان شہرت پر مہر وماہ بن کر چمکے اور جن کی تبلیغی اور علمی سرگرمیوں نے بے شمار مخلوق خدا کو کفر کی ظلمت سے نکال کر ایمان کا نور عطا کیا۔

اور یہ علمائے دیوبند ہی ہیں جن کی علمی جلالت اور سیاسی بصیرت اور جذبۂ حریت نے ملک کو آزاد کرانے میں صفِ اول میں رہ کر رول ادا کیا ہے۔ تاریخ کے اوراق سے پوچھو جو علماء دیوبند کے مجاہدانہ کارناموں سے روشن ہیں۔ داخلی اور بیرونی زندانوں سے پوچھو وہ تم کو علماء دیوبند کے سجدوں کے نشانات دکھلائیں گے، انگریزی سنگینیوں سے پوچھو وہ تمہیں رو رو کر بتائیں گی کہ انہوں نے کن اللہ

Scanned by CamScanner

والوں کے سینوں کو چھلنی کیا ہے۔ خود ان انگریزوں سے پوچھو کہ ان کے مقابلہ پر سب سے زیادہ سینہ سپر رہنے والے کون تھے؟ آسمان و زمین، چاند اور ستاروں سے معلوم کرو، ایوانِ برطانیہ کی اینٹ سے اینٹ بجانے والے کون تھے سب کے سب گواہی دیں گے کہ یہی علمائے دیوبند تھے جس کی تفصیل آئندہ اوراق میں پڑھیں گے۔

اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن کون ہے؟

تحریک آزادی کے واقعات سے پہلے حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کا ایک مکتوب جو کسی سائل کے جواب میں لکھا گیا ہے اس کو پڑھ لینے سے جہاں اسلام اور مسلمانوں کا بڑا دشمن کون ہے یہ سمجھ میں آئے گا وہاں مسلمانوں کا تحریک آزادی میں کانگریس کے ساتھ سمجھوتا کرنا جس میں ہندو لیڈران بھی شامل تھے خوب واضح ہو جاتا ہے، نیز ما قبل میں لکھے ہوئے واقعات چاہے پلاسی کا میدان ہو یا بکسر کا، یا میسور کی وادی ہو یا شاملی کا میدان یا بالاکوٹ کا واقعۂ گنج شہیداں ان قیمتی قربانیوں کی قدر و منزلت بھی عیاں ہوگی۔

تو نے دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندرون چنگیز سے تاریک تر

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کا مکتوب جو سائل کے جواب میں ہے درج ذیل ہے:

"میرے محترم دوست! آپ کو معلوم ہے کہ اگرچہ تمام غیر اسلامی مذاہب اور ان کے ماننے والے اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں، مگر سب دشمن ایک طرح کے نہیں ہوتے، کوئی بڑا ہے، کوئی چھوٹا ہے، ہر دشمن سے اس کے درجہ کے موافق مقابلہ کرنا لازم ہوگا، جب سے اسلام نے ظہور کیا ہے انگریز نے برابر اسلام اور مسلمانوں کو اس قدر نقصان پہنچایا کہ کسی اور قوم نے نقصان نہیں پہنچایا، انگریز دو سو برس سے زائد عرصہ سے اسلام کو فنا کر رہا ہے، اس نے ہندوستان کی اسلامی طاقت کو فنا کیا، بادشاہوں اور نوابوں اور امراء کو قتل کیا، ان کی فوجوں کو برباد کیا، حکومت ہائے اسلامیہ کو تہہ و بالا کیا، خزانوں کو لوٹا، اپنے اقتدار کا خزانہ قائم کیا، اپنے قوانین کو جاری کیا، ہندوستان کی تجارت، صنعت و حرفت، علم، تہذیب وغیرہ کو برباد کیا، ٹیکسوں اور لگانوں کے ذریعہ سے ہر قسم کی مالی لوٹ جاری کر کے اپنے ملک کو غنی اور ہندوستان کو کنگال بنایا، ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کو انتہائی ذلیل، نادار، بے کار، بے روزگار بنایا،

مسلمانوں سے ہندوستان کے دوسرے مذاہب والوں کو تعاون کر کے دشمنی کی آگ بھڑکائی اور ہر جگہ بے ہتھیار اور کمزور کیا، ہندوستان میں اسلامی قوانین کے خلاف شراب، منشیات کی آزادی، بدکاری کی آزادی، الحاد، زندقہ و ارتداد کی آزادی، مسلمانوں میں خلافِ قانون کا اجرا، اپنے یہاں کے موافق فیصلہ جات جاری کئے، جگہ جگہ قضا کو خلاف معاہدہ منع کر کے مسلمانوں کے پرسنل قوانین کو ملیا میٹ کیا وغیرہ وغیرہ، ہندوؤں کو قصداً بڑھا کر ہر جگہ اور ہر شعبۂ زندگی میں ترقی دی، ... جاری کیا، غرض یہ کہ ہر طرح سے اسلام اور مسلمانوں کو ہندوستان میں برباد کیا اور جب کہ مسلمانوں نے اپنی خودی اور شرعی حق آزادی کے لئے جدوجہد کی تو ان پر اس قدر مظالم کئے کہ ان کی یاد سے بھی دل تھرا اٹھتا ہے، ۱۸۵۷ء کی تاریخ اور اس سے پہلے کے واقعات دیکھئے معاہدات اور وعدے جو کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کئے گئے اور جو ۱۸۵۷ء میں ہوئے ان کو بار بار توڑتے رہے، غرض یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے خصوصاً اور تمام ہندوستان کے باشندوں کے ساتھ عموماً وہ شرمناک معاملے کئے کہ وہ ہندوستان جو کہ کبھی جنت نشان تھا جہنم نشان بن گیا، وہ ہندوستان جو کہ دولت و ثروت کا مرکز تھا وہ فقر و فاقہ، افلاس و تنگدستی کا اڈہ ہو گیا، وہ ہندوستان جو کہ علم و حکمت کا سمندر تھا وہ جہالت اور بدتمیزی کا چٹیل میدان ہو گیا، وہ ہندوستان جو کہ تمام دنیا کا محتاج الیہ تھا وہ سب سے زیادہ مفلس، قلاش، مسکین، فاقہ مست، بے کمال، بے روزگار، گرانی اور پس ماندگی کا شکار ہو گیا، یہ مظالم تو تھے ہی جن میں مسلمان سب سے زیادہ تباہ ہوئے۔

وکٹوریہ کے اعلان ۱۸۵۸ء میں بڑے زور و وعدہ کیا گیا تھا کہ اپنی قلمرو کو نہ بڑھائیں گے اور دوسرے علاقوں پر قبضہ نہیں کریں گے، مگر تھوڑے ہی عرصہ میں افغانستان پر یکے بعد دیگرے چڑھائی کی اور ہزاروں مسلمانوں کا خون بہایا، چار مرتبہ حملے کئے، آزاد مسلم علاقوں پر قبضہ کرتے رہے، مگر اسی کے ساتھ عراق، شام، مصر، فلسطین، عرب، شمالی ہند، مشرقی افریقہ، سوڈان، برما وغیرہ کے اسلامی عروج کو پامال کیا، خلافتِ عظمیٰ کو زیر و زبر کیا، حجاز، جدہ، مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ پر چڑھائی کی، استنبول وغیرہ میں کیا کیا نہیں کیا، اور ان مقامات میں خون کی ندیاں کہاں نہیں بہائیں، پھر اس پر طرہ یہ کہ یورپین طاقتوں میں اسلامی ممالک کو تقسیم کیا۔

طرابلس، صحرائے لیبیا، اورنہ، سورکن وغیرہ اٹلی کو دیئے اور اسپین، الجیریا، تیونس، فارس، مراکش وغیرہ فرانس کو، وسط ایشیا اور شمالی ایشیا کے ممالک بخارا، سمرقند، ازبکستان، داغستان، قزاقستان وغیرہ روس کو برابر معاہدوں وغیرہ کے ذریعہ سے تقسیم کرتے رہے، ترکی سے بلغیریا، یونان، مقدونیہ، رومانیہ، کریٹ، بلقان وغیرہ کو مجبور کر کے آزاد کراتے اور اسلامی طاقت کو فنا کرتے رہے، ان دل خراش اور ہوش و حواس کو مٹا دینے والے واقعات سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں جو کہ عموماً ان تین سو سال

کے اندر قریباً ۱۶۲۰ء سے ۱۹۲۰ء تک میں واقع ہوئے ہیں اور جن میں انگریز ہمیشہ پیش پیش رہا ہے [illegible] بتلا ہے کہ انگریز کے برابر دنیا میں کسی قوم نے آج تک اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی کا ثبوت [illegible]

ہندو تو آپ کا ایک ہزار برس یا زائد سے دعیت چلا آتا ہے اور اس کو بھی اسی انگریز نے آپ کے مقابل کھڑا کیا اور بڑھایا ہے، اس لئے آپ کو غور کرنا چاہئے کہ آپ کا فریضہ کیا ہے، انگریز کو [illegible] انتقام لینا اور اس کے اقتدار کو گھٹانا یا ہندو کو، انگریز کو اپنے اقتدار کو باقی رکھنے اور اپنی تجارت وغیرہ کے لئے ضرورت ہے کہ آبنائے دور سے بمبئی تک کا سمندر اور ان کے سواحل اپنے قبضہ اقتدار میں رکھے اپنے لئے امن وامان اور تجارت اس راستہ میں قائم کرے، جس کی بنا پر اس کو بحر اٹلانٹک، بحیرۂ روم، بحیرۂ قلزم، بحیرۂ ہند، بحیرۂ فارس پر قبضہ کرنا اور اطمینان حاصل کرنا ضروری ہے، ہوائی جہازوں کے لئے، سمندری جہازوں کے لئے لندن سے ہندوستان تک اگر مراکز اور مخازن نہ ہوں گے تو وہ ہندوستان میں اپنے مقاصد حاصل نہیں کرسکتا ہے، اس لئے ان تمام ممالک کو جو کہ راستہ میں ہیں ہمیشہ زیروزبر کرتا رہا، اور ہندوستان ہی کی فوجوں سے کرتا رہا، ہندو کو ان ممالک کے غلام بنانے اور ان پر اقتدار قائم رکھنے کی ضرورت نہیں ہے، ہندو میں بالفعل اتنی طاقت نہیں ہے جتنی انگریز میں ہے، اس لئے ماضی، حال، مستقبل میں سب سے بڑا دشمن انگریز ہی ہے ہندو کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ ممکن ہے وہ مستقبل میں ہی یا اس سے زائد ہو جائے، مگر یہ امر مظنون اور موہوم ہے، اسی بنا پر ہمیشہ اکابر اسلام نے ہندوستان میں انگریز سے آزادی حاصل کرنا اور اس کے اقتدار کو مٹانا ضروری سمجھا اور اسی بنا پر کانگریس بنائی گئی اور اس لئے مسلمانوں نے اس میں شرکت کی اور اسی لئے جمعیۃ العلماء اس کے ساتھ اشتراک عمل کئے ہوئے ہے، جب تک مسلمان مکمل آزاد نہ ہو جائیں یعنی کم از کم تمام انگریزی فوجیں اور وائسرائے اور گورنر انگریز یہاں سے چلے نہ جائیں اور مکمل اختیارات ہندوستانیوں کے قبضہ میں نہ آجائیں یہ فریضہ باقی ہے، باقی رہا ان مفادات کا حاصل کرنا جن کو آپ یا کوئی دوسری جماعت مسلمانوں کے لئے مستقبل میں مفید یا ضروری سمجھتے ہیں یہ بعد کا مسئلہ ہے، دفع ضرر منفعت سے مقدم ہے، اگر گاؤں میں آگ لگی ہے تو پہلے آگ بجھایئے پھر اپنی زمینوں کی تقسیم کا فیصلہ کیجئے، اگر آپ مریض ہیں تو پہلے مرض کو دفع کیجئے پھر تقویت کی فکر کیجئے۔

میرے محترم آپ خود جانتے ہیں کہ انگریز کا ہمیشہ اصول رہا ہے "لڑاؤ اور حکومت کرو" اسی اصول اور عمل درآمد کے ذریعہ سے اس نے ہندوستان پر قبضہ کیا اور آج تک قبضہ کئے ہوئے ہے، اسی اصول کی بنا پر اس نے کانگریس کے مقابل ۱۹۰۶ء میں لیگ اور مہاسبھا کی بنیاد ڈالی اور آج تک دونوں کو پالتا رہا اور بڑھاتا رہا اور اسی اصول کے مطابق جب بھی زمانہائے سابقہ میں آزادی کے لئے جدوجہد ابھری تو

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ل اسیر مالٹا ص ۱۵۹

تحریکِ آزادی

مسلمان اور برادرانِ وطن کی تحریک آزادی اور علماء کی عظیم قربانیوں کا ذکر اور ان کے خلاف انگریز کے مظالم اور مکر وفریب سے پُر پالیسیوں کی حیرت انگیز داستان جو کتاب "تحریک آزادی اور مسلمان"* میں سے جستہ جستہ درج ہے جو نہایت عبرت انگیز ہے۔

عروج کے بعد زوال

قانونِ فطرت کا عمل خاموشی کے ساتھ جاری رہتا ہے، کسی قوم میں زیادہ عرصہ تک اقتدار کا مرتکز ہو جانا بہت سی کمزوریوں اور خامیوں کا باعث ہوتا ہے، میر جعفر، میر صادق، الٰہی بخش جیسے افراد کا وجود قانونِ فطرت کے تحت تھا، ایک نئی قوم کا نیرِ اقبال طلوع ہو رہا تھا، اس کی روشنی بتدریج بڑھتی جارہی تھی، لوگوں کی توجہ اس کی طرف منعطف ہوتی جارہی تھی، انگریزوں کے اقتدار کا سورج بنگال کے مطلع سے طلوع ہوتا ہے، چڑھتے ہوئے سورج کی پرستش کرنے والوں کا رخ بہت جلد اس کی جانب پھر گیا انہوں نے طلوع ہونے والے اور چڑھتے ہوئے سورج کی عظمت، آب وتاب، آنکھوں کو خیرہ کرنے والی چمک دمک کی سمت ایک نگاہ ڈالی اور پکار اٹھے: ھٰذَا رَبِّیْ ھٰذَا اَکْبَرُ ایسے ہی ضمیر فروشوں نے اپنی قوم، اپنے مذہب اور اپنے وطن سے غداری کی، انہوں نے سوداگروں کی ایک قوم کے ہاتھوں اپنی قوم، اپنے مذہب اور اپنے وطن کا سودا کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری عظمت وسربلندی نے مئی ۱۸۵۷ء میں زندگی کی آخری ہچکی لی اور ہم جسدِ بے روح ہو کر رہ گئے۔

ہمارے اسلاف

ہمارے آباواجداد نے ہندوستان کی عظمت اور آزادی کو پامال کرنے والی اس سفید فام قوم کو اپنی رگوں کے خوں کے آخری قطرے تک برداشت نہیں کیا۔ ہندوستان میں بسنے والی ہندوستانی قوم جو مختلف مذاہب اور مکتبۂ فکر کی تہذیب اور تمدن کے مختلف ومتضاد عناصر کو لے کر وجود میں آئی تھی اس کی عزت وحرمت بچانے کے لئے پہلے پہل ہم نے خود اپنی ذات کو قربانی کے لئے پیش کیا، ۱۸۵۷ء کے بعد نصف صدی تک انگریزی سامراج کو شکست دینے کے لئے ہم تن تنہا جنگِ آزادی کے میدان میں

* "تحریک آزادی اور مسلمان" مصنفہ اسیر ادروی جامعہ اسلامیہ۔ بنارس، تفصیلی معلومات درکار ہوں تو اصل کتاب کی مصنف [illegible] رجوع کریں۔

زور آزمائی کرتے رہے اور ہم نے اس راہ میں اپنا خون اتنا بہایا کہ پوری جنگِ آزادی میں دوسروں نے اتنا پسینہ بھی نہیں بہایا ہوگا۔ لال قلعہ کی فصیلوں سے ۱۸۵۸ء میں ہماری عظمت کا ہلالی پرچم اتار کر یونین جیک لہرایا گیا، ایک طرف انگریز ہماری عظمت واقتدار کے قلعہ پر اپنے اقتدار کا پرچم لہرا رہا تھا دوسری طرف ہم جنگِ آزادی کے میدان میں اس سے مقابلہ کے لئے صف بندی کر رہے تھے ہم نے برطانوی سامراج کا مقابلہ کرنے کے لئے آگے بڑھ کر سب سے پہلے جھنڈا بلند کیا، ہم نے برادرانِ وطن کا انتظار نہیں کیا جنگِ آزادی کے میدان میں ہماری جگہ ہمیشہ صفِ اول میں رہی اس سے کسی کو مجال انکار نہیں۔

ہم نے تنہا ہی سفر کیا ہے

تاریخ آزادی کی یہ بھی ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ ۱۹۰۰ء تک جتنے مسلمان مجاہدین آزادی پھانسی پر لٹکائے گئے یا کالے پانی کی کربناک زندگی گزاری یا عمر قید کی سزا بھگتی، یا صفوں میں کھڑا کرکے گولی مار دی گئی یا بغاوت کے جرم میں شوٹ کیا گیا ہے تحریکِ آزادی کے پورے دور میں دوسری قوم کی قربانیوں کی مجموعی تعداد بھی اس کے برابر نہیں ہو سکتی، بیسویں صدی کی ابتداء میں جب تقریر وتحریر کی وہ آزادی نہیں تھی جو بعد کے دور میں ہوئی، اس وقت سب سے پہلا احتجاجی جلسہ کلکتہ میں تقسیم بنگال کے خلاف ہوا اس کے سارے مسلمان مقررین میں شاید کوئی بچا ہو جسے پولیس کی سختیاں اور قید وبند کی صعوبتیں نہ جھیلنی پڑی ہوں۔

آزادی بذریعۂ طاقت

۱۹۱۵ء میں ریشمی رومال کی تحریک مسلمانوں کا ایک اور جرأت مندانہ اقدام تھا جو بغاوت کے فردِ جرم تک جاتا ہے مگر تحریک چلانے والے خوش قسمت تھے کہ کئی سو کی تعداد میں پولیس کے عبرتناک مظالم سہے اور رہنما قید وبند کی اذیت ناک زندگی گزار کر چار پانچ سال بعد زندہ ہندوستان واپس آگئے۔

جلیاں والہ باغ میں

۱۹۱۹ء آزادی کی تاریخ میں یادگار بن گیا کیونکہ جلیاں والہ باغ امرتسر کا واقعہ اسی سال ہوا، عوامی بیداری کا اس سے صحیح احساس پیدا ہوتا ہے آپ جلیاں والہ باغ میں شہید ہونے والوں کی فہرست پر نظر ڈالیں گے تو مسلمانوں کے ہر طبقہ کے لوگوں کو بڑی تعداد میں خونِ شہادت سے سرخرو پائیں گے۔

Scanned by CamScanner

تحریک خلافت کا زمانہ

پھر اس کے بعد تحریک خلافت میں ترک موالات اور عدم تعاون کا جوش وخروش ابھرا تو مسلمان ہی قیادت کے فرائض انجام دیتا رہا اور مسلسل قید و بند اور پولیس کی سختیاں برداشت کرتا رہا اس طرح ۱۹۲۵ء تک آزادی کے میدان میں وہ قائدانہ رول ادا کرتا رہا، پھر ۱۹۲۷ء میں ہندوستان نے برطانوی حکومت کا چیلنج منظور کر کے ایک متفقہ دستور پیش کرنے کا تہیہ کیا مگر افسوس کہ متفقہ دستور کی کوشش نے ہندو مسلم اتحاد کے شیرازہ کو منتشر کر دیا جب کہ تحریکِ خلافت نے مثالی کردار انجام دیا تھا، اگرچہ یہ بات تلخ ہے مگر صداقت اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ اس سلسلہ میں جن لوگوں نے مرکزی کردار ادا کیا انہوں نے صاف دلی سے اس اتحاد کو باقی رکھنے کی کوشش نہیں کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہرو رپورٹ کو اگر مولانا شوکت علی مولانا محمد علی اور مسٹر جناح نے رد کیا تو خالص قوم پرور مسلمانوں کے لئے بھی یہ رپورٹ ناقابلِ قبول ہی رہی جب کہ وہ کانگریس کے ساتھ شانہ بشانہ مل کر کام کر رہے تھے اور بعد میں وہ پوری زندگی کانگریس کے محاذ سے برطانوی حکومت کے خلاف جہاد کرتے رہے اس لئے مسلمانوں پر یہ الزام عائد نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے آزادی کی حقیقی لڑائی سے انحراف کیا۔

آخری منزل تک

بیسوی صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں کانگریس کی طرف سے ستیہ گرہ اور نان کوآپریشن کے پروگرام چلائے گئے اس سلسلہ میں بھی آپ دیکھیں گے کہ مسلمان قوم ان سارے پروگراموں میں برابر کے ساتھی کی طرح سرگرم کار رہی اور بہت سے پرجوش مسلمانوں نے گاندھی جی کی گرفتاری پر احتجاج کرتے ہوئے بغاوت تک کردی اور پھانسی کے تختے پر چڑھا دئے گئے، ۱۹۳۷ء میں کانگریسی وزارت کے موقعہ پر ہندو مسلم خلیج اور بڑھ گئی لیکن اگست ۱۹۴۲ء کی تحریک جو ایک طوفانی تحریک تھی جس میں لاتعداد ہندوستانی گرفتار ہوئے اور پولیس کی گولیوں کا نشانہ بنے اس موقعہ پر بھی آپ دیکھیں گے کہ مسلمان نے قید و بند کی مصیبتیں ہی نہیں جھیلیں بلکہ شمع آزادی پر پروانہ وار نثار ہو گئے اور مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد پولیس کی گولیوں کا نشانہ بنی، ۱۹۴۲ء کے بعد پانچ سال کا دور ایسا ہے جس نے ہندو مسلم خلیج کو ناقابلِ عبور حد تک وسیع کر کے مسلمانوں کی بے مثال قربانیوں کی قدر و قیمت کو کم کر دیا اور اس کی

سیکڑوں سال کی انتھک جدوجہد اور ایثار و قربانی بے وزن مانی جانے لگی مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ اس نے جنگِ آزادی میں آگے بڑھا ہوا قدم پیچھے ہٹایا ہو۔

دوسری جنگِ عظیم کا سلسلہ جاری ہی نہیں تھا بلکہ لڑائی کی آگ اور تیزی سے بھڑک اٹھی تھی اور اس کی آنچ ہندوستان میں بھی محسوس کی جانے لگی تھی جاپانی قوم ہندوستان کے دروازے پر دستک دے رہی تھی اس وقت سوبھاش چندر بوس کی قیادت میں مسلمانوں کے ان گنت سپاہی اور فوجی افسران برطانوی حکومت کے خلاف نبرد آزمائی میں دوسرے برادرانِ وطن سے آگے تھے اور ۱۹۴۶ء میں آزاد ہند فوج کے گرفتار شدگان میں مسلمانوں ہی کی تعداد زیادہ تھی اگر حالات سازگار ہوتے تو انگریز انہیں پھانسی سے کم سزا نہیں دیتے اس کے علاوہ آزاد ہند فوج کے مورچہ سے برطانوی فوج کے خلاف لڑتے ہوئے مسلمان فوجیوں نے جام شہادت نوش کیا اسی ۱۹۴۶ء میں بمبئی اور کراچی کے بحری بیڑوں نے بغاوت کا بگل بجا دیا اس بغاوت میں مسلمان فوجیوں نے مثالی کارنامہ انجام دیا اور اس بغاوت کی حمایت میں شہریوں نے جو طوفان خیز مظاہرہ کیا اس میں بھی مسلمان شہیدوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔ اس طرح ۱۸۵۷ء سے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک مسلمانوں نے تسلسل کے ساتھ اتنی قربانیاں دی ہیں کہ ان پر ہزاروں صفحات کی کتابیں لکھی جاسکتی ہیں، اور جب بھی کوئی مؤرخ دیانت داری کیساتھ ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ مرتب کرے گا تو اس کے لئے ممکن نہیں ہے کہ مسلمانوں کی بے مثال قربانیوں کو نظر انداز کر سکے۔۔۔۔ ہم اگلے صفحات میں مسلمانوں کی تحریک آزادی میں عظیم الشان قربانیوں کی ایک اجمالی تاریخ آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

جب لال قلعہ پر یونین جیک لہرایا

آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو مجاہدینِ آزادی کی سربراہی کے جرم میں پابجولاں رنگون کے قید خانہ میں بھیجا جا چکا تھا، لال قلعہ سے مسلمانوں کے اقتدار کا پرچم اتار کر برطانوی استعمار کا یونین جیک لہرایا جا چکا تھا اور اب انگریزوں کی فوج ان مسلمانوں کو گرفتار کرنے میں مسلسل مصروف تھی جن کے خون کی برطانوی اقتدار کی بنیاد کو ضرورت تھی کیونکہ اس کے بغیر استحکام ممکن نہیں تھا۔

انگریزوں نے حکومت و اقتدار مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھینا تھا اس لئے قدرتی طور پر مسلمان ہی زیادہ مشتعل تھے، اسے خوبی کہئے یا اس قوم کا عیب، کہ جب یہ قوم مشتعل ہو جاتی ہے، اس کی غیرت و

Scanned by CamScanner

حیت کو للکارا جاتا ہے یا اس کی خودداری کو ٹھیس لگتی ہے تو وہ یہ نہیں دیکھتی کہ فریقِ مخالف کی طاقت کیا ہے؟ وہ نتائج سے بے پروا ہو کر اس سے ٹکرا جاتی ہے۔ ۱۸۵۸ء میں ہندوستان میں انگریزی تسلط و اقتدار مکمل ہو چکا تھا حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں سے نکل کر براہ راست ملکہ وکٹوریہ کے ہاتھوں میں جا چکی تھی، لال قلعہ پر یونین جیک لہرانے لگا تھا، یہ جھنڈا اس بات کا اعلان تھا کہ اب اقتدار ہندوستانیوں کے ہاتھوں سے نکل کر غیر معین مدت تک کے لئے دوسروں کے فولادی ہاتھوں میں جا چکا ہے اور اب ہندوستانِ جنت نشان کی بہاروں پر ایک سفید فام قوم کی اجارہ داری قائم ہو چکی ہے یہی وہ دن ہے جب مسلمانوں نے ہندوستان میں جنگِ آزادی کا آغاز کیا، ۱۸۵۸ء کے بعد جب سارے برادرانِ وطن ایک سطح پر آ گئے اور انگریز ہندوستان پر مسلط ہو چکا تو اب ان لڑائیوں کی حیثیت عوامی ہو گئی، اس لئے اس کے بعد ہونے والی جدو جہد ہندوستان کی جنگِ آزادی کی تاریخ کا پہلا باب ہے، جب یہ جدو جہد شروع کی گئی اس وقت کیا ماحول تھا؟ اسے جانے بغیر مجاہدینِ آزادی کی خدمات اور قربانیوں کی اہمیت اور قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا، اس لئے تھوڑی دیر کے لئے ہم آپ کو اسی فضا اور ماحول میں لے چلتے ہیں۔

جب ہم خون کے دریا میں ڈوب گئے

۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء درحقیقت نقطۂ آغاز ہے جنگ آزادی کا، جب انگریزی فوج کے سپاہیوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کی اور اپنے انگریز افسروں کو گولی مار کر دہلی پر قبضہ کرنے کے لئے چلے، لیکن یہ تحریک کامیاب نہ ہو سکی تحریک کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے انتقامی کارروائیوں کا آغاز کیا اور اس کے نتیجہ میں مسلمان خصوصیت کے ساتھ انتہائی طور پر کچل دیا گیا، دہلی کا چاندنی چوک ہی نہیں بلکہ شہر کے ہر چوراہے پر سولیاں نصب کر دی گئیں، دہلی اور دہلی کے باہر درختوں کی شاخوں سے پھانسی کے پھندے لٹک رہے تھے، جو بھی معزز مسلمان انگریزوں کے ہاتھ چڑھ گیا، اسے ہاتھی پر بٹھایا، درخت کے نیچے لے گئے، پھندا اس کی گردن میں ڈال کر ہاتھی کو آگے بڑھا دیا، لاش پھندے میں جھول گئی، آنکھیں اُبل پڑیں، زبان منہ سے باہر نکل آئی، ذبح کئے ہوئے مرغ کی طرح جانکنی کا وہ ہیبت ناک منظر کہ الاماں والحفیظ، ایک انگریز عورت نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ بسا اوقات ان پھانسیوں پر لٹکائے جانے والوں کی لاشیں تڑپ تڑپ کر انگریزی ہندسے کا 8 بن جاتی تھیں۔

مسلمانوں میں خوف و ہراس اور دہشت پھیلانے کے لئے وہ سزا کے نت نئے طریقے ایجاد کرتے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ کسی سربرآوردہ مسلمان کو پکڑ کر توپ کے دہانے پر رسیوں سے جکڑ کر باندھ دیا اور توپ داغ دی، پھر کیا ہوتا تھا؟ قلم کانپ رہا ہے، دل تھرتھرا رہا ہے اور اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے زبان لرز رہی ہے اور اس کربناک صورت حال کے اظہار سے قاصر ہے، پورے جسم کا گوشت بوٹی بوٹی ہو کر فضا میں اُڑ جاتا تھا، جس طرح تیز ہوا میں کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، دور تک خون کے چھینٹے اس طرح پڑتے تھے جیسے فضا سے زمین پر کسی نے خون کا چھڑکاؤ کیا ہے، لاش کا سر فضا میں میلوں بلندی پر جا کر جب زمین پر گرتا تھا تو بسا اوقات کسی راہ گیر یا جانور کی جان چلی جاتی تھی۔

یہ ایک دو نہیں سینکڑوں واقعات ہیں، یہ قیامت مسلمانوں پر ایک دو دن نہیں ٹوٹی بلکہ اس کا سلسلہ مہینوں سے گزر کر ایک سال تک چلتا رہا، ان ہولناک مناظر کو دیکھ کر پورا ہندوستان تھرا اُٹھا، انگریز کا نام سنتے ہی ایک خون خوار بھیڑیے کا تصور آ جاتا تھا اور خوف و دہشت سے لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے، یہ خونی ڈرامہ منظرِ عام پر اور ہزاروں تماشائیوں کی موجودگی میں کھیلا جاتا تھا، عام ہندوستانیوں پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے رہے ہوں گے؟ ظاہر ہے۔

کارواں چل پڑا

یہ تھا وہ روح فرسا اور دل دہلا دینے والا ماحول جب ہندوستان میں جنگ آزادی کے مسلمان مجاہدین نے اپنے سفر کا آغاز کیا، تاریخ کی شہادت ہے کہ یہ سفر مسلمانوں نے تنہا شروع کیا، اس کانٹوں بھری وادی میں صرف انہیں کے تلوے لہولہان ہوتے رہے، لیکن ان کے پائے استقامت میں نہ جنبش ہوئی اور نہ لغزش پیدا ہوئی، اور نہ آگے بڑھا ہوا قدم ایک انچ پیچھے ہٹا، ہر طرف دار و گیر کا حشر برپا تھا۔ علی الاعلان مسلمان پھانسیوں پر چڑھائے جا رہے تھے، گرفتاریوں کا سلسلہ جاری تھا انگریز اب عدالت کی کرسی پر بیٹھ چکا تھا مگر یہ کرسی عدل و انصاف کے لئے نہیں تھی بلکہ وہ اپنے واحد دشمن مسلمانوں کے دماغ سے حکومت و اقتدار کی بو باس کو ختم کرنے کے لئے اس کو استعمال کرتا تھا اور عدل و انصاف کا ڈرامہ کیا جاتا تھا، مقدمات چلائے جاتے تھے فرضی گواہ اور شہادتیں پیش کی جاتی تھیں اور فیصلہ سنا دیا جاتا تھا کہ اس کو تختۂ دار پر چڑھا دو یا ان کی نگاہ میں اس مسلمان کا جرم اور بڑھا ہوا ہے تو اس کو کالے پانی کی سزا دی جاتی تھی، کیونکہ حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا پھانسی کی سزا سے کہیں زیادہ اذیت رساں تھی،

Scanned by CamScanner

انگریز بخصوص مسلمانوں کو یہ سزا دینے میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔

کالے پانی بھیجنے کا مطلب یہ تھا کہ مجرم اپنے وطن اپنے گھر، اپنے دوست، احباب عزیز و اقارب اپنے خاندان اور اپنے بیوی بچوں کے لئے زندہ رہتے ہوئے بھی مر جاتا تھا اور ایسی گھٹ گھٹ کر زندگی گزارنے پر مجبور ہوتا تھا کہ موت کو اس زندگی پر ترجیح دینے لگتا تھا ہندوستان کے مشاہیر علماء و مشائخ، رؤسا و اُمراء جن کی راہوں میں عوام آنکھیں بچھاتے تھے، جن کے اعزاز و احترام کا عالم یہ تھا کہ مسلمانوں میں ان کو سر اور آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا، خوش حال گھرانوں کے افراد جن کی خدمت کے لئے ہمیشہ نوکروں کی پلٹنیں رہتی تھیں ایسے معزز رؤسا ر علماء و مشائخ کو جزیرۂ انڈمان، کالے پانی کی مسموم فضا میں بھیجا جاتا تھا جہاں ان سے ذلیل سے ذلیل کام لیا جاتا تھا یہ جزائر درحقیقت بڑے بڑے قید خانے تھے جس میں چہار دیواریاں اور فصیلیں تو نہیں تھیں لیکن چاروں طرف حدِ نگاہ تک سمندر لہریں مارتا رہتا تھا، ان جزیروں میں ان معزز و محترم شخصیتوں سے لکڑیاں کٹوائی جاتی تھیں، سڑکیں بنوائی جاتی تھیں نالیاں اور گندگیاں صاف کرائی جاتی تھیں کوڑے کرکٹ کی ٹوکریاں ان کے سروں پر لاد کر پھنکوائی جاتی تھیں۔ مولانا فضل حق خیر آبادی جو علمی دنیا میں بے تاج کے بادشاہ تسلیم کئے جاتے تھے لیکن جب ایک شخص جزیرہ انڈمان میں ان کی ملاقات کے لئے پہنچا تو دیکھا کہ علامہ غلاظت کی ٹوکری اٹھائے ہوئے پھینکنے کیلئے جا رہے ہیں، جزیرہ انڈمان میں تمام مسلمان قیدیوں سے اسی طرح کے جبری کام لئے جاتے تھے، انگریزوں نے کتنے مسلمان مجاہدین آزادی کو جزیرۂ انڈمان بھیجا اور کالے پانی کی سزا دی؟ ان کی فہرست بتانی مشکل ہے، مگر تاریخ کے جستہ جستہ واقعات کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کی تعداد چار ہزار سے کسی طرح کم نہیں تھی، کیونکہ مولانا جعفر احمد تھانیسری اپنی خود نوشت ڈائری میں بتاتے ہیں کہ جب مولانا یحییٰ علی صادق پوری کی جزیرے میں وفات ہوئی ہے تو ان کی تجہیز و تکفین میں شرکت کی افسران نے اجازت عام دے دی تھی، ان کی نماز جنازہ میں شریک ہونے والوں کی تعداد چار اور پانچ ہزار کے درمیان تھی اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انگریزوں نے ملک بھر سے چار پانچ ہزار مسلمان مجاہدین آزادی کو گرفتار کر کے کالے پانی بھیجا تھا۔

آزادی بذریعۂ طاقت

انیسویں صدی کے آخر تک بلکہ بیسوی صدی کی ابتدائی دو دہائیوں تک آزادی حاصل کرنے کا

صرف ایک طریقہ تھا کہ مجاہدین آزادی تلواریں ہاتھ میں اٹھالیں اور طاقت کے ذریعہ برسرِ اقتدار طاقت کو بے دخل کر دیں، عدم تشدد کا اصول تو بہت بعد میں دریافت ہوا جس پر بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے عمل شروع ہوا، پھر بھی عدم تشدد کو بطور عقیدہ مسلمانوں نے کبھی بھی تسلیم نہیں کیا، ایک طریقہ کار کے طور پر تو اس کو ضرور مانا گیا اور اس پر مسلمانوں نے عمل بھی کیا مگر عدم تشدد کو عقیدہ کی حیثیت کبھی نہیں دی گئی، جیسا کہ ۱۹۲۲ء میں چوری چورا کے واقعہ پر جب کچھ پرجوش مسلمان مجاہدین آزادی نے تھانے میں آگ لگا کر داروغہ اور سپاہیوں کو بھون ڈالا تو گاندھی جی نے اپنی تحریک نان کوآپریشن واپس لے لی تھی لیکن تحریک واپس لینے اور تشدد کے استعمال پر اظہار ناراضگی کرنے کی وجہ سے ملک میں گاندھی جی سے مجاہدین آزادی کا اعتماد اٹھ گیا تھا جو بہت بعد میں بحال ہوا۔

اسی طرح ۱۹۴۲ء کی تحریک "کوئٹ انڈیا" کے موقعہ پر عدم تشدد کے اصول کو بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا اور عوام نے تشدد کی راہ اختیار کی اور ہتھیاروں سے لیس ہو کر انگریزی اقتدار پر حملہ کر دیا تھا، اسی طرح ۱۹۴۴ء میں سوبھاش چندر بوس نے جاپان کی فوجی مدد سے آزاد ہند فوج بنائی اور انگریزی فوجوں سے ٹکر لی، انڈین نیشنل آرمی کے فوجی افسران کی بہت بڑی تعداد مسلمانوں پر مشتمل تھی، ان تاریخی واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ عدم تشدد کی افادیت ایک محدود دائرے تک ہمیشہ رہی اور جرأت مندانہ اقدام کا موقعہ آیا تو صرف تلواریں کام آئیں مسلمانوں نے اس راہ میں اپنی قوت بازو پر ہمیشہ بھروسہ کیا جب تک ان کے بازوؤں میں طاقت تھی اور انگریزوں کے خلاف کبھی بھی اپنی تلوار میان میں نہیں رکھی، ۱۸۵۸ء سے لے کر ۱۹۰۰ء تک اس ۴۲ سالہ تحریک آزادی میں آگ اور خون سے کھیلتے رہے۔

ایک طرف انگریز ۱۸۵۷ء کی تحریک سے آتشِ زیرِ پا تھا اور دہشت ناک انتقامی کارروائیوں میں مصروف تھا دوسری طرف مجاہدینِ آزادی نئی جدوجہد کے لئے پر تول رہے تھے، جن لوگوں کے سینوں میں آزادی کا جذبہ موجزن تھا ان پر خوف و ہراس طاری کرنے میں انگریزوں کی فوجی طاقت بھی ناکام ہو چکی تھی وہ بدستور جنگِ آزادی کے میدان میں شمشیر بکف تیار کھڑے تھے۔

جنگِ آزادی کا پہلا محاذ

ناامیدی اور مایوسی کے اسی مہیب سناٹے میں ہندوستان کے سرحدی علاقوں کی طرف سے مجاہدینِ آزادی کی تلواروں کی جھنکار رہ رہ کر سنائی دیتی تھی، یہ وہ لوگ تھے جو غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے سے

Scanned by CamScanner

ایک جابر حکومت کے خلاف نبرد آزما تھے لیکن ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد ان کا رُخ اس سفید فام قوم کی طرف مڑ گیا جو ابھی ابھی اقتدار پر قابض ہو کر ہندوستان پر بے پناہ مظالم توڑنے لگی تھی۔

ان مجاہدین آزادی کی سرگرمیوں کا آغاز سید احمد رائے بریلوی اور مولانا اسمٰعیل شہید کی قیادت میں ہوا تھا، لیکن ان حضرات کی شہادت کے بعد یہ طاقت بکھر نہیں گئی بلکہ اس کا نظام اور مستحکم ہوا اور وسیع بھی، اس کے خفیہ کارکن بنگال سے لے کر سرحد تک مسلسل رواں دواں رہتے تھے، ۱۸۵۷ء سے پہلے بھی کئی بار برطانوی فوجوں سے ان کی ٹکر ہو چکی تھی لیکن اس تاریخ کے بعد تو صرف انگریزی حکومت ہی ان کے بالمقابل تھی، ان مجاہدین آزادی کی انگریزوں سے آخری جنگ امبیلہ میں ہوئی، اب مجاہدین آزادی کے اعلانات میں صاف طور پر انگریزی حکومت کا نام لیا جانے لگا تھا اور مسلمانوں کو ان کے خلاف جوش و جذبہ دلایا جاتا تھا مگر یہ جنگ ایسے علاقے میں لڑی جاتی تھی کہ اندرونِ ملک اس کی اہمیت و نزاکت کا صحیح احساس نہیں ہوتا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اس طرح کی جنگ کے لئے اندرونِ ملک کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کیونکہ انگریزوں کا پنجۂ استبداد پورے نظام پر اتنا مضبوط پیوست ہو چکا تھا کہ مجاہدینِ آزادی کی کہیں بھی مورچہ بندی ناممکن ہو چکی تھی، اسی لئے مجاہدینِ آزادی نے محاذ جنگ کے لئے اس مقام کو منتخب کیا جو ہمیشہ سے فاتحین کی گزرگاہ تھی، مسلمانوں کے لئے طاقت کا سرچشمہ بھی وہی تھا، آرین قوم نے اسی درۂ خیبر کی راہ سے آ کر ہندوستان پر قبضہ کیا تھا اور یہاں کے اصلی باشندوں کو اطرافِ ملک کے جنگلوں اور میدانوں میں پناہ لینے پر مجبور کیا تھا، محمود غزنوی کی فوج کے گھوڑوں کی ہنہناہٹ بھی انہیں راستوں میں گونجی تھی، بابر کی تلواروں کی جھنکار بھی اسی شاہ راہ پر سنائی دی تھی۔ اس لئے یہ تسلیم کیا جا چکا تھا کہ ہندوستان کی حکمراں طاقت پر اگر حملہ کیلئے یہی راہ اختیار کی گئی تو کامیابی کے زیادہ امکانات ہیں، اسلئے مجاہدین آزادی نے ہندوستان کے سرحدی صوبے اور آزاد قبائل کو اپنی کمین گاہ بنایا اور اپنی فوجی چھاؤنیاں انہیں علاقوں میں قائم کیں اور وہیں سے انہوں نے انگریزی فوجوں کو کئی بار زبردست شکستیں دیں اور کبھی کبھی مجاہدینِ آزادی کے حملوں کا دباؤ اتنا بڑھ جاتا تھا کہ بڑی سے بڑی فوجیں اس کے دفاع میں لگانی پڑتی تھیں۔

مجاہدینِ آزادی کی کفن بردوش جماعت

مجاہدین آزادی کی جماعت جس کا ذکر خیر چل رہا ہے درحقیقت ہندوستان کو غیروں کے ناپاک قدم سے پاک کرنے کے لئے سروں سے کفن باندھ کر نکلی تھی حیاتِ مستعار کی ان کی نگاہوں میں کوئی

قیمت نہیں تھی، بدن میں جان کی قیمت ان کے نزدیک اتنی ارزاں اور کم تھی کہ جب مذہب اور وطن کی سربلندی اور اس کی عظمت و حرمت کی جنگ اس کا مطالبہ کرے تو بلا تامل اپنی جانیں قربان کر دیں، جیسے کسی فقیر کی جھولی میں چند پیسے انتہائی بے نیازی کے ساتھ کوئی ڈال دے، ان کی سیاست خالص دنیاداروں کی سیاست نہیں تھی کیونکہ ان کا رشتہ اپنے خدا سے اتنا مضبوط تھا کہ سرمو اس کے حکم کی خلاف ورزی سرزد نہیں ہو سکتی تھی یہی وجہ تھی کہ ان کی آواز میں جادو تھا، عوام کے سامنے ان کے چند جملے سحر بن جاتے تھے دیوانہ وار لوگ ان کے حکموں پر عمل آوری کے لئے دوڑ پڑتے تھے، وہ دین اور سیاست کو علیحدہ علیحدہ دو چیزیں نہیں سمجھتے تھے اور نہ ان دونوں کے درمیان خطِ امتیازی کھینچنے کے قائل تھے تحریک کے قائد سید احمد رائے بریلوی، مولانا اسمٰعیل شہید، مولانا عبدالحی بڈھانوی تھے جن کے زہد و تقویٰ للٰہیت و خداترسی کی قسمیں کھائی جاتی تھیں ان کے اخلاص، بے لوثی، بے غرضی پر عوام ایمان رکھتے تھے، اس لئے پورے ہندوستان میں وہ معزز و محترم تھے اگر وہ اپنی اس جنگ میں کامیاب ہو جاتے تو اندرونِ ملک ان کے فداکاروں کی ایسی منظم جماعت وجود میں آ جاتی کہ برطانوی حکومت کی توپ و تفنگ بھی اس آہنی دیوار کو نہیں توڑ سکتی تھی اور انگریزوں کا زمانۂ حکومت سمٹ کر چند سالوں میں ختم ہو جاتا۔

انگریزی حکومت جب اس تحریک کی روحانی طاقت کا تصور کرتی تھی تو پاگل ہو جاتی تھی اور ہر امکانی طاقت لگا کر اس کو شکست دینے کے لئے میدان میں آتی تھی وہ دیکھتی تھی کہ اس تحریک کی وجہ سے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی جماعت شعلۂ جوالہ بنی ہوئی ہے، کبھی اس آگ کی لپٹ بنگال میں نظر آتی ہے، کبھی بہار میں، اور اتر پردیش میں انگارے دہکنے لگتے ہیں تو کبھی پنجاب میں، اس طرح ہندوستان میں مشرق سے مغرب تک انگریزی حکومت کی راہوں میں شعلے ہی شعلے بچھے ہوئے نظر آنے لگتے ہیں، حکومت نے اس آگ کو بجھانے اور ان دہکتے ہوئے شعلوں کو سرد کرنے میں جتنی طاقت صرف کی اس کا نتیجہ برعکس نکلا، تب مدبرینِ برطانیہ نے اپنا طریقۂ جنگ بدلا آگ اور بارود کا کھیل ختم کر کے ڈپلومیسی کی راہ اختیار کی اور انہوں نے ایک فارمولہ دریافت کیا۔

ڈیوائڈ اینڈ رول یعنی ''لڑاؤ اور حکومت کرو''

تصادم کی راہ چھوڑ کر ہندوستان میں ذہن و فکری تصادم پیدا کر دو، ان کی طاقت آپس میں ٹکرا کر اپنا وجود خود کھو دے گی، پھر پوری سرگرمی سے اس پالیسی پر عمل کیا گیا اور جتنی کتابیں لکھی گئیں، پروپیگنڈہ کیا

Scanned by CamScanner

گیا کہ سرحد اور آزاد قبائل میں برطانوی اقتدار کے خلاف جنگ کرنے والے عبدالوہاب نجدی کے بقیۃ السیف ہیں، وہابیوں کی یہ ایک جماعت ہے جو ہندوستان میں وہابی تحریک چلا کر ہندوستان پر حکومت کرنے کا خواب دیکھتی ہے اور ہندوستانی مسلمانوں کو اس راہ پر لے جانا چاہتی ہے جس راہ پر عبدالوہاب نجدی نے حجاز کو لے جانا چاہا تھا اور مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں تمام مقدس مزارات اور گنبدِ خضراء کو ڈھا کر اسلامی روایات کا خون کرنے کا ارادہ کیا تھا اور عربوں نے وہابی تحریک کی اسلام دشمنی کے خلاف نبرد آزما ہو کر حجاز کی سرزمین میں دفن کر دیا، اب ہندوستان میں اسی وہابی تحریک کی نشاۃِ ثانیہ کی جا رہی ہے، یہ پروپیگنڈہ انھوں نے عالمی پیمانے پر کیا اس مقصد کے لئے درجنوں کتابیں لکھی گئیں۔

انگریزی ترکش کا ایک تیر

سید احمد رائے بریلوی اور مولانا محمد اسمٰعیل شہید کی تحریک اور ان کے جانشینوں کی جدوجہد اور ان کی جاں فروشیوں اور قربانیوں کو وہابی تحریک کہہ کر ان کی قدر و قیمت کو گھٹانے کے علاوہ تاریخی حقائق کو منہ چڑانا ہے اور اس صریح جھوٹ اور افسانہ تراشی کی وہی شخص جرأت کر سکتا ہے جس کی بے حیائی اس حد تک پہنچ چکی ہو کہ اس کا جھوٹ اس کے منہ پر کھول بھی دیا جائے تو اس کو ندامت و شرمندگی محسوس نہ ہو، وہابیت کا الزام درحقیقت انگریزی سیاست اور ڈپلومیسی کی ترکش کا ایک زہریلا تیر تھا جو اُن فرشتہ صفت انسانوں کی ایک مقدس جماعت کے سینوں میں پیوست کر دیا گیا ہے تاکہ ان کی بڑھتی ہوئی طاقت کو شکست دی جا سکے اور ان کی جدوجہد سے برطانوی اقتدار کو جو شدید خطرہ لاحق ہے اس کا ایک صدی تک کے لئے ضرور سدِ باب ہو جائے، ان کو خطرہ پیدا ہو گیا کہ اگر اس تحریک نے سرحدی علاقوں میں طاقت پکڑ لی اور افغانستان کی ہمدردیاں حاصل کر لیں تو پھر وہ شاہراہ کھل جائے گی جس سے گزر کر تاریخ ہند کے ہر دور میں فاتحین آتے رہے اور اس سرزمین پر اپنا اقتدار قائم کرتے رہے اگر مجاہدینِ آزادی کو افغانستان، ترکی، ایران اور دوسرے ممالک کی فوجی مدد حاصل ہو گئی تو انگریزوں کا وجود اُن کے رحم و کرم پر منحصر ہو کر رہ جائے گا، کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ تمام فوجی کارروائیوں کے باوجود یہ تحریک زندہ ہے اور اس کی سرگرمیوں میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے، اس لئے انگریزوں نے اس تحریک کو دبانے اور اس کا زور توڑنے کے لئے اپنی پالیسی بدل دی اور سازش اور فریب کاری کا رویہ اپنایا اور اس جماعت کے خلاف پہلا بم وہابیت کا پھینکا جس کا دھواں پورے ہندوستان میں پھیل گیا۔

اس الزام کے پسِ پردہ ان کی وہ فطرت کام کر رہی ہے جس سے کام لے کر سوداگروں کی یہ قوم جو مچھلی، بھس اور بانس اور نیل بیچتی پھرتی تھی اور نیل کی کاشت کر کے گندے حوضوں میں نیل بنایا کرتی تھی ہندوستان کی حکومت پر قابض ہو گئی۔

سچائی کیا ہے؟

انگریزوں نے وہابیت کا پروپیگنڈہ اتنے بڑے پیمانے پر کیا کہ اب اس کو جھوٹ، بے اصل اور فرضی الزام کہہ دینے سے کسی سچائی کا یقین نہیں دلایا جا سکتا، کیونکہ وہابیت کے پروپیگنڈہ نے خود ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک جماعت کو انگریزوں نے اپنا ہم نوا بنا لیا ہے اور جو ایک مشن کے طور پر برابر اس کا پروپیگنڈہ کرتی رہی ہے اور انگریزوں سے ایک قدم آگے بڑھ کر ان کو دائرہ اسلام سے خارج کر کے انگریزوں کے مقصد کو پورا کر دیا اور پوری ایک صدی سے مسلسل یہ الزام دُہرایا جا رہا ہے اور انگریزی سیاست کو زبانِ حال سے خراجِ تحسین پیش کیا جا رہا ہے۔

انگریزوں نے انھیں جذبات کے پیشِ نظر سید صاحب کی تحریک کو وہابی تحریک کا نام دیا اور پھر تمام سرکاری کاغذات، رپورٹوں میں ان مجاہدینِ آزادی کو وہابی لکھنا شروع کر دیا، عدالتوں میں ان مجاہدین پر جو بغاوت کے مقدمات چلائے جاتے تھے ان کو "مقدمۂ وہابیان" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا تاکہ ان کو سنگین سزاؤں کا سزاوار ٹھہرایا جائے تو ملک میں ان کو کسی سمت سے ہمدردی نہ ملے اور ان کو پھانسی کے تختہ پر بھی چڑھا دیا جائے تو پتہ نہ ہلے۔

انگریز قوم تلوار سے زیادہ ڈپلومیسی پر بھروسہ کرتی آئی ہے، اسی ڈپلومیسی نے سوداگروں کی قوم کو ہندوستان جیسے وسیع و عریض اور زرخیز ملک پر قبضہ و تسلط دلا دیا، انگریزوں نے اس دور میں اگر صرف تلوار پر بھروسہ کیا ہوتا تو ابھی ہندی تلواروں میں اتنی کاٹ موجود تھی کہ سوداگروں کی ایک چھوٹی سی جماعت کے وجود کو ہندوستان کی سرزمین سے فنا کر دیتی اور ان کی حکومت کا سورج ہندوستان کے افق پر کبھی طلوع نہ ہوتا، انگریزوں نے اہم اور انتہائی نازک موقعوں پر اور بے انتہا مجبور ہو کر تلوار استعمال کی، ان کی زیادہ توجہ ہندوستان کے مختلف طبقات میں اور ریاستوں میں تشتت و افتراق پیدا کر کے آپس میں لڑا کر کمزور کر دینے کی پالیسی پر تھی۔

Scanned by CamScanner

آزادی کے دیوانے آزادی کی تلاش میں

۱۸۵۸ء سے لے کر انیسویں صدی کے آخری لمحات تک مسلمان تن تنہا جنگ آزادی کے میدان میں برطانوی سامراج سے لڑتا رہا، اس راہ میں کتنے مجاہدین آزادی کا مقدس خون بہا کتنوں نے میدان جنگ میں اپنے خون سے ارغوانی فرش بچھا دیئے اور زمین کو لالہ زار بنا دیا اس کا کوئی صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا، یہ وہ زمانہ تھا کہ اس راہ میں قدم رکھنے کا معنی اپنی جان و مال، آل اولاد، وطن اور گھر بار سب داؤ پر لگا دیا گیا۔

اس راہ میں تہجد گزار صوفیا، ومشائخ بھی آئے، شعلہ بیان آتش نوا علما بھی اس میں غربا بھی تھے اور رؤساو اُمرا بھی، لیکن برطانوی سامراج کی زد پر جو آ گیا اس کا وجود گرد ہو کر فضاؤں میں اُڑ گیا، انگریزوں کی معمولی سزا پھانسی تھی، اگر اس سے کوئی بچ گیا تو اس کو کالے پانی بھیج دیا گیا جو انگریزوں کا سب سے بڑا عذاب خانہ تھا، اس عذاب خانے میں علماء ومشائخ، رؤساو اُمرا نواب و جاگیرداروں کو کیسی کیسی روحانی وجسمانی اذیتیں بھگتنی پڑیں آج بھی پڑھ کر دل کانپ جاتا ہے اور درد سے بھر آتا ہے۔

اس مسموم جزیرے میں کتنے مسلمان مجاہدین آزادی ۱۸۵۸ء کے بعد بھیجے گئے اس کی اب تک کوئی مکمل فہرست شائع نہیں ہو سکی ہے لیکن تخمینہ لگانے والوں نے ۲۰ رفروری ۱۸۶۸ء تک جب مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی کا جزیرۂ انڈمان میں انتقال ہوا ہے ان کے جنازے میں شریک ہونے والے مسلمانوں کا چار اور پانچ ہزار کے درمیان تخمینہ لگایا ہے، یعنی اس وقت تک مسلمان مجاہدین آزادی کم از کم پانچ ہزار بھیجے جا چکے تھے، مجاہدینِ آزادی کی یہ تعداد اُن ہزاروں مسلمانوں کے علاوہ ہے جن کو گرفتار کر کے انگریزوں نے جوشِ انتقام میں پھانسیاں دے دی ہیں یا صفوں میں کھڑا کر کے گولیاں ماردی ہیں، اس تفصیل سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۰۰ء تک مسلمان مجاہدین آزادی نے اپنا کتنا خون آزادی کی راہ میں بہایا ہے، مجھے یقین ہے کہ جن لوگوں نے آزادی حاصل کرنے کا سہرا اپنے سروں پر باندھ رکھا ہے انہوں نے اتنا پسینہ بھی نہیں بہایا ہوگا جتنا مسلمانوں نے اپنا خون بہایا ہے۔

اس سے دردناک وہ عذاب ہے جو اُن مجاہدینِ آزادی کو بھگتنا پڑا جو اُن کی لاکھوں لاکھ کی جائیدادوں کو مفت کے دام حکومت نے نیلام کر کے ان کے معصوم بچوں، پردہ نشین عفت مآب خواتین کو نانِ شبینہ کا محتاج بنا دیا، یہ تصور ہی مجاہدینِ آزادی کے لئے بڑا روح فرسا تھا انہوں نے اپنی پھانسی کا حکم سن کر مسکرا دیا تھا لیکن ان کی آل واولاد کو در در بھیک مانگنے پر مجبور کر دینا خون کے آنسو رُلا گیا جیسا کہ

[illegible] کے ساتھ مولانا [illegible] اللہ صاحب کے ساتھ [illegible]
[illegible] کر کے ان کے خاندان کا [illegible]
[illegible] کی اجازت نہیں دی، یہ دردناک تفصیل ان کے [illegible] صاحب نے اپنی کتاب میں دی ہے۔

لڑاؤ اور حکومت کرو

ایک طرف ہندوستان کی سیاسی سرگرمیاں بڑھتی جارہی تھیں دوسری طرف برطانوی حکومت ایک نئی چال چلنے کے بارے میں بڑی سنجیدگی سے غور وفکر کر رہی تھی اور یہ سامراج کے ساتھ ہندوستان کی بساط سیاست پر مہرہ بٹھانے کے کام میں مصروف تھی، اس کے نزدیک سب سے خطرناک ہندو مسلم اتحاد تھا، اس نے دیکھا کہ تشدد پسند مسلمانوں کی طرف ہندوؤں میں بھی ایسے دیوانے [illegible] جا رہے ہیں جو اپنی جان ہتھیلیوں پر رکھ کر میدان میں آ گئے ہیں اور طاقت وتشدد کے استعمال سے گریز نہیں کرتے، مسٹر رانڈ اور لفٹنٹ ایرسٹ کا بمبئی میں مرہٹوں کے ہاتھوں قتل [illegible] قاتلانہ حملہ، پرجوش مسلمانوں کے بجائے ہندوؤں نے کیا اس لئے ۱۹۰۰ء میں انگریزوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خلیج پیدا کرنے کے لئے ہندی [illegible] اسی سال مسٹر اینٹونی میکڈانل لفٹنٹ گورنر یوپی نے حکم جاری کیا کہ عدالتوں اور کچہریوں میں ہندی رسم الخط میں لکھی ہوئی درخواستیں اب لی جا سکیں گی اس حکم پر ہندو حلقوں میں اظہار مسرت کیا گیا اور جلسے کر کے شکریے کی تجویز پاس کی گئی اور گورنر کی خدمت میں پیش کی گئی۔

دوسری طرف ۱۹۰۳ء میں تقسیم بنگال کا شوشہ چھوڑ کر مسلمانوں سے کہا گیا کہ ہم ایک ایسا صوبہ بنانا چاہتے ہیں جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور اس صوبے میں مسلمانوں کو سیاسی بالادستی حاصل ہو [illegible] دونوں واقعات نے دونوں طبقوں پر الگ الگ اثرات ڈالے اور ہر ایک کو دوسرے سے شکایت پیدا ہو گئی اور بتدریج دونوں فرقوں میں دوری بڑھتی چلی گئی اور انگریزوں کا یہی مقصد تھا دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف میل آ گیا۔

اسی طرح مسٹر آرچبالڈ کے ذریعہ مسلم لیگ کے قیام کے لئے ۱۹۰۶ء سے زمین ہموار کی جا رہی تھی اور شملہ ڈیپوٹیشن کو شرف باریابی بخش کر مسلم لیگ کے قیام کا راستہ آسان کر دیا گیا اور پھر مسلمان کی

Scanned by CamScanner

جنگ کا رخ جو انگریزی حکومت کی طرف تھا مسلم لیگ کے ذریعہ اس کو ہندوؤں کی طرف پھیر دینے کی سازش کی گئی، اس طرح ہندو مسلم چپقلش بڑھانے کے لئے کئی شوشے چھوڑے گئے، یہ چپقلش ۱۹۱۶ء میں شباب پر پہنچ گئی اور بات بالآخر کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان ایک معاہدہ پر جا کر ٹھہری جو میثاق لکھنؤ کے نام سے تاریخوں میں مشہور ہے۔

جلیاں والہ باغ میں

جنگِ آزادی کے دور میں سب سے زیادہ خوں ریز اور کربناک واقعہ اور انگریزی حکومت کی بہیمانہ اور وحشیانہ درندگی کا ہولناک مظاہرہ جلیاں والہ باغ امرتسر میں ہوا، اس سے پہلے ۱۹۱۳ء میں کانپور میں ایک سڑک کو سیدھی کرنے کے نام سے ایک مسجد کو کمالِ لاپرواہی سے شہید کرنے کے نتیجہ میں جو مسلمانوں میں ہیجان پیدا ہوا تھا تو اُسے گولیوں کی بے پناہ بوچھار سے فرو کیا گیا تھا، لیکن جس درندگی و بربریت کا مظاہرہ جلیاں والہ باغ میں ہوا اس کے مقابلے میں یہ سب واقعے ہلکے ہیں۔

صورت یہ ہوئی کہ پنجاب کے کئی ضلعوں میں مارشل لا لگایا جا چکا تھا، پولیس کو چوکنا کر دیا گیا تھا، ستیہ گرہ کمیٹی کے فیصلہ کے مطابق عمل درآمد کے نتیجہ میں امرتسر میں مکمل ہڑتال ہوئی، انگریزوں کے نادر شاہی مزاج کے لئے یہ جرم کافی تھا، پنجاب کے دو مشہور و مقبول لیڈروں کو گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا گیا جن میں سے ایک ڈاکٹر ستیہ پال اور دوسرے ڈاکٹر سیف الدین کچلو تھے جو کانگریس کے ممتاز اور بڑے لیڈروں میں شمار کئے جاتے تھے عوام کو جب پتہ چلا کہ حکومت انتقام پر اتر آئی ہے تو ان میں بھی اشتعال پیدا ہوا اور لوگ گھروں سے نکل کر سڑکوں پر آگئے تا کہ اپنے لیڈروں کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کر سکیں، مجمع زیادہ تھا اور حکومت کے جابرانہ طرزِ عمل سے مشتعل بھی، مجمع نے ایک بینک پر حملہ کر دیا، عمارت کو آگ لگا دی اور نقصان پہنچایا اور حکومت کے خلاف نعرے لگاتا ہوا واپس ہو گیا اور اعلان کیا گیا کہ شام کو ساڑھے چار بجے جلیاں والہ باغ میں جلسۂ عام ہوگا تا کہ اپنے محبوب لیڈروں کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کیا جائے۔

پنجاب کا ہٹلر، ڈائر

جنرل ڈائر ہٹلرانہ دل و دماغ اور نادر شاہی مزاج کا ایک فوجی افسر تھا وہ فوجیوں کی ایک بڑی تعداد کو لے کر امرتسر پہنچ گیا، اس نے دل میں پہلے ہی سے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ امرتسر کی سرزمین اپنی خوں آشام

فطرت کی تشنگی، بے گناہ ہندوستانیوں کے خون سے ضرور بجھائے گا، اس نے آتے ہی جس طرح جنگ کے موقعہ پر احکام نافذ کئے جاتے ہیں منادی کرادی کہ جو لوگ مارشل لا کی خلاف ورزی کریں گے انہیں فوج کے ذریعہ کچل دیا جائے گا ایک ظالم اور بد دماغ انسان اور کیا کہہ سکتا تھا یہ اعلانِ عام عوام نے سنا اور لاپرواہی کے ساتھ اَن سُنا کر دیا، اور حسبِ اعلان جلسہ میں شرکت کرنے کے لئے جلیاں والہ باغ کی طرف چل پڑے اور جلسے کا مقررہ وقت آتے آتے تقریباً پندرہ ہزار کا مجمع ہو گیا، یہ جلسہ اس لئے منعقد ہو رہا تھا کہ اپنے اوپر ہونے والے مظالم اور نافذ کئے جانے والے جابرانہ قوانین اور پولیس کے ہٹلرانہ رویہ و اختیارات کے خلاف احتجاج کی آواز بلند کی جا سکے۔

امرتسر خون میں نہا گیا

جب جنرل ڈائر کو اپنے کیمپ میں یہ معلوم ہوا کہ ساڑھے چار بجے شام کو جلیاں والہ باغ میں شہریوں کا ایک جلسہ ہو رہا ہے تو اپنی فوج کے ایک دستہ کو لے کر موقعہ پر پہنچ گیا، فوج اپنے ساتھ مشین گن بھی لے گئی تھی لیکن باغ کا راستہ تنگ تھا اور اتنی بھاری مشین اندر نہیں جا سکتی تھی اس لئے مشین گن کو باغ کے دروازے پر کھڑا کر دیا اور فوج کو باغ کے چاروں طرف پھیلا کر حصار بندی کر لی، اور عوام کے بھاگ کر جانے کے سارے راستے بند کر دیئے، ہر طرف سے مجمع کی اس طرح ناکہ بندی کی گئی جیسے دشمن کی فوج کا محاصرہ کیا جاتا ہے۔

ساری تیاریاں کر لینے کے بعد ڈائر نے دیکھا کہ ایک شخص اسٹیج پر تقریر کر رہا ہے اور مجمع خاموشی سے سن رہا ہے، جنرل ڈائر کے حاکمانہ غرور کو ٹھیس لگی، نہتے عوام کی یہ جرأت؟ نوخیز اور کمسن بچوں کی یہ مجال؟ کوئی خوف نہیں۔ کوئی ہراس نہیں، مسلح فوج سامنے کھڑی ہے، مشین گن انگلیوں کی ایک جنبش کا انتظار کر رہی ہے، بندوقیں آگ اگلنے کے لئے بے چین ہیں، لیکن ڈر کا کہیں گزر نہیں، دہشت اور مرعوبیت کا کہیں دور دور تک پتہ نہیں؟ چنگیز و ہلاکو کی روح جنرل ڈائر کے ناپاک جسم میں حلول کر گئی، نادر شاہی درندگی نے ایک جھرجھری لی اور بغیر کسی انتظار اور مجمع کو منتشر ہو جانے کا حکم دیئے بغیر فوج کو بزن کا حکم اور فائرنگ کا آرڈر دے دیا، پھر کیا تھا؟ ایک محشرِ قتل تھا، میدانِ قیامت تھا، موت سراسیمہ بھاگی بھاگی پھرتی تھی، کس کی روح قبض کرے، کشتوں کے پشتے لگ گئے، نہتا اور خالی ہاتھ مجمع، ایک ایک فائر میں کئی کئی لاشیں زمین پر تڑپنے لگتیں، مجمع گولیوں کی بوچھار سے بھاگنے کے لئے راستوں کی طرف دوڑا

Scanned by CamScanner

کہ کسی طرح باغ سے نکل جائیں، مگر فوج راستہ روکے ہوئے کھڑی تھی، بھاگنے والوں کو وہیں بھون کر رکھ دیا، بیکسی و بیچارگی میں کچھ لوگ زمینوں پر لیٹ گئے، فوجیوں نے لیٹنے والوں کو نشانہ بنایا، نوجوانوں کی لاشیں تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہوتی گئیں، بوڑھے تو کراہ بھی نہ سکے اور دم توڑ دیا، پھولوں جیسے معصوم اور کمسن بچوں نے جو تماشائیوں کے ہجوم میں شامل تھے خون اُگل اُگل کر جان دے دی، ایک، دو، تین، چار، پانچ فائر پر فائر مسلسل گولیاں برستی رہیں، لاشوں پر لاشیں گرتی رہیں، اور جنرل ڈائر باغ کے ایک گوشے میں کھڑا مسکراتا رہا، فوج نے کہا، گولیاں ختم ہوگئیں، ڈائر نے کہا کھیل بھی ختم ہوگیا، آؤ، واپس چلیں۔

جلیاں والہ باغ کا روح فرسا منظر

سرکاری اخباروں نے کہا پونے چار سو آدمی مارے گئے، معتبر راویوں نے بتایا کہ پندرہ سو سے کم آدمی شہید نہیں ہوئے، لاشوں کے اعداد وشمار کون جمع کرے، کس میں ہمت تھی کہ اس روح فرسا قیامت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے، لاشیں کچھ اس طرح تہ بہ تہ تھیں کہ شمار کرنا مشکل تھا، فوج واپس جاچکی تھی، پورا باغ لاشوں سے پٹا پڑا تھا، باغ کی پوری زمین انسانی خون سے لالہ زار بنی ہوئی تھی، کوئی قدم خون میں ڈوبے ہوئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا تھا، رات ہوچکی تھی، یہ رات امرتسر کے لئے قیامت کی رات تھی، آوارہ کتوں اور مردہ خور جانوروں کی باغ میں یلغار تھی، لاشیں نوچی اور کھسوٹی جارہی تھیں۔

گھر والے اپنے اپنے عزیزوں کی تلاش میں نکلے، بیویاں اپنے شوہروں کی جستجو میں آئیں انہوں نے دیکھا کہ ابھی بہت سے لوگ لاشوں کے انبار میں پڑے ہوئے ہیں جن میں زندگی کی رمق باقی ہے، کچھ لوگ پانی مانگ رہے ہیں، کچھ زخمی اور گھائل اپنے جسم کے درد سے چیخ رہے ہیں، کچھ آوارہ کتوں اور جانوروں کے حملوں سے بچاؤ کیلئے فریاد کررہے ہیں، مگر اس محشرستانِ قتل میں کون تھا جو اُن کی فریاد کو سنتا اور فریادرسی کرتا؟

فتویٰ یا اعلانِ بغاوت

مسلمانوں کی دوسری تنظیم جمعیۃ علماء کا دہلی میں ایک اجلاس نومبر ۱۹۲۰ء میں ہوا اس اجلاس میں خلافت کمیٹی کے فیصلے کی تائید کرتے ہوئے انگریزی حکومت کے ساتھ ہر طرح کے تعاون کو حرام قرار دیا

گیا۔ یہ اجلاس بڑا اہم اجلاس تھا کیونکہ اس کی صدارت حضرت شیخ الہند فرما رہے تھے جو ابھی تازہ تازہ جزیرۂ مالٹا کے قید خانے سے برسہا برس کی اذیتیں جھیلنے کے بعد ہندوستان واپس آئے تھے اور سیاسی لیڈروں کی آنکھوں کا تارا بن چکے تھے، عزت واحترام کے لحاظ سے نام کے بجائے ان کو شیخ الہند کے معزز لقب سے لوگ یاد کرنے لگے تھے۔

جلسہ میں ہندوستان کے مشاہیر علماء کے علاوہ صوبائی سطح پر کام کرنے والے مختلف صوبوں میں سے بنگال، سندھ، سرحد، بہار، آسام وغیرہ کے تقریباً پانچ سو علماء شریک اجلاس ہوئے، اس اجلاس نے فیصلہ کیا کہ اس تجویز کو فتویٰ کی شکل میں مرتب کرکے شائع کردیا جائے۔

فتوی مرتب کیا گیا اور اس پر ۴۷۴ علماء کے دستخط ہوئے اور طبع کراکے ملک میں عام کردیا گیا، اور ہندوستان کے ہر خطے میں بھیج دیا گیا، اس فتویٰ میں ترک موالات وتعاون کی وضاحت بھی کی گئی تھی کہ انگریزی حکومت کی معاونت اور قاتل مسلم کی ملازمت کرنا، ملازم رہنا، ملازم کرانا، فوج میں بھرتی ہونا، بھرتی کرانا سب حرام ہے۔

فتویٰ ضبط کرلیا گیا

۱۸ اگست ۱۹۲۱ء کو یہ فتویٰ اور اس کا خلاصہ جو شائع کیا گیا تھا دونوں گورنمنٹ نے خلاف قانون کہہ کر ضبط کرلیا اور وسطِ ستمبر ۱۹۲۱ء میں جمعیۃ علماء کے رہنماؤں کو ملک کے مختلف مقامات سے گرفتار کرکے ان پر مقدمہ چلایا گیا دو دو سال کی قیدِ بامشقت ہوئی، سزا کا فیصلہ سنانے والے سیشن جج نے اپنے فیصلہ میں جو ریمارک دیئے ہیں ان سے جمعیۃ علماء کے بارے میں حکومت کے نقطۂ نگاہ کا پتہ چلتا ہے، جج نے اپنے فیصلے میں لکھا ہے کہ:

> ''ملزمان کے مذہب، عقائد اور جذبات کو بالکل نظر انداز کردیا جائے، یہ اندرونِ ہند اسلام نوازی ہے، ان تمام کارروائیوں سے یہ حقیقت روشن ہوگئی کہ دراصل موجودہ انقلاب اور بے چینی کا اصل باعث نام نہاد علماء کی سازشی جماعت جمعیۃ علماء ہند ہے، جو خفیہ سازشیں نہیں عظیم الشان جلسے طلب کرکے بڑے بڑے پنڈالوں میں کھلم کھلا سازش کرتی ہے۔''

Scanned by CamScanner

تجویز کیا تھی؟

ترکِ موالات کی جو تجویز پاس ہوئی اس میں واضح کیا گیا کہ موجودہ حالات میں گورنمنٹ برطانیہ کے ساتھ موالات ونصرت کے تمام تعلقات اور معاملات رکھنا حرام ہے جس کے تحت حسب ذیل امور بھی واجب العمل ہیں:

۱۔ خطابات اور اعزازی عہدے چھوڑنا۔
۲۔ کونسلوں کی ممبری سے علیحدگی اور امیدواروں کے لئے رائے دینا۔
۳۔ دشمنانِ دین کو تجارتی نفع نہ پہنچانا۔
۴۔ کالجوں اور اسکولوں میں سرکاری امداد نہ قبول کرنا اور سرکاری یونیورسٹیوں سے تعلق قائم نہ رکھنا۔
۵۔ دشمنانِ دین کی فوج میں ملازمت نہ کرنا اور کسی قسم کی فوجی امداد نہ پہنچانا۔
۶۔ عدالتوں میں مقدمات نہ لے جانا اور وکیلوں کے لئے ان مقدمات کی پیروی نہ کرنا۔

یہ تجویز اجلاس میں مولانا احمد سعید دہلوی ناظم جمعیۃ علماء ہند نے پیش کی اور تجویز کی تائید کرنے والوں میں مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری، مولانا محمد داؤد غزنوی، مولانا عبدالحکیم صدیقی لکھنوی اور مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری تھے۔

ہنگامۂ دار و گیر شروع ہوگیا

سیاسی میدان میں مسلمانوں کے جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ سر سے کفن باندھ کر جہاد کے میدان میں وہ اتر چکے تھے، جیل جانا کھیل ہوگیا، یہ وہ زمانہ ہے جب انڈین نیشنل کانگریس بھی ابھی اتنی دور تک جانے کے لئے تیار نہیں تھی اور اتنی تیز اور گرم سیاست کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی، خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علماء ہند کے فیصلوں کے بعد کانگریس نے اپنے اجلاسِ کلکتہ میں نان کوآپریشن رزولیشن بعد میں منظور کیا۔

ترکِ موالات کی یہی تجویز اور یہی فتویٰ تھا جس کی بنیاد پر کراچی کا مشہور مقدمہ ہوا جس کو ہندوستان گیر شہرت حاصل ہوئی اور مسلمانوں کی جرأت، حق گوئی اور اپنے نصب العین سے عشق ومحبت کا لوگوں نے ایک دل کش نظارہ دیکھا اور اس سے سبق لیا۔

مقدمۂ کراچی

۸، ۹، ۱۰ر جولائی ۱۹۲۱ء کو کراچی میں زیرِ صدارت مولانا محمد علی جوہر آل انڈیا خلافت کانگریس کا اجلاس ہوا، اس اجلاس میں ایک تجویز منظور ہوئی تھی جس میں انگریزی حکومت کی پولیس اور فوج میں ملازمت کو حرام قرار دیا گیا تھا کسی چیز کی حلت وحرمت کا فیصلہ ایک عالم دین ہی کرسکتا ہے، اس اجلاس میں وہ عالم دین مولانا حسین احمد مدنی کی ذات تھی، مولانا مدنی نے یہ تجویز اجلاس میں پیش کی، اس کی تائید میں تقریر کرنے والوں میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، اور مولانا نثار احمد تھے، بعد میں اس تجویز کو فتویٰ کی شکل میں مرتب کرکے شائع کردیا گیا اس فتویٰ پر دستخط کرنے والوں میں مولانا حسین احمد مدنی، مولانا نثار احمد اور پیر غلام مجدد شامل تھے، اس کو طبع کراکے ملک میں تقسیم کیا گیا، حکومت نے اس کو قانون کے خلاف قرار دے کر ضبط کرلیا اور تجویز پیش کرنے والوں اور تائید کرنے والوں اور فتویٰ پر دستخط کرنے والوں کے نام بلا ضمانتی وارنٹ جاری کردیئے گئے۔

مولانا حسین احمد مدنی کو دیوبند سے ایک انگریز افسر نے گورا فوج کے جوانوں کو لے کر رات میں گرفتار کیا اور فوجی پہرے میں دیوبند سے کراچی پہنچایا، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا نثار احمد اور پیر غلام مجدد کو اپنے اپنے مقامات سے گرفتار کرکے کراچی جیل بھیج دیا گیا ان لوگوں پر دفعہ ۱۲۰ (ب) دفعہ ۵۰۵، دفعہ ۱۱۷ر تعزیرات ہند کے تحت ان لوگوں کو کراچی جیل کی حوالات میں بند کردیا گیا، ۲۰ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو خالق دینا ہال بندر روڈ کراچی میں ان لوگوں پر مقدمہ چلایا گیا، چونکہ مقدمہ انتہائی سنگین تھا اور بڑی سے بڑی اور سخت سے سخت سزا دی جاسکتی تھی اس لئے متوقع شورش کے پیش نظر حکومت نے پبلک کو مرعوب اور خوف زدہ کرنا ضروری سمجھا، اس لئے اس نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا، مسلح پولیس اور فوج کا بھاری انتظام کیا اور ان کو خالق دینا ہال کے چاروں طرف پھیلا دیا گیا اور یہ بھی پابندی لگادی گئی کہ مقدمہ کی کارروائی سننے اور دیکھنے کے لئے بغیر اجازت نامہ کوئی شخص احاطۂ عدالت میں داخل نہیں ہوسکتا، ۲۶ر ستمبر کی صبح ہی سے پولیس اور فوج نے عدالت کو حصار میں لے لیا، شہر کے لوگ حیرت زدہ تھے کہ خلافِ معمول آج مسلح پولیس اور فوج کی اتنی بڑی تعداد کیوں بلائی گئی، حقیقتِ حال معلوم کرنے کے لئے لوگ گھروں سے نکل آئے اور سڑکوں پر پھیل گئے، بھیڑ بڑھتی گئی، کچھ دیر بعد پولیس اور فوج نے لوگوں کو سڑکوں سے ہٹانا شروع کیا ۱۱ بجے ملزمان، پولیس کی گاڑی میں اس طرح لائے گئے کہ پولیس کی کئی گاڑیاں آگے آگے چل رہی تھیں اور کئی گاڑیاں پیچھے پیچھے، ملزمان کی جیپ بیچ میں چل رہی تھی۔

اس مقدمہ میں جو بیانات دیئے گئے وہ زبان سے نکلے ہوئے چند الفاظ نہیں تھے بلکہ ان کو زبان سے ادا کرنے کے لئے فولاد کا جگر اور آہنی عزم وارادہ کی طاقت چاہیے تھی، عدالت میں بیان نہیں تھا جہاد اکبر تھا، اس مقدمہ میں دوسروں کے بیانات بھی حق گوئی و بیباکی کے شاہکار تھے لیکن مولانا حسین احمد مدنی نے جو بیان دیا وہ ہندوستان کی جنگِ آزادی کی تاریخ میں سنہرے حروف میں لکھا جائے گا آپ نے عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

> "اگر گورنمنٹ کا منشا مذہبی آزادی کو سلب کرنا ہے تو صاف صاف اعلان کردیا جائے تاکہ سات کروڑ مسلمان اس بات پر غور کرلیں کہ آیا ان کو مسلمان رہنا منظور ہے یا گورنمنٹ کی رعایا، اسی طرح ۲۲ کروڑ ہندو بھی غور کرلیں کہ ان کو کیا کرنا چاہیے، کیونکہ جب مذہبی آزادی چھنی جائے گی تو سب کی چھنی جائے گی۔
>
> "اگر لارڈ ریڈنگ اس لئے ہندوستان بھیجے گئے ہیں کہ قرآن مجید کو جلادیں اور حدیثوں کو مٹادیں اور فقہ کی کتابوں کو تباہ و برباد کردیں تو سب سے پہلے اسلام پر اپنی جان قربان کرنے والا میں ہوں گا۔"

اس بیان پر بے قابو ہوکر حاضرین نے نعرۂ تکبیر بلند کردیا اور مولانا محمد علی نے بڑھ کر مولانا مدنی کے ہاتھ چوم لئے سارے ملزمان کو سیشن کے سپرد کردیا گیا، سیشن جج نے خلاف توقع صرف دو دو سال کی قید بامشقت کا فیصلہ سنایا اور تمام ملزمان مولانا حسین احمد مدنی مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا نثار احمد، پیر غلام مجدد کو سابرمتی جیل بھیج دیا گیا۔

چوری چورہ میں کیا ہوا؟

چوری چورہ پہلے گورکھپور ضلع میں تھا اور جب دیوریا کو ضلع بنادیا گیا تو وہ دیوریا ضلع میں شمار کیا جانے لگا یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے یہاں کھالوں کی تجارت بڑے پیمانے پر ہوتی ہے اس لئے یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی آبادی ہے۔

کانگریس کی تحریک نان کوآپریشن شباب پر تھی، اسی زمانے میں چوری چورہ کا واقعہ ظہور پذیر ہوا، یہ واقعہ ہندوستان کی جنگِ آزادی کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے یہ ۱۹۲۲ء کی بات ہے، گورکھپور ضلع میں اس تحریک میں روح پھونکنے والا عبداللہ تھا جو موضع راجدھانی کا رہنے والا تھا جو تھانہ چوری

چورہ کے حلقہ میں آتا ہے، اس نے احمد آباد کے کانگریس سیشن میں والنٹیر کے فرائض انجام دیئے تھے اور مبلغ کا نظام اس کے سپرد تھا، وہ بسلسلۂ روزگار احمد آباد گیا ہوا تھا، وہاں سے واپسی کے بعد اس نے ضلع گورکھپور میں والنٹیروں کی تنظیم کی، کسانوں اور کھیت مزدوروں کو منظم کیا، اس کام میں اس کے دو ساتھی لعل محمد اور بھگوان یادو بھی تھے۔ چوری چورہ گاؤں میں ان نوجوانوں نے ۳۵ والنٹیر بھرتی کیے، لعل محمد کو منڈل کانگریس کا سکریٹری چنا گیا، اب باقاعدہ ان والنٹیروں نے شراب کی دکانوں پر پکٹنگ شروع کردی شراب کے ٹھیکے داروں نے پولیس سے شکایت کی پولیس نے ان والنٹیروں کو پکڑ کر بید سے مارا اور پیٹا، اور پھر ان کے زخموں پر نمک چھڑک کر تھانے سے باہر دھکیل دیا اور یہ حکم سنایا گیا کہ اس علاقہ کو چھوڑ کر کہیں نکل جائیں، اس ظلم و بربریت کے خلاف لعل محمد نے ضلع کانگریس کے صدر سبحان اللہ کو تحریری شکایت بھیجی، اس پر فیصلہ ہوا کہ تھانے پر مظاہرہ کیا جائے، اور تھانے دار سے پوچھا جائے کہ اس نے والنٹیروں کے ساتھ یہ بہیمانہ سلوک کیوں کیا؟ ایک مقررہ تاریخ پر مظاہرہ کرنے والوں کا جتھہ ڈومری گاؤں سے چل کر چوری چورہ تھانے پر پہنچا، تھانے دار نے جلوس کے سامنے حاضر ہوکر معافی مانگ لی اور جلوس لوٹنے لگا، تھانے سے کچھ دور جانے کے بعد فائرنگ کی آواز سن کر جلوس پھر لوٹ پڑا، پولیس نے لوٹتے ہوئے جلوس پر گولی چلادی، جلوس نے تھانے پر پتھراؤ شروع کردیا، پولیس نے پتھر کا جواب بندوق کی گولیوں سے دیا، جلوس کے تین آدمی وہیں خاک وخون میں تڑپ تڑپ کر مرگئے، جس میں چوری چورہ کے مولوی نذر علی کے علاوہ رام کھلاون اور بھگوان کے نام شامل ہیں پولیس کی گولیاں ختم ہوگئیں تو پولیس تھانے میں گھس گئی۔

جلوس والوں نے میدان خالی دیکھا تو مٹی کا تیل چھڑک کر تھانے میں آگ لگادی جس میں تھانے دار اور ایک انسپکٹر، ہیڈ کانسٹبل، دس سپاہی، مسلح گارڈ کے چھ سپاہی اور چار چوکیدار جل کر راکھ ہوگئے۔

جلوس نے تھانے سے واپس ہوکر ٹیلی گراف کی لائن کاٹ دی اور موضع کرمہا کے قریب ریلوے لائن کو اکھاڑ دیا، ڈاک خانہ اور ریلوے اسٹیشن پر کانگریس کا جھنڈا لہرادیا۔

اس دیار پر قیامت ٹوٹ پڑی

پولیس کی اطلاع پر گورکھپور کے کلکٹر نے پٹنہ سے فوج اور سول پولیس کو طلب کیا، اس نے آکر علاقہ

Scanned by CamScanner

کی تیار فصل میں آگ لگادی اور جو بھی مل گیا اس کے ہاتھ پاؤں مار کر توڑ دیے، گاندھی جی اس وقت کانگریس کے لیڈر تھے انہوں نے پولیس والوں کو جلا دینے کی مذمت کی اور نان کوآپریشن کی تحریک کو واپس لینے کا اعلان کردیا جس کی وجہ سے سیاسی لیڈروں میں گاندھی جی کے خلاف بدگمانیاں پھیل گئیں اور پورے ہندوستان میں مایوسی اور بددلی پھیل گئی اور پولیس نے اس علاقہ میں من مانی کارروائی شروع کردی۔

ڈپٹی انسپکٹر جنرل سینڈے نے اندھادھند گرفتاریاں شروع کردیں ۲۲۷ر افراد پر دفعہ ۱۲۰ شہنشاہ کے خلاف بغاوت، دفعہ ۳۰۲ قتل عمد، دفعہ ۳۹۵ ڈکیتی، دفعہ ۴۳۵ر آتش زنی، دفعہ ۳۳۲ سرکاری ملازموں پر حملہ، ٹیلیگراف ایکٹ کی دفعہ ۱۲۵ر اور ریلوے ایکٹ کی دفعہ ۱۲۶ کے تحت مقدمہ چلایا گیا، ۲۲۷ ملزمان میں ۵۶ افراد فرار تھے، ۱۸۱ر کو سیشن سپرد کیا گیا ان میں سے ۱۷۲ کو سزائے موت کا حکم سنایا گیا، ہائی کورٹ میں اپیل کے بعد ۱۹ کو سزائے موت ۱۶ کو عمر قید اور ۹۳ کو مختلف المیعاد سزائیں دی گئیں، ان پھانسی دیئے جانے والوں میں تحریک کے دونوں لیڈر عبداللہ اور لعل محمد بھی شامل تھے، ان تمام لوگوں کو ۲ر جولائی ۱۹۲۲ء کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا ان سے پہلے مولوی نذر علی کو تھانے ہی پر گولیوں سے پولیس بھون چکی تھی۔

نہرو رپورٹ کا قضیہ

اسی دوران وزیر اعظم برطانیہ نے لندن پارلیمنٹ میں اعلان کیا بلکہ چیلنج کیا کہ اگر ہندوستان آزادی کا مطالبہ کرتا ہے تو اس کو چاہئے کہ وہ ایک دستور مرتب کرکے پیش کرے ہم اس دستور کو منظور کرکے ان کی مرضی کے مطابق حکومت بنالینے کا موقعہ فراہم کریں گے۔

اس چیلنج کے جواب میں موتی لال نہرو کی سرکردگی میں ایک کمیٹی بنائی گئی تاکہ ایک دستور مرتب کرے اور اس کو ملک کے سامنے پیش کرکے استصواب کرلیا جائے اور اس کے بعد حکومت کو پیش کردیا جائے، یہ دستور مرتب کیا گیا لیکن اس کمیٹی میں تنگ نظر افراد کی تنگ نظری نے زہر بو دیئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی فرقے نے دستور کی تائید نہیں کی اور نہ اس کو تسلیم کیا، تاریخ میں اسی دستور کے مسودہ کو نہرو رپورٹ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، لکھنؤ کلکتہ اور بعض دوسرے مقامات پر آل پارٹیز کنونشن بلائے گئے تاکہ اس دستور پر اتفاق رائے ہوجائے مگر ہندو مسلم خلیج بڑھتی رہی، نہرو رپورٹ کی حمایت کرنے والوں سے اس کی نفی اور اختلاف کرنے والوں کی تعداد بڑھ گئی آخرکار کانگریس نے تنگ آکر اپنے لاہور کے

اجلاس کے موقعہ پر اسے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا اور تین سال کے قریب اس منحوس رپورٹ کی وجہ سے انتشار رہا اور حکومت سے محاذ آرائی بند رہی۔

ڈانڈی مارچ

۱۹۲۹ء میں کانگریس نے اپنی ستیہ گرہ کا دوبارہ آغاز نمک سازی سے کیا، حکومت نے اس وقت نمک سازی پر پابندیاں عائد کردی تھیں اس حکم کی خلاف ورزی کو ستیہ گرہ کی بنیاد بنایا گیا، گاندھی جی نے بمبئی کے ایک مقام ڈانڈی میں نمک بنانے کی تحریک کی، کانگریس کے ورکر ڈانڈی کی طرف مارچ کرتے، نمک بناتے اور گرفتار ہوکر جیل چلے جاتے، جس کے بارے میں یہ علم ہوجاتا کہ یہ ڈانڈی جارہا ہے اس کو وہیں گرفتار کرلیا جاتا، مسلمانوں کے ایک جری اور بہادر لیڈر مولانا حفظ الرحمان ڈابھیل سے چل کر ڈانڈی پہنچے اور گاندھی جی کے ساتھ نمک سازی کی ستیہ گرہ میں حصہ لیا اور گرفتار ہوئے۔

پسِ دیوارِ زنداں

مسلمانوں کی ایک سیاسی جماعت جمعیۃ علماء کا اخبار الجمعیۃ جو دہلی سے نکلتا تھا اور مسلمانوں کو جنگِ آزادی کی دعوت دینے اور ان میں جذبۂ سرفروشی پیدا کرنے میں اہم رول ادا کر رہا تھا حکومت نے اس کے بہت سے آرٹیکلوں کو بنیاد بنا کر ضمانت ضبط کرلی، مئی ۱۹۳۰ء میں جمعیۃ علماء کا سالانہ اجلاس مرادآباد میں ہوا اور ترکِ موالات اور عدمِ تعاون کی تجویز کی تجدید کی گئی، اس اجلاس کے تیسرے ہی ہفتہ بعد مسلمانوں کے ایک عظیم رہنما مولانا حفظ الرحمان کو گرفتار کرکے حکومت نے جیل بھیج دیا، اس سے پہلے ۱۹۲۹ء میں سول نافرمانی کے سلسلہ میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید فخر الدین احمد شیخ الحدیث جامعہ قاسمیہ مرادآباد، "علماء ہند کا شاندار ماضی" کے مصنف مولانا سید محمد میاں اور یوپی جمعیۃ علماء کے رہنما مولانا بشیر احمد بھٹہ کو گرفتار کرکے میرٹھ کی جیل میں حکومت کی مہمانی کی عزت حاصل ہوچکی تھی، مسلمانوں کی یہ جماعت انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ حکومت کی نگاہ میں تمام جرموں میں ملوث تھی اس لئے اس کے مرکزی جمعیۃ اور صوبائی جمعیۃ کے رہنماؤں میں سے اکثر اس سول نافرمانی میں سلاخوں کے پیچھے بند کیے جاچکے تھے۔

Scanned by CamScanner

مارچ ۱۹۳۰ء میں گاندھی اروِن پیکٹ ہوا، اس پیکٹ کے بعد سول نافرمانی اور ستیہ گرہ کا پروگرام عارضی طور پر ملتوی کر دیا گیا اور تمام سیاسی قیدی رہا کر دیے گئے لیکن مولانا حفظ الرحمان کو نہیں چھوڑا گیا، ۱۹۳۰ء کے آخر میں مجلسِ احرار کے مشہور آتش بیان خطیب و رہنما مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔

سول نافرمانی کا دوسرا مرحلہ

۱۹۳۰ء میں گاندھی اروِن پیکٹ کے بعد عارضی طور پر سول نافرمانی کا پروگرام ملتوی کر دیا گیا لیکن حالات نے پھر پلٹا کھایا اور صورت حال بدل گئی، حکومت معاہدہ کی پابند نہ رہ سکی، اس لئے ۱۹۳۲ء میں کانگریس اور جمعیۃ علماء دونوں نے ستیہ گرہ اور سول نافرمانی کا آغاز کر دیا، جمعیۃ کی طرف سے سول نافرمانی کا اعلان ہوتے ہی اس کے اکابر رہنما گرفتار کر لئے گئے اور جیلوں میں بھیج دیئے گئے، سول نافرمانی کی تحریک اپنے ساتھ اب کی بار بہت سی ہولناکیاں لے کر آئی، اب جو شخص گرفتار کیا جاتا تو اس کو جیل کی سزا کے ساتھ ساتھ اس کی جائیداد بھی ضبط کر لی جاتی تھی، یا ان پر بڑے بڑے جرمانے عائد کئے جاتے اور اس جرمانے کی وصول یابی کے لئے سول نافرمانی کرنے والے رضا کاروں کی جائدادوں کو حکومت نیلام کرا دیتی تھی اور رضا کار کے اہل و عیال نانِ شبینہ کے محتاج ہو جاتے تھے۔

نیا جال لایا پرانا شکاری

ستیہ گرہ، سول نافرمانی، ترکِ موالات جو بھی نام دیجئے بات ایک ہی تھی کہ ہم ہندوستان پر انگریزی اقتدار کو برداشت نہیں کرتے، ہم اس حکومت اور اس کے قوانین سے بیزار ہیں، اور اب ہم غلامی کی ذلت مزید برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں، ملک ہمارا ہے، اس ملک پر سات سمندر پار کے لوگوں کا غاصبانہ قبضہ اب ہمارے لئے ناقابلِ برداشت ہے، ہندوستان کے عوام نے ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۲ء تک مسلسل اپنے عمل سے اپنے ان جذبات کا اظہار کیا، حکومت نے نعرہ لگانے والوں کی زبانوں کو بند کرنے کے لئے اپنے کرایہ کے سپاہیوں کو استعمال کیا، ہندوستانیوں کو ہندوستانیوں سے کٹوایا، ان کے سینوں کو گولیوں سے چھلنی کروایا، بھائی کو بھائی سے ذبح کرایا لیکن شہید ہونے والوں کے خون کے ایک

ایک قطرے سے انقلاب زندہ باد کا نعرہ بلند ہوتا رہا، نعروں کی آواز خوفناک ہوتی چلی گئی ایوان حکومت کی خلوتوں میں خوف و ہراس نے ڈیرہ جما لیا اور اس سے نجات حاصل کرنے پر بڑی سرگرمی سے غور کیا جانے لگا اور حکومت ایک نسخۂ کیمیا دریافت کرنے میں کامیاب ہو گئی اس نے بساطِ سیاست پر ایسا مہرہ بٹھایا کہ ہاری ہوئی بازی جیت گئی۔

سوامی شردھانند

۱۹۲۲ء کی ستیہ گرہ میں کانگریس کے پلیٹ فارم سے سوامی شردھانند نے حصہ لیا، انگریزی حکومت کے قوانین کے خلاف اظہار نفرت کے طور پر ستیہ گرہ میں شریک ہو کر جیل گئے، وہ ہندوستان کے جذبات کے وکیل بن کر اور نمائندہ کی حیثیت سے جیل گئے مگر دنیا نے حیرت سے دیکھا کہ سوامی جی جیل میں کچھ ہی دنوں رہنے کے بعد جیل کے پھاٹک سے اپنے شوخ گیروے لباس میں خراماں خراماں چلے آ رہے ہیں، سیاسی مجلسوں میں تعجب کا اظہار کیا گیا کہ اب تک کسی لیڈر نے تو کیا کسی معمولی رضا کار نے بھی حکومت سے معافی نہیں مانگی اور نہ وقت سے پہلے کبھی کوئی رہا کیا گیا۔ سوامی جی کی رہائی کس جادو کے ذریعہ ہوئی، لیکن یہ رہائی علاؤالدین کے چراغ کے موکل نے کرائی تھی "کھل جا سم سم" کا منتر سوامی جی کو معلوم ہو گیا، انہوں نے اس منتر کو پڑھا اور جیل کا پھاٹک از خود کھل گیا۔

شدھی اور سنگھٹن

سوامی جی نے جیل سے باہر آتے ہی ہندوؤں کو اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا مشورہ دیا اور بتایا کہ ہندوستان ہندوؤں کا ہے، یہاں کچھ مسلمانوں نے آکر ہمارے بھارت کے لوگوں کو زبردستی مسلمان بنایا، ہر ہندو کو چاہیے کہ تمام مسلمانوں کو شدھی کر کے ان کو پھر سے ہندو دھرم میں واپس لائے اس پوتر کام کو پورا کرنے کے لئے ہندوؤں کو اپنا سنگھٹن بنا لینا چاہیے۔

پھر آپ نے اپنے چیلوں کو کچھ خاص خاص علاقوں میں بھیج کر شدھی کا پرچار شروع کر دیا، ہندوؤں کو ورغلایا اور ہندو مسلم اتحاد کے محل میں وہ آگ بھڑکائی کہ برسہا برس کا جمع کیا ہوا اثاثہ جل کر خاکستر ہو گیا، پورے ہندوستان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک نفرت و عداوت کی آگ دہک

Scanned by CamScanner

اٹھی، انگارے بھڑ کنے لگے اور دونوں فرقوں کے لوگ مشتعل ہو کر آمادۂ پیکار ہو گئے، جو مجاہدین آزادی براہِ راست انگریزی سامراج سے نبرد آزما تھے وہ اپنی ہی فوج میں اپنے ہی آدمیوں کا گلا کاٹنے لگے، حکومت دور کھڑی دیکھتی رہی۔

انقلابات ہیں زمانے کے

تقسیم ملک کا شاخسانہ پیدا کرنے والی تجویز پاکستان کے بارے میں بات کرتے ہوئے انداز گفتگو ہی بدل گیا، کہنے والوں نے جو کہا وہ تو ہواؤں میں اڑ گیا لکھنے والوں نے جو لکھا وہ آپ کے سامنے پیش ہے:

> ''ہندوستان کوئی بت نہیں کہ اس کو پوجا جائے، کعبہ نہیں کہ اس کی سمت منہ کر کے مسلمان نماز پڑھتے ہوں، صحیفۂ آسمانی نہیں ہے کہ جسے بغیر وضو ہاتھ نہ لگایا جا سکے، وہ ایک ملک ہے اور اس لئے ہے کہ اس کے بسنے والے چین و آرام سے رہیں یہ چین یہ آرام اگر وحدت سے حاصل ہوتا تو یقیناً مسلمان اس وحدت کو شکستہ نہ کرتے اگر یہ شکوہ صرف تقسیم ہی سے حاصل ہو سکتا ہے تو ان کا مطالبہ کانگریس اور حکومت سے صرف ایک ہے اور وہ پاکستان ہے، یعنی تقسیم ہند۔ (حیات محمد علی جناح مولفہ رئیس احمد جعفری)

پاکستان کا نعرہ لاہور کی سرزمین سے اٹھا اور چند دنوں میں پورے ہندوستان میں گونج گیا اس کے خلاف جس نے آواز بلند کی اس کا گلا گھونٹ دیا گیا، اس تحریک کے خطرناک عواقب و نتائج کی طرف جس ہاتھ نے اشارہ کیا اُسے کاٹ دیا گیا، جس قلم نے اس کے خلاف لکھنے کی جسارت کی تو وہ قلم ہی نہیں انگلیوں کو بھی تراش لیا گیا جن کی گرفت میں یہ قلم تھا، مدبر علماء و مشائخ نے اس تجویز پر اسلامی ہند کی تباہی کا شکوہ کیا تو ان کی پگڑیوں کو سروں سے اتار کر جوتوں سے روند دیا گیا، نیشنلسٹ رہنماؤں کے گلے میں پرانے جوتوں کے ہار پہنائے گئے، برملا گالیاں دی گئیں، ان کی ڈاڑھیوں میں شراب کی بوتلیں انڈیلی گئیں، ان کی عبائیں نوچ کر تار تار کر دی گئیں، ان کا چلنا پھرنا دو بھر کر دیا گیا، ان کو ہندوؤں کا زر خرید غلام کہا گیا، ان کو ضمیر فروش کا خطاب دیا گیا، مسلم لیگ کا دفتر دارالافتاء بن گیا، اسلام اور مسلمان کی سند تقسیم کرنے لگا، جو پاکستان کا حامی وہ مسلمان صاحب ایمان جو مخالف وہ سب کچھ ہے مگر مسلمان نہیں،

مسلم لیگ کے سارے چھوٹے بڑے لیڈر اسلام کے ٹھیکے دار بن گئے اور ہندوستان کے محترم و معزز علماء و مشائخ کو جو پاکستان کو مسلمانوں کے لئے خطرناک کہتے اور سمجھتے تھے ان کو دین سے خارج کیا گیا، شیخ الہند کو شیخ الہنود، شیخ الاسلام کو شیخ الاصنام کی گالی دی گئی اور ان کے بڑے سے بڑے لیڈر کو شوہوائے کہا گیا اور وہ ساری بدتمیزیاں اور ذلیل حرکتیں کیں اور کرائی گئیں جو ایک اخلاق باختہ شخص اپنے ذاتی دشمن کے ساتھ کر سکتا ہے، اس طرح ہندوستان کا مسلمان دو حصوں میں بٹ گیا ایک بڑا حصہ پاکستان کا حامی، لیگ کے سبز ہلالی پرچم کے نیچے، اور دوسرا پاکستان کا مخالف جو اہلِ تجویز پاکستان کو اسلامی ہند کے مسلمانوں کی اِجتماعی خودکشی سے تعبیر کرتا رہا۔

ہندوستان چھوڑ دو

۸ر اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ہوئی اور اس میں فیصلہ کیا گیا کہ انگریزوں کو الٹی میٹم دے دیا جائے کہ بہت جلد ہندوستان چھوڑ دیں، اس فیصلہ کو ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ''کوئٹ انڈیا'' کی تحریک کہا جاتا ہے ورکنگ کمیٹی کا یہ فیصلہ درحقیقت اعلانِ بغاوت تھا، حکومت نے ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبران کو ۴ بجے شب میں گرفتار کر کے نامعلوم مقام پر بھیج دیا اور ۹ر اگست ۱۹۴۲ء کو پورے ملک میں صوبائی کانگریس کے ارکان، شہر کانگریس کے صدر و سکریٹری اور مسلمانوں میں تمام نیشنلسٹ رہنماؤں اور کارکنوں کو جن کی فہرست پہلے سے تیار تھی اور وارنٹ بنے ہوئے رکھے تھے گرفتار کر لیا گیا اور غیر معین مدت تک کے لئے جیلوں میں بھیج دیا گیا، حکومت کے اس نادرشاہی طرزِ عمل اور مغرورانہ اقدام کی وجہ سے پورا ہندوستان غم و غصہ سے بے قابو ہو گیا اور عوام سروں سے کفن باندھ کر آگ اور خون کی ہولی کھیلنے کے لئے گھروں سے نکل کر سڑکوں پر آ گئے۔

بیک وقت سارے لیڈروں کی گرفتاری کر کے حکومت نے سمجھ لیا کہ حکومت کے خلاف بغاوت کی آگ لگانے والوں کی گرفتاری سے پورے ملک میں مایوسی پھیل جائے گی اور جنگ کے دوران کوئی نیا فتنہ کھڑا نہیں ہوگا، لیکن انگریزوں کی توقعات کے خلاف نتیجہ نکلا، پورے ملک میں تشدد و بغاوت کی لہر دوڑ گئی، بغیر کسی پروگرام اور مشورے کے عوام گھروں سے نکل کر سڑکوں پر آ گئے اور انہوں نے اپنے لیڈروں اور رہنماؤں کی گرفتاری کا انتقام اپنی صواب دید کے مطابق لینا شروع کر دیا۔

۹ر اگست ۱۹۴۲ء کی صبح شورِ محشر اپنے ساتھ لائی مدراس سے لے کر اتر پردیش، بنگال، آسام تک

Scanned by CamScanner

جوشِ انتقام سے بھرے ہوئے عوام کا مجمع جلوس کی شکل میں شاہ راہ عام پر نکلا بجلی کے پولوں کو توڑ کر پھینک دیا، بجلی کے تاروں کو نوچ نوچ کر ایک طرف ڈال دیا، تھانوں، پولیس چوکیوں اور کوتوالیوں پر حملے کر دیئے، پولیس اور تھانے داروں کی اپنی اپنی صواب دید کے مطابق گوشمالی کی، حکومت کی عمارتوں، تھانوں، کوتوالیوں میں جگہ جگہ آگ لگادی، بعض مقامات پر پولیس کو بھی اس آگ میں جھونک دیا، حکومت کے دفتروں، آفسوں، عدالتوں، کچہریوں کے کٹہرے، کرسیاں، میز اور دوسرے فرنیچر چکنا چور کر ڈالے سارے ریکارڈ اور فائلوں کو آگ لگا کر خاکستر کر دیا، ریلوے اسٹیشنوں کو لوٹا توڑا پھوڑا کہیں کہیں عمارت میں آگ لگادی، مال گاڑیوں کی سیلیں توڑ کر مال و اسباب کو لٹوا دیا کوئی بھی انگریز افسر سامنے آنے کی ہمت نہ کر سکا اور جو سامنے آگیا وہ بخیریت واپس نہیں گیا، ریلوے لائن کی پٹریوں کو میلوں مکمل اکھیڑ کر پھینک دیا گیا اور ٹرینوں کی آمد و رفت ہفتوں اور مہینوں بند رہی۔

ہم بھی باغی ہیں

اس طرح ہندوستان کے عوام نے اپنے جذبات کا اظہار کر کے اپنے لیڈران سے بے پناہ تعلق و محبت کا اظہار کیا، بغاوت و انقلاب کے اس طوفان میں ہندوستان کے ہر مذہب و ملت اور ہر قوم و نسل کے لوگ برابر کے شریک رہے، مسلم لیگ نے مسلمانوں کو اس تحریک سے علیحدگی کی مسلسل ہدایتیں دیں لیکن اس وقت ان باتوں پر کوئی کان دھرنے والا نہیں تھا اس لئے کانگریس کے لیڈروں کے ساتھ نیشنلسٹ مسلمان رہنماؤں صوبائی اور ضلع کی سطح پر کام کرنے والے بلکہ قصبوں اور گاؤں سے نیشنلسٹ ورکروں کو بڑی تعداد میں گرفتار کر کے جیل بھیجا جا چکا تھا اس طرز عمل پر مسلمانوں کو بھی اتنا ہی غصہ تھا جتنا دوسرے برادرانِ وطن کو تھا اس لئے کوئی وجہ نہیں تھی کہ اس سے علیحدہ رہتا، اور پھر مسلمان قوم تو جذبات و اشتعال کی سیاست کی عادی رہی اور یہ پروگرام اس کے طبعی تقاضوں کے مطابق تھا اس لئے مسلمانوں نے بھی بڑھ چڑھ کر ان تخریبی کارروائیوں میں بھرپور حصہ لیا۔

ایک ہی نعرہ پاکستان پاکستان

مئی ۱۹۴۴ء میں ڈاکٹری رپورٹ کی بنیاد پر سب سے پہلے گاندھی جی جیل سے رہا کئے گئے وہ

جانتے تھے کہ آزادی اب ہمارے حالات پر منحصر ہے، برطانوی حکومت زیادہ دیر تک ہندوستان کو غلام نہیں رکھ سکتی، اس لئے حصولِ آزادی کی راہ میں جو سب سے بڑی رکاوٹ ہے وہ ہندو مسلم اختلاف ہے اگر ہندو اور مسلمان کے درمیان مفاہمت ہو جاتی ہے تو آزادی ہمارا قدم چومنے کے لئے تیار کھڑی ہے گاندھی جی نے ویول کانفرنس کی کارروائی سے اندازہ لگا لیا تھا کہ مسٹر جناح نے اپنی ضد کے سامنے کسی ایک کی چلنے نہیں دی اور عملاً لیگ کے لئے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت کا زہر سب کے حلق میں اتار دیا، ان حالات میں آزادی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ خود مسٹر جناح کی ذات ہے، اس لئے مسٹر جناح سے مفاہمت کی گفتگو کے لئے انہوں نے پیش قدمی کی، اور گاندھی جی نے مسٹر جناح سے ۱۰ ستمبر ۱۹۴۴ء سے ۲۶ ستمبر تک گفتگو کی، اس ... میں مسٹر جناح نے دو بنیادی مطالبے رکھے جس میں سے ایک تو ۸ اگست ۱۹۴۲ء کا رزولیشن ہے کہ آپ اس رزولیشن کو واپس لیں، دوسری بات یہ کہ کانگریس پاکستان کو تسلیم کرے، صوبہ سرحد، پنجاب، سندھ، بنگال، آسام کو بحالتِ موجودہ مسلم اکثریت کے صوبے تسلیم کرے اور ان کو پاکستانی علاقہ قرار دے اور یہ تسلیم کرے کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہے اور کانگریس ہندوؤں کی نمائندہ ہے، گاندھی جی نے مفاہمت کی دوسری راہوں پر بھی گفتگو کی لیکن پاکستان کے علاوہ اور کوئی دوسری راہ نہیں رہ گئی جس پر غور کیا جائے۔

مسلم لیگ میدانِ عمل میں

مسٹر جناح اور اربابِ لیگ کو معلوم تھا کہ عنقریب حکومت ملک میں الیکشن کرانے کا ارادہ رکھتی ہے اور ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ الیکشن فرقہ وارانہ بنیاد پر ہوگا مسلمان صرف مسلم نمائندوں کو منتخب کریں گے، اس لئے کانگریس کی طاقت تسلیم کرتے ہوئے بھی ان کو کانگریس سے کوئی خوف نہیں تھا، انہوں نے لیگ کی واحد نمائندگی کے دعویٰ کو عمل کی کسوٹی پر کھرا ثابت کرنے کے لئے ایک پلان بنایا، اس کے لئے ان کو صرف مسلمانوں میں کام کرنا تھا، اگر مسلمانوں کی اکثریت لیگ کی ہم نوا الیکشن میں ثابت ہو جاتی ہے تو پھر کوئی طاقت پاکستان کو حاصل کرنے سے نہیں روک سکتی ہے لیکن سب سے خطرناک پہلو یہ تھا کہ صوبہ یوپی ہندوستان کا دل ہے، اور یہاں مسلمان ۱۵ رفیصد ہیں، بہار میں مسلمان صرف ۷ فی صد ہیں، سی پی میں اور بھی کم ہیں، ان حالات میں اقلیتی صوبوں میں رہنے والے مسلمانوں کو پاکستان کا ہم نوا بنانے کا کون سا منتر تلاش کیا جائے کیونکہ پاکستان ان صوبوں سے سیکڑوں میل دور بن رہا ہے جس سے اقلیتی

صوبوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا، بلکہ تقسیم کے ردِ عمل کے طور پر تمام اقلیتی صوبوں کے مسلمان یرغمال بن جائیں گے، ان کی حیثیت جنگی قیدی کی بن جائے گی، لیکن مسلم لیگ کی پروپیگنڈہ مشنری نے ایسا سحر پھونکا کہ لوگ اس پہلو پر سوچ بھی نہیں سکے اور اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں نے اتنا جوش و خروش کا اظہار کیا جتنا ان علاقوں کے مسلمانوں نے نہیں کیا جو متوقع پاکستان کے علاقوں میں رہتے تھے۔

تصویر کا دوسرا رخ

پاکستان کے فضائل و مناقب میں جو کچھ کہا جاتا تھا وہ محل گفتگو نہیں تھا بڑی خوشی کی بات ہوتی اگر وہ اپنے دلوں میں صحیح معنی میں یہ جذبہ رکھتے لیکن نیشنلسٹ مسلمان دیکھ رہے تھے کہ وہ ایک طرف تو اسلامی حکومت قائم کرنے کی بات کر رہے ہیں اور پاکستان میں اسلامی دستور اور قرآنی دستور نافذ کرنے کا یقین دلاتے ہیں دوسری طرف جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں ان کے بارے میں وہی اسلامی جذبہ بدترین کافرانہ جذبہ بن جاتا ہے، اسی سے اندازہ ہوتا تھا کہ لیگ والوں کے سینوں میں مذہب اور اسلام کی کیا قدر و منزلت تھی؟ اور عام اُمتِ مسلمہ کے بارے میں ان کے جذبات کیا تھے؟ ایک طرف وہ پاکستان کی حمایت میں دین و مذہب کے اعلیٰ سے اعلیٰ معیار اور آئیڈیل کی بات کرتے ہیں اور پیغمبرانہ لب و لہجہ میں پاکستان کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے اور دوسری طرف بڑے بڑے مدعیانِ رشد و ہدایت اور پاکستان میں حکومتِ الٰہیہ کی بات کرنے والوں کے نزدیک ہندوستان کے تین کروڑ مسلمانوں کی جان و مال، عزت و آبرو کی قیمت تو دور کی بات ہے، ان کے عقیدہ و ایمان کی بھی ان کے نزدیک کوئی قدر و قیمت اور کوئی، حیثیت نہیں تھی، ایک طرف پاکستان میں خلافتِ راشدہ اور حکومتِ الٰہیہ کی داغ بیل ڈالنے کی بات کرتے تھے اور عوام سے وعدہ کرتے تھے اور دوسری طرف اسلام، ہند کے تین کروڑ مسلمانوں کے بارے میں ان کا نقطۂ نگاہ یہ تھا:

> ''اب یہ بات تقریباً طے ہو چکی ہے کہ ملک تقسیم ہو جائے گا، ایک حصہ مسلم اکثریت کو سپرد کیا جائے گا اور دوسرا حصہ غیر مسلم اکثریت کے زیرِ اثر ہوگا، پہلے حصہ میں ہم کوشش کریں گے کہ رائے عامہ کو ہموار کر کے اس دستور و قانون پر ریاست کی بنیاد رکھیں جسے ہم مسلمان خدائی قانون اور دستور مانتے ہیں، غیر مسلم حضرات وہاں ہماری مخالفت کرنے کے بجائے ہمیں کام کرنے کا موقع دیں اور دیکھیں کہ ایک بے دین قومی جمہوریت کے مقابلہ میں خدا پرستانہ جمہوری خلافت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایت پر قائم ہوگی

> کہاں تک خود باشندگانِ پاکستان کے لئے اور کہاں تک پوری دنیا کے لئے رحمت و برکت ثابت ہوتی ہے؟
>
> دوسرے حصہ میں آپ کی اکثریت ہوگی اور ہماری اقلیت ہوگی وہاں ہم آپ سے عرض کریں گے کہ خدارا دنیا کی بگڑی ہوئی قوموں سے جن کی وجہ سے وہ خود بھی خراب ہو رہی ہیں اور دنیا کو بھی خراب کر رہی ہیں، اور نہ لیجئے رام چندر جی، کرشن جی، مہاراج گرونانک اور دوسرے رشیوں، منیوں کی تعلیم اور سیرتوں کا جائزہ لیجئے، ویدوں پرانوں، شاستروں اور گرنتھوں کو دیکھئے اگر ان میں کوئی ہدایت آپ کو ملے تو ہم کہیں گے کہ آپ ہندوستان کی ریاست کا نظام اسی پر قائم کیجئے اور ہم سے وہی برتاؤ کیجئے جو آپ کا دین ہمارے لئے تجویز کرتا ہے اور ہم اس نظام کی مزاحمت نہیں کریں گے اسے کام کرنے کا موقعہ دیں گے۔

(ابوالاعلیٰ مودودی "جماعتِ اسلامی اور اس کی دعوت طبع ششم ص ۲۹-۳۰)

یہ تھا تحریک پاکستان کا پیشِ منظر و پس منظر، آٹھ کروڑ کے لئے قرآنی حکومت اور تین کروڑ کے لئے ہندوراج کا مشورہ گویا یہ تین کروڑ مسلمان مسلم لیگ کے غلام تھے جن کو ہندوستان کے ہندوؤں کے ہاتھوں آپ کو فروخت کرنے کا اختیار حاصل تھا، برملا کہہ دیا کہ مسلمانوں کے ساتھ آپ وہ برتاؤ کریں جو آپ کا مذہب ان کے بارے میں تجویز کرتا ہے یعنی ان کو شدھی کر کے ان کے آباؤ اجداد کے ہندو دھرم پر قائم کر دیں اور ستم یہ کہ یہی تین کروڑ مسلمان جن کا سودا کیا جا رہا ہے سب سے زیادہ بلند آواز میں پاکستان زندہ باد کے نعرے لگا رہے ہیں، ۔

طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا!\
اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا

بحری بغاوت

آزاد ہند فوج کے افسران پر چلنے والے مقدمات پر پورے ملک کی نگاہیں لگی ہوئی تھیں اور آزادی کی تڑپ رکھنے والے ہر دل میں ان سے ہمدردی اور محبت تھی اور بڑی بے چینی سے ان مقدمات کے فیصلہ کا انتظار کیا جا رہا تھا، مجاہدینِ آزادی پر انگریزی عدالتوں کے ان مقدمات پر غم و غصہ کی فضا مختلف حلقوں میں پیدا ہوتی جا رہی تھی، جنرل شاہ نواز کے دل میں جو جذبہ کارفرما تھا وہ جذبہ اب پورے ملک

میں عام ہو چکا تھا اور اس کا اکثر مشاہدہ بھی ہوتا تھا، بمبئی میں، بحری بیڑے کی بغاوت اسی جذبۂ آزادی سے سرشاری کے نتیجہ میں تھی، ان چلنے والے مقدمات کا ذکر انگریزوں کی ہندوستانی فوج میں بھی تھا، ان میں بھی غم وغصہ کے جذبات بڑھتے جا رہے تھے، اتفاق سے بمبئی بحری بیڑے کو ایک بہانہ ہاتھ آ گیا۔

بمبئی کے بحری بیڑے میں انگریز افسران کے توہین آمیز رویہ کے خلاف بھوک ہڑتال شروع ہو گئی، یہی بھوک ہڑتال بعد میں بغاوت کی شکل اختیار کر گئی، بغاوت کا ایک لیڈر کرنل ایم اے خان ایک فوجی افسر تھا اس نے پورے ملک سے اپیل کی کہ ہماری مدد کی جائے۔

بمبئی کے بحری بیڑے کی بغاوت کی خبر جب کراچی کے بحری بیڑے میں پہنچی تو وہاں بھی یک بیک بغاوت پھوٹ پڑی ایک مسلمان نوجوان طالب علم انور حسین لاہوری جہاز کے ڈیک پر ہاتھ میں کمیونسٹ پارٹی کا سرخ جھنڈا لئے ہوئے چڑھ گیا اور پوری طاقت سے انقلاب زندہ باد کا نعرہ بلند کیا، انگر[illegible]ے کے وفادار سپاہیوں میں سے کسی سپاہی نے انور حسین کو وہیں گولی مار دی اور اس حال میں وہ نوجوان آزادیٔ وطن کے لئے شہید ہو گیا کہ پوری طاقت سے سرخ جھنڈا جو انقلاب اور آزادیٔ وطن کی علامت تھا ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھا۔

کرنل ایم اے خان کی پکار رائے گاں نہیں گئی پورے ملک نے انتہائی جوش وخروش کے ساتھ اس کی آواز پر لبیک کہا، مختلف شہروں میں بالخصوص عروس البلاد بمبئی میں شہریوں نے بحری بیڑے کی حمایت میں ایک عظیم الشان جلوس نکالا، جلوس غم وغصہ سے بھرا ہوا تھا وہ تخریبی کارروائیوں پر اتر آیا، انگریزوں نے بحری بیڑے اور شہریوں کی دوطرفہ بغاوت کے فرو کرنے کے لئے اندھا دھند گولیاں برسانی شروع کیں جس کی وجہ سے بڑی تعداد میں آزادی کے پروانوں نے شمع آزادی پر اپنی جانیں قربان کیں۔

مرنے والوں میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی، فرقہ وارانہ منافرت ملک میں جو بڑے پیمانے پر پھیلائی گئی تھی اس نے یہاں آ کر دم توڑ دیا، ہندو مسلمانوں کی لاشیں اٹھا رہے تھے اور مسلمان ہندوؤں کی لاشوں کو لے جا رہے تھے۔

حکومت نے طاقت کے ذریعہ اس بغاوت کو فرو کرنا چاہا مگر وہ کامیاب نہ ہو سکی، کیونکہ آزادی کا نشہ اتنا چڑھ چکا تھا کہ جان کی قربانی اب بہت بڑا مسئلہ نہیں تھی، چونکہ ہائی کمان برطانوی اقتدار سے اختیارات کی جنگ میں نازک ترین دور سے گزر رہا تھا اس لئے مولانا ابوالکلام آزاد صدر کانگریس اور سردار پٹیل نے فوجیوں اور شہریوں سے اپیل کی کہ فی الحال وہ اپنی تحریک بند کر دیں، ملک ایک نازک مرحلہ سے گذر رہا ہے اور ہم پوری سنجیدگی سے مسئلہ کو حل کرنے میں لگے ہوئے ہیں ہم آپ کے جذبات کی قدر وعزت کرتے ہیں اور احترام کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

چند جملوں کی اس اپیل میں وہ جادو تھا کہ بغاوت اٹھے ہوئے جھاگ کی طرح یک بیک بیٹھ گئی اور ختم ہو گئی، فضا میں امن وسکون کا خوش گوار سناٹا چھا گیا جیسے ابھی ابھی کوئی حادثہ ہوا ہی نہیں ہے، کانگریس عوام میں کتنی مقبول ہے؟ اس کے صدر کی آواز میں کتنی طاقت اور کتنی توانائیاں چھپی ہوئی ہیں؟ انگریزی حکومت کھلی ہوئی آنکھوں سے ان حقائق کو دیکھ رہی تھی، یہ منظر دیکھ کر کہ عوام ان کے اشاروں پر گردنیں بھی کٹوا سکتے ہیں اور غصہ میں بھرے ہوئے ننگی تلوار کا وار کرنا چاہتے ہیں تو روک دیئے پر اٹھا ہوا ہاتھ وہیں رک جاتا ہے، یہ الفاظ کی جادوگری، لب ولہجہ کی شعبدہ بازی نہیں، عملی جدوجہد اور مسلسل قربانیوں کی جادوگری تھی، یہ منظر دیکھ کر انگریز حکومت کو ہندوستان میں اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا، ان کی امنگیں مایوسیوں کے گھنے اندھیرے میں ڈوب گئیں۔

جرأتِ رِندانہ کا ایک اور منظر

جنگِ عظیم کی فتح پر اظہار مسرت اور ہندوستانیوں کے سامنے اپنی طاقت اور شوکت وعظمت کے مظاہرہ کے لئے دہلی میں انگریزی حکومت نے "جشنِ فتح" منایا، دس ہزار مسلح فوجیوں نے اس جشن میں حصہ لیا لیکن ہندوستانیوں میں آزادی کا جذبہ کتنا شدید ہو چکا تھا؟ اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ اتنی بڑی فوج اسلحہ سے لیس جلوس میں فوجی انداز سے مارچ کر رہی ہے، یہ منظر ایک مرعوب کن منظر تھا مگر مجاہدین آزادی نے مرعوبیت کبھی جانی نہیں، طاقت کے مظاہرہ سے ان میں کبھی پست ہمتی آئی نہیں، خوف زدہ ہونا کبھی سیکھا نہیں، آزادی کے چند دیوانوں نے عین جلوس کے وقت ٹاؤن ہال میں آگ لگا دی، جہاں جلسۂ تہنیت کے لئے پنڈال سجایا گیا تھا، اب وہاں سوائے آگ اور دھواں کے کچھ نہیں تھا، جلسہ گاہ، پنڈال، اسٹیج کے ساتھ پوری عمارت جل کر خاکستر ہو گئی، پولیس نے بے تحاشا مجمع پر گولیاں جھونک دیں، جس کے نتیجہ میں موقع پر ایک درجن کے قریب شمع آزادی کے پروانوں کی لاشیں خاک پر پڑی ہوئی تھیں۔

تدبیر پر تقدیر غالب ہو گئی

نوے سالوں کی آزادی کی جدوجہد، بے انتہا قربانیوں اور لامحدود جاں نثاریوں کے باوجود

Scanned by CamScanner

ہندوستان کا مسلمان بدقسمت نکلا، آزادی کی منزل قریب آتے ہی پانسہ پلٹ گیا مخلص مجاہدین آزادی کے ہاتھوں سے عنانِ قیادت نکل کر غلط قیادت کے ہاتھوں میں چلی گئی اور ملک تقسیم کا شکار ہو گیا اور اس تقسیم کے سارے مصائب بھی اُسے جھیلنے پڑے، ہم نے خود اپنے ہاتھوں اپنی تباہیوں کو دعوت دی، کروڑوں افراد خانماں برباد ہوئے، ہزاروں ہزار مسلمانوں کی بوٹیاں کاٹ کر پھینک دی گئیں بے شمار عفت مآب پردہ نشین خواتین اغوا کی گئیں، ان کا دامن عصمت تار تار ہوا اور پوری زندگی غیر مسلم بن کر زندگی گزاری، لاکھوں افراد کے آباؤ اجداد کی ڈیوڑھیاں چھٹ گئیں اور وطن سے بے وطن ہوئے اور مطلوبہ پاکستان میں جا کر بھی مہاجر کہلائے اور وہ محبت و سکون، وہ اپنائیت نصیب نہ ہو سکی جو ہر شخص کو اپنے وطن میں ملتی ہے۔

تقسیم کا حشر، پاکستان، بنگلہ دیش، بہاری مسلمان، ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمان ہر ایک کو پیش نظر کر کے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ کسی قوم کی سیاسی زندگی میں ایک قدم بھی غلط اٹھ جاتا ہے تو پوری قوم کو کتنا عذاب بھگتنا پڑتا ہے، شاید پاکستان کا نعرہ لگانے والے مخلص رہنما زندہ ہوتے تو انہیں یہی کہنا پڑتا کہ پاکستان کا مطالبہ ایک زبردست سیاسی غلطی تھی مگر اب اس ذکر سے کیا حاصل؟

تقسیمِ ملک کے لئے راہ ہموار ہو رہی ہے

اب ہم سیاسی جدوجہد کے جن لمحات کا ذکر کر رہے ہیں، یہی وہ لمحے ہیں جب مسلمانوں کے مستقبل کا فیصلہ ہونے والا ہے، لندن میں صلاح و مشورہ چل رہا تھا، عبوری حکومت کے دوران اور اس سے قبل ہولناک قسم کے ہندوستان گیر ہندو مسلم فسادات کا جو لامتناہی سلسلہ چلا اس نے مدبرینِ برطانیہ کو تقسیم ہند کے مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنے پر مجبور کیا اور ہمارا نوشتۂ تقدیر مشاہدہ کی آنکھوں کے سامنے آگیا، لندن سے ہماری قسمت کا فیصلہ آیا جس میں کہا گیا کہ:۔

"بڑی بڑی سیاسی جماعتوں نے بار بار اپنی خواہش پر زور دیا ہے کہ ہندوستان میں اختیارات جلد سے جلد منتقل کر دیئے جائیں، ملک معظم کی حکومت کو ان کی اس خواہش سے پوری پوری ہمدردی ہے اور وہ جون ۱۹۴۸ء کی تاریخ کو قریب تر لانے پر بھی راضی ہیں تا کہ ہندوستان میں حکومت یا حکومتیں قائم کر کے انہیں کسی قریبی تاریخ پر اختیارات سونپ دیئے جائیں،

ملک معظم کی حکومت کا ارادہ ہے کہ پارلیمنٹ کے موجودہ اجلاس میں ایک مسودۂ قانون پیش کیا جائے تا کہ اس اعلان کے نتیجہ میں جو فیصلے ہوں اقتدار کو درجۂ نو آبادیات کی بنا پر ایک یا دو (۲) جانشین حکومتوں کو اس سال منتقل کر دیا جائے۔"

اس کے بعد ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے آل انڈیا ریڈیو سے تقریر کرتے ہوئے یہ بیان کیا کہ:۔

"یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ اتنے بڑے رقبوں کو جن کی اکثریت ایک فرقہ کی ہے ان کی مرضی کے خلاف ایسی حکومت کے تحت رہنے پر مجبور کیا جائے جس میں دوسرے فرقہ کو اکثریت حاصل ہے جبر کا متبادل تقسیم ہے اور صرف تقسیم ملک۔"

تقسیم کا فیصلہ

۳ رجون ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن وائسرائے ہند نے ملک کی تقسیم کا اعلان کیا اور اس کو تسلیم کر لیا، اس کی تائید مسٹر جناح، پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار بلدیو سنگھ نے کی ۱۴ رجون ۱۹۴۷ء کو کانسٹی ٹیوشن ہاؤس نئی دہلی میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا اور مسٹر ولبھ پنت وزیر اعلیٰ اتر پردیش نے کمیٹی کے سامنے تقسیمِ ہند کی تجویز پیش کی اور کانگریس کی اصول شکنی پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

کانگریس نے ہمیشہ متحدہ قومیت کا نعرہ لگایا اور متحدہ ہندوستان کی آزادی کی علم بردار رہی لیکن اسی کانگریس کی ورکنگ کمیٹی میں تقسیم ہند کی تجویز پیش ہوتی ہے اس سے اس کا پچاس سالہ تاریخی کردار ملیا میٹ ہو گیا، کانگریس انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے میں ضرور کامیاب ہو گئی لیکن اگر بااصول جماعت کی کامیابی کا دارومدار اس کے اصولوں کی کامیابی پر رکھا جائے تو یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ کانگریس ناکام ہو گئی اور مسلم لیگ کے مقابلے میں شکست کھا گئی اگر وہ اپنے اصولوں پر مضبوطی سے جمی رہتی تو ممکن تھا کہ غلامی کی مدت کچھ اور دراز ہو جاتی اور آزادی کی منزل تک پہنچنے میں مزید کچھ اور مصائب جھیلنے پڑتے لیکن آزادی ہندوستان کو مل کر رہتی اور اپنے اصولوں کے مطابق ملتی، پنڈت ولبھ پنت نے جب تجویز پیش کی تو اس کی تائید میں مولانا ابوالکلام آزاد نے جو بات کہی وہ اعتراف شکست

Scanned by CamScanner

کے سوا اور کچھ نہیں ، آپ نے فرمایا کہ:

"حالات نے ہر دماغ کو مجبور کر دیا ہے کہ جو حل بھی موجودہ الجھاؤ کو ختم کر سکتا ہو اس کو تسلیم کرے۔ کانگریس کے سامنے یہ سوال نہیں تھا کہ کون سا منصوبہ منظور کیا جائے، بلکہ سوال یہ تھا کہ کو مگو اور غیر اطمینانی کی موجودہ تباہ کن حالت باقی رہے یا سب سے پہلی فرصت میں اس کو ختم کر دیا جائے، کانگریس متحدہ ہندوستان کے نظریہ سے جدا نہیں ہوئی لیکن وہ حق خود ارادیت کو بھی تسلیم کر چکی ہے جو علاقے یونین میں شامل نہ ہونا چاہیں انہیں مجبور کرنے کے خلاف ہے۔"

تجویز منظور کر لی گئی

ورکنگ کمیٹی میں کسی ممبر نے اس تجویز کی مخالفت میں ایک لفظ بھی نہیں کہا البتہ ایک کمزور مگر عزم و یقین کی بھرپور قوت کے ساتھ آواز ابھری جو نیشنلسٹ مسلمانوں کے قابل احترام مجاہد کی تھی جس کو قوم احترام کی وجہ سے مجاہد ملت کہتی تھی وہ تھے مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی انہوں نے اس تجویز کی مخالفت میں ایک مختصر مگر انتہائی گرم تقریر کی آپ نے فرمایا کہ۔

"حالات کے جس دباؤ اور جن الجھنوں کے باعث آج ہندوستان کی تقسیم کو منظور کر لینے کا مشورہ دیا جا رہا ہے، میں اپنے لیڈروں کے پورے احترام کے ساتھ کہوں گا کہ ہندوستان کی تقسیم کا نتیجہ اس سے کہیں زیادہ خطرناک ہوگا اور آج اگر کانگریس کے اسٹیج پر تقسیم ہند کی اسکیم منظور کر لی گئی تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم آج اپنی پوری تاریخ اور ہمیشہ کے لئے اپنے یقین واذعان پر خود اپنے ہاتھ سے خط تنسیخ کھینچ کر اٹھیں گے اور دو قومی نظریہ کے سامنے سرینڈر ہو جائیں گے۔"

جب پورا ہاؤس ایک تجویز پر متفق ہو چکا ہو، پھر اس کو رد کرا دینا ممکن نہ تھا اس لئے مولانا حفظ الرحمان کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی، مخالفت کی اور کوئی دوسری آواز ہاؤس میں نہیں اٹھی، چھ سو (۶۰۰) ارکان ورکنگ کمیٹی میں کسی کو بھی اپنے اصولوں کی شکست کی آواز نہیں سنائی دی، اتنی بڑی تعداد

کے مقابلہ میں ایک آواز کیا وزن رکھتی ہے لیکن اس ایک آواز نے اصول پرستی کی آبرو رکھ لی اور انہوں نے کھری سچائی اس ماحول میں بھی پیش کر دی جس کی تائید میں ایک آواز بھی نہیں تھی اس لئے ان کی جماعت جمعیۃ علماء کو یہ اطمینان ضرور ہے کہ وہ اس تباہ کن اور خون ریز تقسیم کی ہر طرح کی ذمہ داری سے محفوظ رہی۔

ہندوستان نے آزادی جیت لی

۱۸ رجولائی ۱۹۴۷ء کو لندن سے ایک نامہ نگار نے ہندوستان خبر بھیجی کہ آج برطانیہ کے حساب سے ٹھیک دس بج کر چالیس منٹ پر برطانوی دارالامراء کے رائل کمیشن نے تزک واحتشام اور شاہی رسوم کے ساتھ جس پر ولیم فاتح کے زمانے سے عمل درآمد ہوتا آرہا ہے ہندوستان کی آزادی پر شاہی منظوری کا اعلان کیا۔

اس سے پہلے ۱۰ رجولائی ۱۹۴۷ء کو وزیر اعظم برطانیہ مسٹر اٹیلی نے اعلان کیا تھا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کے گورنر جنرل ہوں گے اور مسٹر جناح پاکستان کے، اس طرح ہندوستان اور پاکستان دو عظیم الشان نو آبادیاں وجود میں آگئیں۔

کارواں اپنی منزل پر پہنچ گیا

نوے سال کی طویل مسافت طے کرتے ہوئے کاروانِ آزادی ۱۵ ر اگست ۱۹۴۷ء کو ۱۴۔۱۵ ر اگست کی درمیانی رات کے بارہ بجے اپنی منزل پر پہنچ گیا، جب پورا ہندوستان محوِ خواب تھا تو ہندوستان کا مقدر جاگ گیا اور ہندوستانی وقت کے مطابق ٹھیک بارہ بجے آل انڈیا ریڈیو سے ہندوستان کی آزادی کا اعلان ہو گیا۔

پارلیمنٹ میں صدائے حق کی بازگشت

پارلیمنٹ میں پروفیسر بی۔ این۔ پانڈے کی ایک تقریر:[۱]

"یہاں پر ہندوستان کے راجیہ سبھا کی اس تقریر کا خلاصہ بھی پیش کرتے ہیں جو پروفیسر بی۔ این پانڈے نے ۲۹ رجولائی ۱۹۷۷ء میں کی تھی، وہاں یہ مسئلہ درپیش تھا کہ ہندوستان کے ازمنۂ وسطیٰ کی

---

۱ یہ مضمون ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی رواداری جلد سوم ص ۳۲۶ سے لیا گیا ہے

Scanned by CamScanner

تاریخ کا نصاب کیسا ہو کہ جس سے ثقافتی اور جذباتی ہم آہنگی پیدا ہو، اس سلسلہ میں انہوں نے بڑی لمبی تقریر کی جس کا کچھ حصہ ہدیۂ ناظرین ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں گذشتہ کئی نسلوں سے جو کتابیں پڑھائی جارہی ہیں وہ وہی ہیں جو یورپی مصنفوں کی لکھی ہوئی ہیں اور یورپین اساتذہ نے جو کچھ پڑھایا ہے، اس کے اثرات کو ہندوستانی اب تک دور نہیں کر سکے ہیں، ایسی لکھی ہوئی تاریخوں سے جو تأثرات پیدا ہوتے ہیں وہ ہماری قومی زندگی کے سرچشمہ کو آلودہ کئے ہوئے ہیں، ان کتابوں میں ایسے اختلافات پر زور دیا گیا ہے کہ ہندو، مسلمان کس طرح ایک دوسرے کے خلاف تشدد آمیز رویہ اختیار کئے ہوئے تھے، وہ ایک دوسرے کے علاقے کو فتح کر کے لوٹ مار کرتے اور مذہبی تعصب دکھاتے، ان تاریخوں میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے کلچر اور روایات کے تہس نہس کرنے میں مشغول رہے ان کے مندروں اور محلوں کا انہدام کیا گیا، ان کی مورتیاں توڑیں اور ان کے سامنے یہ خوفناک شرط پیش کرتے رہے کہ اسلام قبول کرو ورنہ تلوار استعمال کی جائے گی، پھر یہ چیزیں زندگی کے اس زمانے میں پڑھائی جاتی ہیں جب ذہن پر کسی چیز کا اثر پڑ جاتا ہے تو پھر اس کا دور ہونا مشکل ہوتا ہے، اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے کو شک وشبہ کی نظروں سے دیکھنے کے عادی ہو گئے اور ان میں باہمی بداعتمادی پیدا ہو گئی، ہندو یہ یقین کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومتیں محض ہوا تھیں، وہ مسلمانوں کی تاریخ پر کوئی فخر محسوس نہیں کرتے، بلکہ اس کو نظر انداز کر کے اپنی قدیم تاریخ سے سب کچھ سیکھنا چاہتے ہیں، پھر اس کو زرّیں دور سمجھ کر اس کی مدح سرائی کرنے لگتے ہیں، اس کے ساتھ برطانوی حکومت کے دستاویزات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انگریزوں نے **پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو**، اس پر کس کس طرح سے عمل کیا، لارڈ الگن کے زمانے میں سیکریٹری آف اسٹیٹ روڈ نے اس کو ایک خط مورخہ ۳ رمارچ ۱۸۶۲ء میں لکھا کہ ہم لوگوں نے ہندوستان میں اب تک اپنا اقتدار اس طرح قائم کر رکھا ہے کہ ہم ایک دوسرے کو مخالف بناتے رہیں ہیں اور اس عمل کو جاری رکھنا چاہئے، اس لئے جہاں تک ممکن ہے اس کی پوری کوشش کرتے رہنا چاہئے کہ یہاں کے لوگوں میں مشترک جذبات پیدا نہ ہونے پائیں۔

۹ رمئی ۱۸۶۲ء میں اسی ڈوڈ نے لارڈ الگن کو پھر لکھا کہ ہمارے خلاف جو مخالفت ہو اس کو مضبوط بننے نہ دیا جائے اور اس کو یقین جانیں کہ وہاں کے لوگوں میں جو ایک دوسرے سے دشمنی ہوگی وہ ہمارے لئے قابل اعتنا قوت ہوگی، اگر پورا ہندوستان ہمارے خلاف متحد ہو جائے تو ہم وہاں کیسے باقی رہ سکتے ہیں۔

اسی طرح ایک خاص پالیسی کے ماتحت ہندوستان کی تاریخ سے متعلق نصاب کی کتابیں تیار کی گئی اور واقعات توڑ مروڑ اور جھٹلا کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی کہ ہندوستان کے عہد وسطی میں مسلمان حکمرانوں نے ہندوؤں پر بڑے مظالم کئے ہیں، ان کو اسلامی حکومت میں طرح طرح کی اذیتیں برداشت کرنی پڑیں اور ان دونوں فرقوں کی معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی زندگی میں کسی قسم کی مشترکہ قدریں نہ تھیں۔

پروفیسر بی۔ این پانڈے نے بہت سی باتیں بیان کر کے کہا کہ جب میں ۱۹۲۸ء میں الہ آباد میں ٹیپو سلطان پر ریسرچ کر رہا تھا تو وہاں کے اسکولوں کے کچھ طلبہ نے میرے پاس آکر اپنی ہسٹری ایسوسی ایشن کے افتتاح کی دعوت دی، وہ اسکول سے سیدھے میرے پاس آئے تھے، ان کے ساتھ ان کے نصاب کی کتابیں تھیں، میں نے اتفاقاً ان کی تاریخ کی ایک کتاب پر نظر ڈالنی شروع کی، اس میں ٹیپو سلطان پر ایک باب تھا، اس کو پڑھنا شروع کیا تو اس کے بعض جملوں کو پڑھ کر کھٹک پیدا ہوئی، اس میں لکھا ہوا تھا کہ تین ہزار برہمنوں نے محض اس لئے خودکشی کر لی کہ ٹیپو ان کو زبردستی اسلام کے دائرہ میں لانا چاہتا تھا، اس کتاب کو ترتیب دینے والے مہامہوپادھیا ڈاکٹر پرشاد شاستری صدر شعبۂ سنسکرت کلکتہ یونیورسٹی تھے، میں نے فوراً ڈاکٹر شاستری سے اس بیان کی سند کا حوالہ دریافت کیا، ان کو کئی خطوط لکھے تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ میسور گزیٹر سے لیا گیا ہے، یہ گزیٹر مجھ کو نہ الہ آباد اور نہ امپیریل لائبریری کلکتہ سے ملا، اس وقت میسور یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر برجندر ناتھ سیل تھے میں نے ایک خط کے ذریعہ ان سے اس واقعہ کی تصدیق چاہی، انہوں نے میرے خط کو پروفیسر کا[illegible] کے پاس بھیج دیا، اس وقت وہ میسور گزیٹر کا نیا ایڈیشن مرتب کر رہے تھے، انہوں نے مجھ کو لکھ بھیجا کہ میسور گزیٹر میں کوئی ایسا واقعہ درج نہیں، پھر یہ بھی لکھا ہے کہ جو میسور کی تاریخ سے اچھی طرح واقف ہیں وہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ میسور کا کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا، یہ بھی لکھا ہے کہ ٹیپو سلطان کا وزیر اعظم ایک برہمن پورنیا تھا اور اس کا فوجی سپہ سالار بھی کرشنا راؤ نامی برہمن تھا، پھر انہوں نے میسور کے ایک سو چھپن (۱۵۶) مندروں کی بھی فہرست بھیجی جن کو ٹیپو سالانہ امداد دیا کرتا تھا، ٹیپو کے بڑے خوشگوار تعلقات میسور کے سری نگری مٹھ کے جگت گرو شنکراچاریہ سے تھے، ٹیپو نے ان کو جو خطوط لکھے تھے ان میں سے ۳۰ کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں منسلک کر دی تھیں، میسور کے فرماں رواؤں کا معمول تھا کہ سرنگاپٹنم کے اندر جو رنگاناتھ مندر ہے وہاں وہ جایا کرتے تھے، ٹیپو سلطان بھی اپنے صبح کے ناشتہ سے پہلے روزانہ جایا کرتا تھا، پروفیسر کا[illegible] نے یہ بھی لکھا ہے کہ ڈاکٹر شاستری نے یہ واقعہ شاید کرنل مائلس کی ہسٹری آف میسور سے لیا ہو، جنہوں نے فارسی کی ایک مخطوطہ تاریخ ٹیپو سلطان کا ترجمہ کیا ہے، یہ مخطوطہ ملکہ وکٹوریہ کی ذاتی لائبریری میں ہے، میں نے دریافت کیا تو پتہ چلا کہ ایسا کوئی مخطوطہ ملکہ وکٹوریہ کے کتب خانہ میں نہیں ہے، کرنل مائلس کی تاریخ میں سارے واقعات من گھڑت اور جھوٹے ہیں، ڈاکٹر شاشتری کی کتاب بنگال، آسام، بہار، اڑیسہ

Scanned by CamScanner

یوپی، ایم۔ پی اور راجستھان کے اسکولوں کے نصاب میں داخل تھی، میں نے کلکتہ یونیورسٹی کے اس وقت کے وائس چانسلر سر آشوتوس مکرجی سے خط و کتابت کی اور سارے واقعات لکھ بھیجے تو انہوں نے اس کتاب کو نصاب سے نکلوا دیا، لیکن مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ یوپی کے جونیر اسکولوں کے نصاب کی کتاب میں ۱۹۷۶ء میں یہ پھر دھرایا گیا۔

اسی طرح جب میں الٰہ آباد میونسپلٹی کا چیرمین تھا تو ایک داخل خارج کا مقدمہ میرے سامنے پیش کیا گیا جو سومیشور ناتھ مہادیو مندر کی جاگیر کے جھگڑے کے سلسلہ کا تھا، اس کے مہنت کی موت کے بعد اس جاگیر کے دو دعوے دار ہو گئے، ایک نے ایک ایسی دستاویز پیش کی جو اس کے خاندان میں محفوظ چلی آ رہی تھی، یہ اورنگ زیب کا جاری کردہ فرمان تھا، جس کی رو سے مندر کو ایک جاگیر اور کچھ نقدی عطا کی گئی تھی، اس کو دیکھ کر میں سراسیمہ ہوا، خیال آیا کہ یہ فرمان جعلی ہے، کیونکہ اورنگ زیب تو برابر مندر منہدم کراتا رہا، وہ یہ لکھ کر کیسے فرمان جاری کر سکتا تھا کہ یہ جاگیر مندر کے دیوتا کی پوجا اور بھوگ کیلئے ہے، وہ اس بت پرستی میں اپنے کو کیسے شریک کر سکتا تھا، مگر کسی آخری نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے میں سر تیج بہادر سپرو کے پاس ان سے مشورہ لینے کے لئے چلا گیا، وہ فارسی اور عربی اچھی طرح جانتے تھے، میں نے یہ فرمان ان کے سامنے رکھ دیا، جس کا مطالعہ کر کے انہوں نے فرمایا کہ یہ اصلی ہے، جعلی نہیں ہے، اس کے بعد انہوں نے اپنے منشی سے جنگم باڑی شیو مندر کے اس مقدمہ کا فائل طلب کیا، جو الٰہ آباد ہائی کورٹ میں گزشتہ پندرہ سال سے چل رہا تھا، جنگم باڑی شیو کے مندر کے مہنت کے پاس بھی اورنگ زیب کے ایسے مختلف فرامین تھے، جن سے پتہ چلتا تھا کہ اس مندر کے لئے جاگیر دی گئی، ان کو دیکھ کر اورنگ زیب کی ایک نئی تصویر میرے سامنے آئی اور میں بالکل متحیر تھا، ڈاکٹر سپرو کے مشورے کے مطابق میں نے ہندوستان کے مختلف اہم مندروں کے مہنتوں کو خطوط لکھے کہ اورنگ زیب نے ان مندروں کو کچھ جاگیر دی ہے تو اس کے فرامین کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں ان کے پاس بھیج دی جائیں۔ میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب مہاکلیشور، اجین، بالاجی مندر چترکوٹ اور ماتند گوہاٹی شرن وجے کے جین مندروں اور اسی طرح شمالی ہند کے دوسرے مندروں کی طرف سے مجھ کو ایسے فرامین کی نقلیں ملیں جو ۱۰۶۵ھ یعنی ۱۶۵۹ء سے لے کر ۱۰۹۱ھ یعنی ۱۶۸۵ء کے درمیان جاری کئے گئے تھے۔

ہندوؤں کے ساتھ اورنگ زیب کا جو فیاضانہ سلوک رہا، اس کی محض یہ تھوڑی سی مثالیں ہیں، ان سے ظاہر ہوگا کہ اورنگ زیب کے متعلق مؤرخین نے جو کچھ لکھا ہے اس میں کسی قدر تعجب ہے اور یہ محض ایک رخ کی تصویر ہے، ہندوستان بہت وسیع ملک ہے، یہاں ہزاروں مندر ہیں، اگر پورے طور پر تلاش و تحقیق کی جائے تو مجھ کو یقین ہے کہ اور بھی بہت سی مثالیں ملیں گی اور پھر اندازہ ہوگا کہ غیر مسلموں کے

ساتھ اورنگ زیب کا سلوک کریمانہ رہا۔

اورنگ زیب نے بلاشک وشبہ وارانسی کے وشوناتھ مندر اور گولکنڈہ کی جامع مسجد کو مسمار کیا، لیکن اس مندر اور مسجد کے منہدم کرنے کے اسباب معلوم ہوں گے تو پھر اصل صورت حال کی نوعیت ظاہر ہوگی، وشوناتھ مندر کے برباد کرنے کا قصہ یہ ہے کہ اورنگ زیب بنگال جا رہا تھا تو وارانسی کے پاس سے بھی گزرا، اس کے جلوس میں ہندو راجہ بھی تھے، انہوں نے اورنگ زیب سے درخواست کی کہ سفر میں ایک روز قیام کیا جائے، تاکہ ان کی رانیاں وارانسی جا کر گنگا میں اشنان اور وشوناتھ جی کی پوجا کر سکیں، اورنگ زیب اس کے لئے فوراً راضی ہو گیا، وارانسی پانچ میل دور تھا، فوج متعین کر دی گئی، رانیاں پالکیوں سے روانہ ہوئیں، انہوں نے گنگا میں اشنان کیا اور وشوناتھ مندر میں پوجا کے لئے گئیں، اور رانیاں واپس آئیں، مگر کچھ کی مہارانی لاپتہ تھی، ہر طرف اس کی تلاش ہوئی، کہیں پتہ نہ چلا، اورنگ زیب کو اس گمشدگی کی اطلاع ہوئی تو بہت برہم ہوا، اس نے رانی کی تلاش میں اپنے اونچے عہدے دار کو بھیجا، انہوں نے دیکھا کہ گنیش جی کی مورتی دیوار میں نصب ہے، لیکن اس میں حرکت ہوتی رہتی ہے، یہ مورتی اپنی جگہ سے ہٹائی گئی تو اس کے نیچے زینے تھے جو ایک تہ خانہ میں جاتے تھے، لوگوں کے تعجب کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے اس رانی کو تہہ خانہ میں پایا، اس کی عصمت ریزی ہو گئی تھی اور وہ رو رہی تھی، یہ تہ خانہ وشوناتھ مورتی کے ٹھیک نیچے تھا، ہندو راجاؤں نے سخت احتجاج کیا اور انہوں نے فریاد کی ان کے ساتھ انصاف کیا جائے، بڑا اہم مسئلہ تھا، اورنگ زیب نے حکم دیا کہ یہ پوترا حاطہ ناپاک کر دیا گیا ہے، وشوناتھ کی مورتی تو کہیں اور منتقل کر دی جائے لیکن مندر مسمار کر دیا جائے اور مہنت کو گرفتار کر کے سزا دی جائے۔

ڈاکٹر بنابی سیتا رامیہ نے اپنی مشہور کتاب "دی فیدرس اینڈ اسٹونس" میں اسی واقعہ کو پوری سند کے ساتھ لکھا ہے اور ڈاکٹر بی۔ ایل گپتا نے بھی جو پٹنہ میوزیم کے سابق کیوریٹر تھے اس کو دہرایا ہے۔

گولکنڈہ کا حکمراں تانا شاہ کے نام سے مشہور ہے، وہ اپنی ریاست کے محصولات کو وصول کرتا، لیکن دہلی کچھ نہ بھیجتا، چند برسوں کے اندر کروڑوں کی رقم جمع ہو گئی، تانا شاہ نے اس کو زمین میں دفن کر دیا اور اس کے اوپر ایک جامع مسجد بنا دی، اورنگ زیب کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے مسجد کو مسمار کرا دیا اور خزانہ کو ضبط کر کے رفاہ عام میں صرف کر دیا، یہ دو مثالیں ایسی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اورنگ زیب بحیثیت فیصلہ کرنے میں مندر اور مسجد کی تفریق نہیں کرتا تھا۔

ڈاکٹر پی این پانڈے نے اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے یہ فرمایا کہ شیواجی کے پرائیوٹ سکریٹری شیخ صدر قاضی تھے، جو اس کے تمام دستاویزات محفوظ رکھتے اور اس کی طرف سے خط و کتابت

Scanned by CamScanner

کرتے اور سدی عنبل اور سدی بلال اس کے دو فوجی سردار مسلمان تھے اور اس کی بحری فوج کا سردار بھی ایک مسلمان تھا، شیواجی دہلی کی مرکزی حکومت کے خلاف نہیں تھا، یہ ان مراسلات سے ظاہر ہوتا ہے جو اس نے اورنگ زیب کو لکھے تھے اور ہارس پلنس لائبریری میں اب تک محفوظ ہیں، وہ کچھ رعایتیں چاہتا تھا اور وہ یہ تھیں۔

اس کو چوتھ وصول کرنے اور اپنا سکہ وصول کرنے کا حق دیا جائے، شیواجی کا دادا تو مسلمان بزرگ شاہ شرف الدین کا معتقد تھا، اس کے نام اس نے اپنے بیٹے کا نام شاہ جی اور چھوٹے کا شرفاجی رکھا، خود شیواجی کو کلسی کے مسلمان بزرگ بابا یاقوت سے بڑی عقیدت تھی۔

رانا پرتاپ سے اکبر کی جو لڑائی ہلدی گھاٹ میں ہوئی وہ کسی طرح مذہبی جنگ نہ تھی، اس میں اکبر کی طرف سے چالیس ہزار راجپوت اور ساتھ ہزار مغل لشکری تھے اور ان کی کمان راجہ مان سنگھ کر رہا تھا اسی طرح رانا پرتاپ کی فوج میں بہت سے پٹھان تھے، اس کے ایک دستہ کی کمان حکیم خان سور کے ہاتھ میں تھی، جالور کا پٹھان راجہ تاج خان ایک ہزار سواروں کے ساتھ رانا پرتاپ کی حمایت میں لڑ رہا تھا، رانا پرتاپ کی فوج میں چالیس ہزار راجپوت تھے، راجپوت راجپوت کے خلاف اور پٹھان پٹھان کے خلاف لڑ رہے تھے، پھر اس لڑائی کو ہم اسلام اور ہندو مت کی لڑائی کیسے کہہ سکتے ہیں، یہ مرکزی اور علاقائی دو قوتوں کا تصادم تھا، رانا پرتاپ اس تعریف کے مستحق ہیں کہ وہ اپنی بہادری سے اپنی آزادی کو قائم رکھنا چاہتے تھے، لیکن کسی حال میں ان کی لڑائی کو ہم اسلام اور ہندو مت کی لڑائی نہیں کہہ سکتے ہیں۔

اور بہت سی باتیں بیان کر کے ڈاکٹر بی۔ این پانڈے نے کہا کہ ایسے واقعات تاریخ میں نہیں پڑھانے چاہئے، لیکن ضرورت ہے کہ تاریخ کی کتابوں میں ایسی باتیں نہ لکھی جائیں، جن سے یہاں کے لوگوں میں عداوت اور منافرت پیدا ہو۔

(اس تقریر پر جو تاریخی واقعات بیان کئے گئے ہیں ان کے مستند ہونے کی ذمہ داری پروفیسر موصوف ہی پر ہے)

شری این۔ سی سکسینہ

شری این۔ سی سکسینہ آئی اے۔ ایس اقلیتی کمیشن کے جوائنٹ سکریٹری تھے، ان کے ذمہ یہ کام سپرد کیا گیا تھا کہ وہ اتر پردیش کے اسکولوں کی نصابی کتابوں کا جائزہ لیں، انہوں نے اس سلسلہ میں جو روئیداد پیش کی، اس کا خلاصہ ذیل میں درج ہے

"یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے ملک کا دستور تو سیکولر ہے، لیکن یہ اب تک فرقہ وارانہ جھگڑوں سے پاک نہیں ہو سکا ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں جو فرقہ وارانہ فسادات اس کے مختلف حصوں میں ہوئے ان سے اندازہ ہوگا کہ اکثریتی اور اقلیتی فرقوں کے درمیان تناؤ بڑھتا جا رہا ہے اور ہمارے معاشرے نے سیکولرزم کی بنیادی باتوں کو اب تک قبول نہیں کیا ہے۔

تعلیمی اداروں کے ابتدائی اور ثانوی درجوں میں تاریخ کی جو کتاب پڑھائی جائے اس کے ذریعہ سے مختلف فرقوں میں مشترکہ ماضی کا شعور پیدا کیا جا سکتا ہے، تاریخ یا تو اس طرح پڑھائی جائے گویا کہ وہ واقعی ہے، اس کو مسخ نہ کیا جائے اور اس کے لکھنے میں جانب داری سے کام نہ لیا جائے یا اس کا مطالعہ ایک خاص نہج پر اس طرح کرایا جائے کہ نوجوانوں کا ذہن ایک خاص سمت کی طرف مائل ہو، ذی عقل لوگوں کو اس پر اعتراض نہ ہوگا، اگر اول الذکر طریقہ سے تاریخ کا مطالعہ ہو تو پھر اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، اگر سیکولرزم پیدا کرنے کی خاطر تاریخی واقعات کی ترتیب دی جائے اور اس کا لحاظ ہو کہ اقلیتوں کے جذبات مجروح نہ ہوں، بدقسمتی سے اب تک ہندوستان کی تاریخ میں جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان پر فرقہ وارانہ رنگ چھایا رہا ہے، اسکول میں تاریخ کی جو کتاب پڑھائی جاتی ہے یا ہندی میں جو کتابیں نصاب میں داخل ہیں وہ نسلی اور فرقہ وارانہ تعصب سے بھری ہوئی ہیں۔ ایک ہی فرقہ سے ہیرو کا انتخاب کیا جاتا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہی مسلمان حکمران اچھے تھے جو ہندوؤں پر مہربان رہے۔

دردمند تحریر

مولانا سید سلیمان ندوی سابق ناظم ندوۃ المصنفین اعظم گڑھ نے اگست ۱۹۳۲ء کے اپنے رسالہ "معارف" میں یہ شذرات لکھے کہ ہماری یونیورسٹیوں کی تاریخ ہند کی کتابوں میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی باتیں جمع کی جاتی ہیں جن سے ہندو مسلمان کے جذبات میں مزید اشتعال پیدا ہو اور ان کا اتفاق آئندہ مشکل سے بڑھ کر محال ہو جائے، حالانکہ اس ملک کی تاریخ میں ایسے واقعات کی کمی نہیں جن کے پڑھنے سے ان دونوں کے درمیان اختلاط و محبت کے جذبات پیدا ہوں، مگر بازاری قدردانی کے تابع مصنف اور کتب فروش اپنی عارضی کامیابی کے مقابلہ میں ملکی اور قومی بھلائی کی قیمت کی پرواہ نہیں کرتے، جب انہوں نے دسمبر ۱۹۴۲ء میں مدراس میں آل انڈیا ہسٹری کانگریس کے شعبہ تاریخ ہند از منہ وسطی کی صدارت کی تو اپنے خطبہ میں اس کانگریس کے مؤرخوں کو خطاب کر کے فرمایا۔

Scanned by CamScanner

"مجھے یہ کہنا ہے کہ تاریخ کے فن کو قوموں کے پھوٹ اور میل میں بہت کچھ دخل ہے، اس لئے وہ لوگ جن کی نظر میں اس ملک کا مستقبل ہے، جن کے ہاتھ میں اس کا مستقبل بنانا، بگاڑنا ہے، ان کو اپنی ذمہ داری کو سمجھنا چاہئے اور اس حالت میں جبکہ ہندو اور مسلمان دونوں کو معلوم ہے ان کو اب اسی ملک میں جینا اور مرنا ہے تو عداوت اور نفرت کی پچھلی باتوں کو اس طرح دہراتے رہنا جس سے یہ جذبہ اس طرح پلتا، بڑھتا اور پھلتا، پھولتا رہے، اپنے ملک کے ساتھ بڑی بے وفائی ہے۔"

اسی خطبہ کے آخر میں اپنے دل کی گہرائیوں سے فرمایا:-

"ہندوستان کی جو تاریخ لکھی جائے؟ اس کا مقصد ہندوستان کے متفرق اجزار کو جوڑنا ہو، توڑنا نہ ہو، حال کو ماضی کی ناگواری کی تلخی کو بڑھا کر کیوں برباد کیا جائے اور کیوں مستقبل کے لئے یہ کوشش جاری رہے کہ وہ کبھی خوش آئند نہ ہو سکے۔"

ہندوستان ہر لحاظ سے مسلمانوں کا وطن ہے

کسی دوسری قوم کو یہ حق نہیں کہ وہ کہے کہ ہندوستان مسلمانوں کا وطن نہیں ہے؟

— حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

ہندوستان کی بسنے والی قوموں میں صرف مسلمان ایسی قوم قدیمہ میں سے ہیں جن کا مذہب اور عقیدہ یہ ہے کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور انسانی نشو ونما فقط حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا ہے یہی قرآن کی تعلیم ہے، باقی اقوام ہند یہ اس کی قائل نہیں ہیں۔

اسلامی کتابیں یہ بتاتی ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان ہی میں اُتارے گئے اور یہاں ہی انہوں نے سکونت کی اور یہاں ہی سے اُن کی نسل دنیا میں پھیلی۔ اور اسی وجہ سے انسانوں کو آدمی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ "سبحۃ المرجان فی تاریخ ہندوستان" میں متعدد روایات اس کے متعلق مذکور ہیں۔ بائبل میں بھی اس کے حصہ عہد قدیم میں یہی ذکر کیا گیا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر، جلد اول، صفحہ ۸۰)

سبحۃ المرجان میں حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کا یہاں پھیلنا اور کھیتی وغیرہ کرنا مذکور ہے بنا بریں اسلامی روایات اور تعلیمات کے مطابق آبائی وطن عہد قدیم سے ہندوستان مسلمانوں کا ہی ہوگا جو لوگ انسانی اور اپنی نسل کو ایسا نہیں مانتے وہ اس دعوے کے مستحق نہیں ہیں اور مسلمانوں کے لئے ہندوستان کو اپنا وطن قدیم سمجھنا ضروری ہے۔

بحیثیت مذہب بھی ہندوستان مسلمانوں کا وطن ہے

حسب تعلیمات اسلامیہ اور تصریحات قرآنیہ جتنے پیغمبر اور ان کے جانشین دُنیا میں ہوئے ہیں سب کا مذہب اسلام ہی تھا، حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد بھی اسلام کے پیرو تھے اور اس کے بعد جب تفرقے ہوئے تو جہاں جہاں بھی انسانی نسلیں تھیں وہاں پیغمبر اور ان کے سچے جانشین بھیجے گئے اور سچے پیغمبر اُن کے سچے جانشیں سب کے سب دین اسلام ہی رکھتے تھے، آیات اور احادیث

Scanned by CamScanner

بکثرت اس مضمون پر دلالت کرتی ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہندوستان میں بھی قبل زمانہ خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء آئے ہوں چنانچہ اولیاء اللہ نے ہندوستان میں مختلف مقامات پر انبیاء علیہم السلام کی قبریں بطور کشف والہام اور روحی ملاقات سے معلوم کی ہیں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اور مرزا مظہر جانِ جاناںؒ اور دیگر بزرگوں کی تصانیف میں اس کی تصریحات موجود ہیں۔ مگر جس طرح عیسائیوں اور یہودیوں نے تحریف وغیرہ کر کے شرک اور کفر وغیرہ اختیار کرلیا اسی طرح ہندوؤں نے بھی اختیار کیا۔ چنانچہ مرزا مظہر جان جاناںؒ اس کی تفصیل اپنے بعض مکتوبات میں پوری طرح فرماتے ہیں:

> خلاصہ یہ کہ قدیم زمانہ سے یہ ملک بھی مذہب اسلام کا گہوارہ رہا ہے۔ لہٰذا صحیح اور یقیناً صحیح ہے کہ بحیثیت مذہب ابتدا ہی سے یہ ملک اسلام کا وطن ہے۔

بحیثیت سکونت جسمانی بھی ہندوستان مسلمانوں ہی کا وطن ہے

مسلمانوں کے سوا جو قومیں ہندوستان میں سکونت پذیر چلی آتی ہیں وہ عموماً اپنے مردوں کو جلا ڈالتی ہیں اور ان کی راکھ کو دریا میں بہا دیتی ہیں یا پارسی اپنے مردوں کو پرندوں کو کھلا دیتے ہیں۔ بخلاف مسلمانوں کے کہ وہ اپنے مردوں کو زمین میں دفن کرتے ہیں اس لئے مسلمانوں کی سکونت جسمانی اس زمین میں زندگی میں بھی مثل دیگر اقوام رہی اور مرنے کے بعد بھی ان کی سکونت یہاں ہی رہی۔ ان کی قبریں محفوظ رکھی جاتی ہیں۔

مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ قیامت میں انہیں قبروں میں سے ان کے مردے اٹھیں گے اور جو اجزاء جسم کے قبر میں مٹی ہو گئے تھے انہیں اجزاء سے ان کا جسم پھر سے بنایا جائے گا۔ لہٰذا مسلمانوں کی سکونت جسمانی اس سرزمین میں قیامت تک کے لئے ہے۔ بخلاف دوسری جلانے والی یا پرندوں کو کھلانے والی قوموں کے کہ ان کی سکونت جسمانی صرف دنیاوی زندگی تک کے لئے ہے اور بس اسی وجہ سے ان کے اسلاف کا کوئی نام ونشان کسی جگہ پایا نہیں جاتا۔ اور مسلمانوں کے قبرستان، روضے، تکیے، زیارت گاہیں وغیرہ وغیرہ ہر جگہ موجود ہیں اور مسلمان ان کی حفاظت

اور عظمت ضروری سمجھتے ہیں۔

بحیثیت تعلقات روحانی، ہندوستان مسلمانوں ہی کا ہے

غیر مسلموں کا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد روحیں تناسخ (آواگون) کے ذریعہ سے جزا اور سزا بھگتی ہیں اس لئے وہ کسی دوسرے جون (قالب) میں ڈال دی جاتی ہیں خواہ وہ انسانی ہو (اگر اعمال اچھے تھے) خواہ وہ حیوانی یا نباتی حشرات الارض وغیرہ کا (اگر اعمال خراب تھے) پھر انسان اگر بنایا گیا تو کوئی ضروری نہیں کہ وہ ہندوستان ہی میں پھر پیدا ہو۔ افریقہ، امریکہ، یوروپ، آسٹریلیا وغیرہ جہاں پر بھی پرماتما چاہے اس کو اس عمل کے مناسب بھیج دے، غرضیکہ مرنے کے ساتھ ہی اس کی روح کا تعلق تمام جسم اور اس کے اجزا سے بھی بالکل منقطع ہو جاتا ہے۔

نیز اس کا رشتہ گاؤں، شہر، دیش، قوم، ذات وغیرہ سب سے منقطع ہو جاتا ہے۔ بخلاف مسلمانوں کے کہ وہ تناسخ کے قائل نہیں ہیں۔ مسلمانوں کے نزدیک روح کا تعلق جسم انسانی کے ساتھ صرف ایک دفعہ ہوتا ہے موت کے بعد وہ برزخ میں محفوظ کر دی جاتی ہے اور اپنے اعمال کی سزا اور جزاء کا کچھ حصہ وہاں بھی حاصل کرتی رہتی ہے۔ اس کا نہایت ضعیف تعلق اپنے بدن اور اس کے اجزاء اور اپنی قبر، وطن، برادری، اولاد وغیرہ سے رہتا ہے یہ تعلق اگرچہ ایک درجہ میں نہیں ہوتا مگر تاہم کسی نہ کسی درجہ میں تفاوت کے ساتھ باقی رہتا ہے اور اسی تعلق سے قیامت میں یہ روح اس قبر پر پہنچے گی اور اس کے اجزاء سابقہ کا جسم بنے گا اور وہ اس میں حلول کر کے پھر زندگی جسمانی حاصل کرے گی۔

جس طرح ہم اگر دنیا میں اپنے گھر اور اہل وعیال کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلے جاتے ہیں تو ہمارا تعلق اپنوں اور اپنے گھروں اور بستیوں کے ساتھ کچھ نہ کچھ رہتا ہے۔ ایسا ہی یا اس سے زائد تعلق مرنے کے بعد روحوں کو بھی سب سے رہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام میں قبروں کی زیارت کرنے اور اصحاب قبور کو سلام کرنے اور ان کو دعا اور ایصال ثواب وغیرہ کرنے کا حکم ہوا، نیز حکم ہوا کہ لوگ اپنے اسلاف اور عام مومنین کی قبروں کی زیارت کرتے ہوئے دنیا کی بے ثباتی پر عبرت کے آنسو بہائیں اور گزرے ہوئے لوگوں کے لئے دعائیں کریں۔ یہ چیز ان مرگھٹوں میں کہاں نصیب ہو سکتی

Scanned by CamScanner

ہے۔ جہاں کی باقی ماندہ راکھ کو بھی دریا بہا کر لے گئے اور سمندروں کی نذر کر چکے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب تفسیر عزیزی، پارہ عم، صفحہ ۵۰ میں فرماتے ہیں:

> خلاصہ یہ کہ قبر روحوں اور اہل دنیا کے لئے ریڈیو اور آلہ مکبر الصوت (لاؤڈ اسپیکر) کے صندوق اور تار، ہوائی لاسلکی اور ٹیلی گراف اور ٹیلی فون کے آفس کی طرح ہے۔ جس میں ایک درجہ تعلق ہر دو طرف سے رہتا ہے اور اس تعلق ہی کی وجہ سے افادہ اور استفادہ ہوتا ہے اگرچہ وہ تعلق دنیاوی تعلق سے بہت کمزور بھی ہے اور ممکن ہے کہ بعض وجوہ سے قوی بھی ہو۔ خلاصہ یہ کہ مسلمانوں کو مرنے کے بعد بھی اس ملک اور اس کی زمینوں کے ساتھ روحانی تعلق اس قدر قوی اور باقی رہتا ہے کہ دوسری قوموں اور مذاہب میں نہیں پایا جاتا۔ اور وہ قومیں اپنی مذہبی حیثیت سے اس کی قائل بھی نہیں ہیں۔ لہٰذا یقیناً مسلمانوں کو ہی حق ہے کہ وہ ہندوستان کو اپنا وطن اور سب سے زیادہ اپنا وطن سمجھیں۔

بحیثیت انتفاع اور احتیاج بجانب اجزار وطن بھی ہندوستان مسلمانوں ہی کا وطن ہے

اسلامی تعلیم اور عقائد کی حیثیت سے ایک وقت آنے والا ہے جبکہ تمام انسان پھر زندہ ہو جائیں گے اور ان کے اجسام کے اجزار متفرق ہو کر مٹی وغیرہ میں مل گئے تھے، جمع کئے جائیں گے اور جسم بن کر اسی روح کو اس میں داخل کیا جائے گا اور اس جسم کے ساتھ وہ محشر میں اور جنت میں جائیں گے اس لئے وہ وطن جس میں وہ پرورش پاتے تھے جیسے کہ دنیاوی زندگی میں نفع اُٹھانے اور ہر قسم کی حاجتوں کا مرکز تھا مرنے کے بعد بھی ایک درجہ تک نفع اُٹھانے اور احتیاج کا مرکز رہے گا اور اس کی اس مٹی سے جو کہ از دفن تا حشر قبرستان میں دوسری مٹی سے مل گئی تھی نفع اُٹھائے گا، بخلاف دوسرے باشندگانِ ہند کے کہ وہ ایسا اعتقاد نہیں رکھتے ان کے اعتقاد میں ان کی روحیں دوسری مٹی سے بنے ہوئے جسموں میں داخل ہو کر ان جسموں سے تعلق قائم کرتی ہیں اور ان کی پرورش میں سرگرم ہو کر پہلے اجزار جسمانیہ سے بالکل بیگانہ ہو جاتی ہیں۔ کبھی ہندوستان میں ہیں، کبھی چین میں، کبھی جاپان

میں، کبھی انگلینڈ میں، کبھی فرانس میں، کبھی انسان ہیں کبھی حیوان ہیں۔

وفاداری مجواز بلبلاں چشم
کہ ہر دم بر گلے دیگر سرایند

جس طرح ہندوستان کے دوسرے باشندے بحیثیت سکونت و انتفاع ملک و زمین ہندوستانی ہیں اسی طرح مسلمان بھی ہیں:

جس طرح آرین، سیتھین، یونانی، مصری، منگول وغیرہ قومیں ہندوستان میں آ کر بسیں اور اُنہوں نے یہاں کھیتیاں کیں، باغ لگائے، مکان بنائے، بود و باش اختیار کی، اسی طرح مسلمانوں نے بھی یہاں پہنچ کر یہ اعمال وطنیہ اختیار کئے، کسی کو ہزار برس، کسی کو نو سو، کسی کو آٹھ سو برس یا کم و بیش ہو گئے، پشت ہا پشت یہاں گزر گئیں اس لئے دنیاوی زندگی اور اس کے لوازم کی حیثیت سے مسلمان کسی قوم سے پیچھے نہیں ہٹے ہیں۔ بالخصوص وہ اقوام جو کہ پہلے سے بھی ہندوستان کے باشندے ہیں۔ مذہب اسلام کی حقانیت دیکھ کر پہلے مذہب کو چھوڑ کر اسلام کی حلقہ بگوش ہوئی ہیں اور وہی عنصر آج مسلمانانِ ہند میں غالب ہے۔ لہٰذا کسی دوسری قوم کو حق نہیں ہے کہ وہ آج یہ دعویٰ کرے کہ ہندوستان مسلمانوں کی بہبود میں جس طرح دوسری قوموں کی بہبودی ہے، اسی طرح مسلمانانِ ہند کی بہبودی ہے۔

لہٰذا یقیناً اس حیثیت سے بھی ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ وطن عزیز اور پیارا ہے نہ مسلمان اس کو چھوڑ کر کہیں دوسری جگہ جا سکتے ہیں نہ جائیں گے، نہ کوئی دوسرا وطن ان کو اپنی آغوش میں لے سکتا ہے، یہاں کے کروڑوں مسلمانوں کو یہاں ہی رہنا اور یہاں ہی اپنی نسل اور طریقہ کو پھیلانا اور امن و امان کی زندگی چلانا ہے۔ رہا یہ امر کہ پھر مسلمان دوسرے ملکوں کے مسلمانوں سے کیوں تعلقات رکھتے ہیں، اور ان کی مصیبتوں پر بلبلا اُٹھتے ہیں تو یہ اس روحانی تعلق کی بنا پر ہے جو کہ اتحاد ازم اور توافق مذہب کی بنا پر دوسری جگہوں کے مسلمانوں سے پیدا ہوا ہے اور جس کی تعلیم بھی روحانی ترقی کرتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ دوسری قوموں کے ساؤتھ افریقہ، فجی، ماریشیش، ایسٹ افریقہ وغیرہ کے ان ہندوستانیوں سے ہوتا ہے جو کہ ان ملکوں میں بود و باش کئے ہوئے ہیں۔ اگر وہاں پر کسی

Scanned by CamScanner

قسم کے مظالم ان ہندوستانیوں پر ہوتے ہیں تو ہندوستان میں بسنے والی قوموں میں بے کلی پیدا ہو
جاتی ہے۔ یہ امر مسلمانانِ ہند کو ہندوستانی وطنیت اور اس سے پیار و محبت سے بیگانہ نہیں بناتا۔

نوٹ:۔ امور مذکورہ بالا کی بنا پر ممکن ہے کہ غیر مسلم ہندوستانی بہ آسانی ایک دوسرے وطن
سے منتقل ہو کر دوسرے وطن میں چلے جائیں، مگر مسلمانانِ ہندوستان کو یہاں سے منتقل ہونا از بس
مشکل ہے، نہ اپنے مقابر سے، نہ اپنی زمینوں سے اور نہ اپنے گھر بار سے اور نہ ان میں اس قدر
استطاعت ہے۔□□
(بحوالہ رسالہ ریاض الجنۃ، نومبر ۲۰۰۶ عیسوی)

تمت الکتاب والحمد للہ رب العالمین

مآخذ

	نام کتاب	مصنف
۱	تاریخ فرشتہ اول	محمد قاسم فرشتہ
۲	تاریخ فرشتہ دوم	محمد قاسم فرشتہ
۳	ہندوستان عربوں کی نظر میں اول	باہتمام مولانا مسعود علی ندوی
۴	ہندوستان عربوں کی نظر میں دوم	باہتمام مولانا مسعود علی ندوی
۵	تاریخ عہد مغلیہ یعنی منتخب اللباب اول	خافی خان
۶	تاریخ عہد مغلیہ یعنی منتخب اللباب دوم	خافی خان
۷	تاریخ عہد مغلیہ یعنی منتخب سوم	خافی خان
۸	تاریخ عہد مغلیہ یعنی منتخب اللباب چہارم	خافی خان
۹	بزم تیموریہ دوم	سید صباح الدین عبد الرحمٰن ایم اے
۱۰	بزم تیموریہ سوم	سید صباح الدین عبد الرحمٰن ایم اے
۱۱	سفینۃ الاولیاء	دارا شکوہ
۱۲	سکینۃ الاولیاء	دارا شکوہ
۱۳	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری اول	سید صباح الدین عبد الرحمٰن ایم اے
۱۴	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری دوم	سید صباح الدین عبد الرحمٰن ایم اے
۱۵	ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری سوم	سید صباح الدین عبد الرحمٰن ایم اے
۱۶	تاریخ دعوت و عزیمت اول	حضرت مولانا ابو الحسن علی میاں ندویؒ
۱۷	تاریخ دعوت و عزیمت پنجم	حضرت مولانا ابو الحسن علی میاں ندویؒ
۱۸	آئینۂ تاریخ یعنی تاریخ احمدی	محمد حسن بن محمد علی
۱۹	رود کوثر	شیخ محمد اکرم
۲۰	آب کوثر	شیخ محمد اکرم
۲۱	تحریک آزادی اور مسلمان	اسیر ادروی
۲۲	سفرنامہ ابن بطوطہ	ابن بطوطہ
۲۳	عرب و ہند عہد رسالت میں	قاضی محمد اطہر مبارکپوری
۲۴	عرب و ہند کے تعلقات	مولانا سید سلیمان ندوی
۲۵	تاریخ سلطنت خداداد	محمود خان محمود بنگلوری
۲۶	تاریخ گجرات	ابو ظفر ندوی
۲۷	سیرت سید احمد شہید	حضرت مولانا ابو الحسن علی ندویؒ
۲۸	سیرت سلطان ٹیپو	مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
۲۹	اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر	علامہ شبلی نعمانی
۳۰	اسیر مالٹا	مولانا سید محمد میاں صاحب

مؤلف کی ایک نہایت ہی مقبول عام و خاص کتاب

جامع و مدلل تاریخ ہند

مسلم عہد حکومت سے قیام جمہوریت تک

جسے ملک کے بیشتر اہل علم اور باذوق حضرات نے نہ صرف یہ کہ پسند کیا ہے بلکہ مسلم اداروں میں اسے داخل نصاب کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیا ہے۔

① یہ کتاب مسلمان طالب علموں کے لئے خصوصاً بہت مفید اور ضروری نصاب کی حیثیت رکھتی ہے، خاص طور پر ان دینی مدارس میں جہاں تاریخ کو بطور نصاب شامل نہیں کیا گیا ہے، اس کی شمولیت اور طلبار کے لئے اس کا آزاد مطالعہ اس ملک کی مسلم تاریخ کو اور اس تاریخ کے اسلامی کردار کو واضح کرنے میں نمایاں کردار ادا کر سکتا ہے، اس کے علاوہ اس کتاب سے عام اہل علم اور عوام الناس بھی اپنے اپنے ظرف کے مطابق استفادہ کر سکتے ہیں۔ (ارمغان، دسمبر ۲۰۰۶ء)

② فاضل مصنف نے ہزاروں صفحات کا نچوڑ اعتدال و توازن سے اس کتاب میں پیش کر دیا ہے، کتاب کی زبان سلیس و سادہ ہے، مدارس کے طلبہ کے مطالعہ کے لئے خاص طور سے بڑی مفید اور معلومات افزا ہے۔ (تعمیر حیات، ۱۰/دسمبر ۲۰۰۶ء)

③ یہ کتاب تطویل و اطناب سے پاک ہے اور صرف ضروری معلومات پر مشتمل ہے؛ اُمید ہے کہ قارئین کتاب سے بھرپور استفادہ کریں گے، بہتر ہے مدارس سے وابستہ علمار اور طلبہ اس کتاب کو حاصل کر کے ہندوستان کی اسلامی تاریخ سے واقفیت حاصل کریں۔

(ماہنامہ ندائے شاہی، صفحہ ۵۶، نومبر ۲۰۰۶، شوال المکرم ۱۴۲۷ھ ہجری،)

④ اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جمعیت علمار اور خلافت تحریک، علمائے کرام کا قائدانہ کردار اور مسلمانوں کی عظیم قربانیوں کا ذکر ہے، عموماً تاریخ ہند کی کتابیں اس سے خالی ہیں، ضرورت ہے کہ ارباب مدارس اپنے نصاب میں اس کو شامل کریں۔

(رسالہ صورت القرآن، احمد آباد، نومبر ۲۰۰۶ء)

⑤ فاضل مصنف کے دل کش اور حق پرست قلم نے نقوشِ تاریخ کی اس شان و شوکت، متانت و وقار اور خوش اسلوبی کے ساتھ رہنمائی کی ہے کہ کتاب جب تک پوری پڑھ نہ لی جائے سیری نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں محدث کبیر، فقیہ بے مثال حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری کی تقریظ نے کتاب کو مرجعیت اور قبولیت کی سند عطا کر دی ہے۔ (ریاض الجنۃ، جنوری-اکتوبر ۲۰۰۶ء)

ملفوظ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

(۱) اولیات دین ہندوستان میں

خدا کا پہلا قانون ہندوستان ہی میں آیا اور یہیں سے دین شروع ہوا اس کی تکمیل بالآخر حجاز نے کی۔ حضرت جبرئیل امین اور روح القدس علیہ السلام کا پہلا ورود ہند میں ہوا اور وحی نے کر اترے پہلی اذان ہندوستان میں ہوئی جس میں توحید کا اعلان ہوا جیسا کہ روایت میں موجود ہے۔

اول النبیین کو آخر النبیین کی بشارت ہند ہی میں دی گئی یعنی سرزمین ہند پہلا دار التعلیم ہے۔ طبری کی روایت میں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام، حضرت حوا علیہا السلام کو لے کر حجاز سے لوٹے تو اسی وادی میں آئے جس میں نزول ہوا اور وہیں رہنے کا گھر بنایا یعنی ہندوستان پہلے نبی کا وطن ہے۔ کفی بہ فخراً

(۲) مقدس ہندوستان

حجاز اس لئے مقدس ہے کہ خاتم النبیین کا مولد و منشاء اور مہبطِ قرآنی ہے۔

اور **شام** اس لئے مقدس ہے کہ وہ انبیاء بنی اسرائیل کا مولد و منشأ ہے۔

اور **مصر** اس لئے مقدس ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے نسبت حاصل ہے۔

اور **عراق** اس لئے مقدس ہے کہ اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے نسبت ہے۔

تو بلاشبہ **ہندوستان** اس لئے مقدس ہے کہ اسے حضرت آدم علیہ السلام سے نسبت ہے اور پہلی وحی کا مہبط ہے، پہلا دار النبوۃ اور دار الخلافہ ہے۔ (جواہر حکمت، صفحہ ۱۹۱، ادارۂ تالیفات اشرفیہ)

Scanned by CamScanner

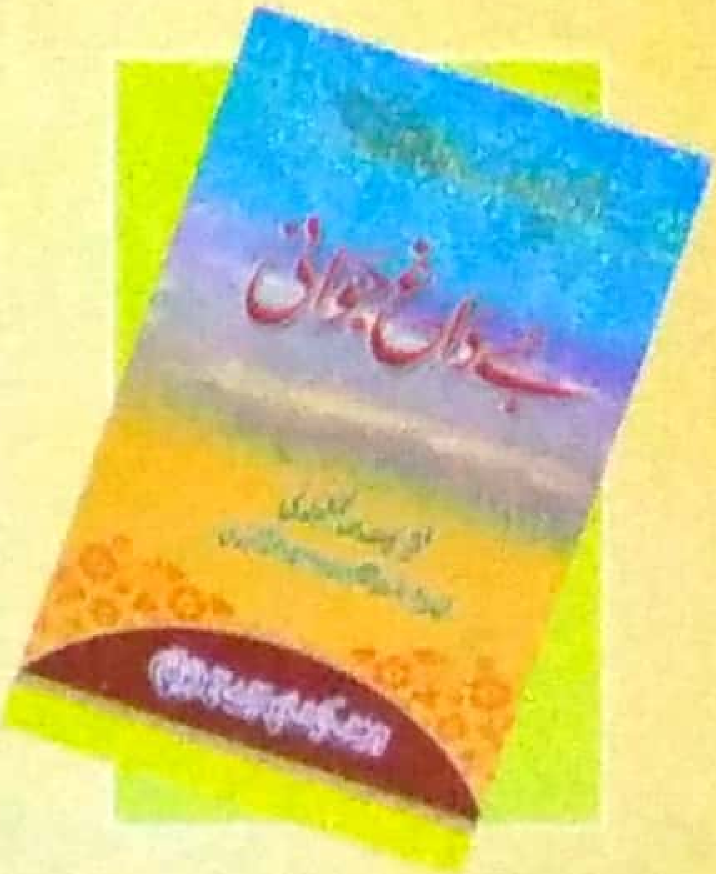

اپنی ضرورت کی کتابیں منگانے کیلئے آرڈر اس پتے پر روانہ کریں

AHMAD BOOK DEPOT

Near Office Mazahir Uloom (Waqf)
Saharanpur-247001 (U.P.) India
Mobile No.: 9639662257/ 9358567060

Designed By: Mohd. Rafi 9758100109

Scanned by CamScanner